ٹوٹے ہوئے تارے

(پچاس سے زیادہ ممتاز شخصیتوں کا تذکرہ اور خاکہ)

جناب شاہ محمد عثمانی (مقیم مکہ)

(سابق مدیر روزنامہ استقلال کلکتہ، روزنامہ الہلال پٹنہ،
ہفتہ وار نقیب پھلواری شریف)

ناشر
عثمانی پبلشنگ ھاؤس
۱۲۱۔ بی بلاک۔ ذاکر باغ اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵

سلسلہ مطبوعات (۴)

باراول ـــــ ۱۹۸۵ء
ناشر ـــــ عثمانی پبلشنگ ہاؤس۔
بی ۱۲۱۔ ذاکر باغ، اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵
صفحات ـــــ ۳۸۹
طابع ـــــ گرافک پرنٹرس گلی قاسم جان دہلی ۶
باہتمام ـــــ امین عثمانی
قیمت ـــــ چالیس روپے

ملنے کے پتے

۱۔ دارالغنی۔ شاہ گنج۔ پٹنہ ۶۔

۲۔ مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی

۳۔ مکتبہ جامعہ۔ اردو بازار۔ دہلی۔

۴۔ مکتبہ رشیدیہ اردو بازار دہلی

انتساب

ان انسانوں کے نام

★ جو خیر پسند ہیں اور انسانیت نواز ہیں

★ جو اچھی باتوں کو قبول کرتے ہیں اور پھیلاتے ہیں

★ جو برائی سے بچتے ہیں اور دوسروں کو بچاتے ہیں

★ جو کسی فرد اور جماعت سے نفرت نہیں کرتے

★ جو تعصبات سے بلند ہیں اور خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

فہرست کتاب

ممتاز علمائے دین اور قائدین

مشاہیر اہل علم اور ملت کے مصلحین اور خادمین

چند اور اہلِ علم و تعلق اور برادرانِ وطن

مؤلف کتاب کے بارے میں

جس طرح ہر گلشن وچمن میں بہار وخزاں کا موسم آتا ہے، کبھی پھول کھلتے ہیں اور کبھی باد صرصر چلتی ہے، اسی طرح چمن انسانی میں بھی موسموں کا تغیر رونما ہوتا ہے، کبھی ایک خطۂ ارض میں ایک ہی وقت میں بہت سے اہل علم وادب، ارباب فکر ونظر، انقلاب انگیز اور عہد آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور کبھی وہی خطۂ ارض اہل فکر ونظر سے ایسا خالی ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ جیسے دانشور کو یہ گلہ کرنا پڑتا ہے ؎

اٹھا نہ پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگل ایران وہی تبریز ہے ساقی

اس کا تعلق بھی تقدیر اور حکمتِ الٰہی سے ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں •

ہندوستان کی سرزمین پر بڑی عظیم اور جلیل القدر شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ مقدمہ نگار کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے اس عہد کی عظیم شخصیتوں کو نہیں دیکھا لیکن دیکھنے والوں سے اس کے قصے اور حالات سنے یا تذکرہ اور سوانح کے آئینہ میں ان کے خد و خال دیکھے۔ اس مقدمہ نگار کو دہلی کے زمانۂ قیام میں بار بار مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، جو عہد گذشتہ کی ایک زندہ تاریخ تھے۔ تو اس نے اپنے والد صاحب کی طرح ان سے بھی فرمائش کی کہ وہ "معاصرین" یا "چند ہم عصر" یا "پرانے چراغ" یا "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" وغیرہ کے انداز پر ایک کتاب مرتب کردیں، انہوں نے اس خیال کو پسند کیا لیکن گوناگوں قسم کی سیاسی اور سماجی مصروفیات کی بناء پر ان کو اس بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ کاغذی پیکر میں مختلف شخصیتوں سے ملاقات کا حال اور تاثرات پیش کر سکیں۔ قبلہ والد محترم کو مکۂ معظمہ کے زمانۂ قیام کے دوران اس کا موقعہ مل گیا۔ ان سے کچھ دوسرے اشخاص نے بھی اس طرح کے مضامین لکھنے کی فرمائش کی انہوں نے اہم شخصیتوں سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کتابی شکل میں مرتب کردیا جو اب "ٹوٹے ہوئے تارے" کے نام سے ناظرین کے ہاتھ میں ہے۔ اس مجموعہ میں کئی شخصیتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں سوانح نگاروں نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ اس کتاب کے مولف کے پیش نظر سوانح پیش کرنا نہیں ہے، لیکن ان مضامین سے ان شخصیتوں کی بعض خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سی شخصیتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں پہلے کسی نے کوئی مضمون بھی نہیں لکھا ہے لیکن وہ اپنی خصوصیات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے اس لائق ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان کے نام اور کام سے واقف رہیں۔ یہ مجموعہ خاص طور سے اس پہلو سے کارآمد اور قیمتی ہے۔

کتابت کے بعد یہ مجموعہ اب جبکہ طباعت کے لئے جانے والا ہے اور مولف کتاب خود ہندوستان سے دور مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے حالات زندگی اس مقدمہ میں پیش کئے جائیں۔ زمین داری کے خاتمہ اور صنعتی تہذیب کی آمد نے خاندانوں کا شیرازہ منتشر کردیا ہے۔ ہمارا خاندان بھی جو صوبہ بہار کی چند بستیوں میں محدود تھا، صوبہ بہار سے باہر بلکہ ہندوستان سے باہر تک پھیل گیا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مؤلف کتاب کے اہل خاندان کا تذکرہ بھی بقدر ضرورت اور مختصر طور پر کردیا جائے۔ ایک غیر متعلق شخص

کے لئے یہ سوانحی انداز ممکن ہے غیر ضروری ہو، لیکن خاندان کے بہت سے افراد کے لئے جن کے ہاتھوں میں یہ کتاب آئے گی یہ "تذکرۃ الانساب" مفید معلوم ہوگا اور اس میں انہیں کوئی دراز نفسی نہیں معلوم ہوگی۔

کسی شخص کے قلم سے اپنے والد ماجد یا اپنے اجداد کا تذکرہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کی علمی اور ادبی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ علامہ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں اپنے والد تقی الدین سبکی کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے والد کے حالات زندگی میں بوارق الولایۃ اور اپنے اجداد کے تذکرہ میں امداد فی مآثر الاجداد کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اپنے والد مولانا عبدالحلیم لکھنوی کے حالات میں مستقل رسالہ "حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم" کے نام سے لکھا ہے۔ اس دور میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے نامور والد پر کتاب "حیات عبدالحئی" کے نام سے تصنیف کی ہے اور ان کے ایک ہم نام عالم مولانا ابوالحسن زید فاروقی نے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان کے ایک بزرگ اور خانقاہ ابوالخیر دہلی کے سجادہ نشین ہیں اپنے والد کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس لئے اس کتاب کے مقدمہ میں راقم السطور کو اپنے والد ماجد مؤلف کتاب کے حالات کے لکھنے میں کوئی تکلف نہیں کہ یہ کام نیکی اور سعادت مندی کی بات اور علماء و صلحاء کے نقشِ قدم کی پیروی ہے۔

اجداد اور شجرۂ نسب

مولف کتاب سولہ سترہ سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ نسبی طور پر عثمانی ہیں۔ ان کے جد اعلیٰ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ حضرت جلال الدین محمد کبیر الاولیاء پانی پتی ہیں جن کی قبر پانی پت میں موجود ہے۔ جلال آباد شہر آپ کے نام پر موسوم ہے۔ آپ کا اصل نام محمد تھا، ان کے مرشد حضرت شمس الدین ترک نے جو خلافت حضرت جلال الدین محمد کبیر الاولیاءؒ کو دی اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

" عطا کیا میں نے خرقہ اور عصا اور مقراض اور پیالہ محمد بن محمود بن یعقوب کو اور مخاطب کیا میں نے ان کو اسماء حسنیٰ کے ایک اسم خطاب سے اور وہ خطاب جلال الدین ہے "

(عربی سے ترجمہ)

شجرۂ نسب اس طرح ہے :-

محمد بن غلام شرف الدین بن عبدالعلی بن محمد علی بن شاہ غلام امام بن شاہ جاراللہ بن محمد اعظم بن محمد المعروف بملا کبیر بن شاہ معروف بن شاہ منصور الملقب بہ دانش مند بن مخدوم برہان الدین بن خواجہ برخوردار بن خواجہ اسحاق بن خواجہ داؤد بن خواجہ سلیمان بن خواجہ عبدالقدوس بن خواجہ شبلی بن خواجہ جلال الدین محمد کبیر الاولیاء ، پانی پتی بن خواجہ محمود بن خواجہ یعقوب بن خواجہ عیسیٰ بن خواجہ اسماعیل بن خواجہ محمد بن خواجہ ابوبکر بن خواجہ علی بن خواجہ عثمان بن خواجہ عبداللہ بن خواجہ شہاب الدین بن خواجہ عبدالرحمٰن گازرونی بن خواجہ عبدالعزیز سرخسی بن خواجہ خالد بن خواجہ ولید بن خواجہ عبدالعزیز بن خواجہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ ثانی بن عبدالعزیز بن عبداللہ کبیر بن امیر عمرو بن سیدنا عثمان غنیؓ۔

حضرت امیر عمرو حضرت عثمان غنی کے صاحبزادے ، خراسان کے گورنر تھے ۔ مقام منیٰ میں وفات پائی ۔ ان سے حدیث بھی مروی ہے ۔ حضرت امیر عمرو کی ماں ام عمرو بنت جندب دوسی تھیں ۔ حضرت امیر عمرو کی اولاد حسب ذیل ہیں :-

عثمان الاکبر ۔ خالد ۔ عبداللہ کبیر ۔ عثمان الاصغر ۔ عبداللہ الاصغر ۔ بکیر ۔ مغیرہ ۔ عفیتہ ۔ عمر اور ولید

حضرت عبداللہ کبیر کی اولاد میں خالد ۔ عائشہ ۔ عبدالعزیز ۔ آمنہ اور ام عبداللہ ۔ بی بی فاطمہ بنت امام حسین بن حضرت علی کے بطن سے ان کے لڑکے ہیں محمد الاکبر ۔ عمرو اور سعد حضرت عبداللہ کبیر کی ماں کا نام حفصہ تھا ۔ یہ بیٹی تھیں حضرت عبداللہ بن عمر فاروق کی ۔ عبداللہ کبیر نہایت حسین اور شکیل تھے اور اپنے حسن و زیبائی کی وجہ سے مطرف کے لقب سے مشہور تھے ۔

اجداد میں حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی سے دس پشت اوپر خواجہ شہاب الدین کے والد عبدالرحمٰن گازرونی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے اور پانی پت کے حاکم و قاضی بنے[1] ۔ ان کی قبر بھی پانی پت میں موجود ہے ۔ اسلامی عہد میں علماء اور اہل دین کو قضا

---

(۱) ۔ ملاحظہ ہو رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب "اظہار الحق" کا مقدمہ ۔

وافتاء اور احتساب کے عہدے دیئے جاتے تھے۔ پانی پت میں عثمانی خاندان اور خانقاہ کے آخری فرد اور مرد مجاہد مولانا شاہ بقاء اللہ صاحب عثمانی تھے جو ملک کی تقسیم، ہنگامۂ کشت وخون اور شور دار وگیر میں پانی پت میں جمے رہے اور مسلمانوں کی مدد کرتے رہے، حالاں کہ پانی پت اس پنجاب کا خطہ تھا جہاں مسلمانوں کا خون ارزانی کے ساتھ بہا تھا۔ پانی پت کے اسی عثمانی خاندان کے ممتاز علماء میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ صاحب اظہار الحق، و علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب عثمانی صاحب تفسیر مظہری رہے ہیں۔

مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کے پرپوتے سلیمان بن عبدالقدوس اور ان کے لڑکے داؤد بن سلیمان تحصیل علم ظاہری و باطنی کے لئے بہار تشریف لائے، کیونکہ بہار اس وقت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری اور ان کے خلفاء کی وجہ سے مشہور اور مرجع خلائق بن گیا تھا۔ خواجہ سلیمان اور ان کے صاحبزادے خواجہ داؤد کی قبریں محلہ بیگن آباد، قصبہ بہار شریف میں ہیں۔ یہ جگہ محلہ میرداد سے قریب ہے، جہاں سادات کی آبادی ہے۔ حضرت داؤد کی شادی بہار شریف میں ایک سید گھرانے میں ہوئی ان سے ایک لڑکے شاہ اسحٰق ہوئے۔ یہ کمسنی میں یتیم ہو گئے اور مخدوم شعیب بن جلیل الدین کی تربیت میں رہے۔ شیخ جلیل الدین مخدوم بہار شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے بھائی تھے۔ شاہ اسحاق نے مخدوم شعیب سے سلسلہ فردوسی کی اجازت وخلافت حاصل کی۔ شاہ اسحٰق کے پوتے مخدوم برہان الدین کی شادی گیا شہر سے تین میل دور بیتھو نامی مقام پر حضرت مخدوم درویش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مخدوم درویش سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی کی بہن کی اولاد میں سے ہیں۔ ابتداء میں مخدوم برہان الدین تعلیم حاصل کرنے کے لئے مخدوم درویش کے پاس آئے تھے۔ بعد میں یہ رشتہ قائم ہوا۔ مخدوم برہان الدین کی قبر دیورہ ضلع گیا میں ہے اور ان کی اولاد گیا کی چار بستیوں دیورہ، سملہ، پیر بیگہ اور مکارم چک میں آباد ہے۔

خانقاہ دادی ہال میں وہ تمام خصوصیات جو عربی النسب خانوادوں میں پائی جاتی ہیں، موجود تھیں۔ گہری دینداری تھی۔ لوگ بیعت وارشاد کا کام کرتے تھے۔ رہن سہن معمولی اور فقیرانہ ہوتا۔ اپنے حال کا اخفا اور شہرت اور ریاء سے گریز اور عبادت اور تصوف کے اشغال کا ذوق عام تھا۔ خاندان کے ایک بزرگ محمد المعروف عبدکبیر ہوئے جن کا نام اوپر شجرۂ نسب میں مذکور ہے۔ شہزادہ شجاع الدولہ لکھنؤ نے

بنگال جا رہے تھے۔ دیورہ کے قریب ان کا پڑاؤ ہوا۔ انہوں نے سنا کہ یہاں ایک فقیر رہتے ہیں ملنے کا اشتیاق ہوا۔ جب شہزادہ ان کے پاس پہنچا تو وہ بھنی ہوئی تیسی کھا رہے تھے۔ وہی تیسی انہوں نے شہزادہ کے سامنے پیش کی اور کہا کہ "بے تکلف حاضر ہے" شہزادہ نے پوچھا کہ تکلف کرتے تو کیا کرتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "نمک ملا دیتے" شہزادہ نے ان کو بہت بڑی جاگیر دینی چاہی لیکن فقر و استغناء کے مزاج نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ لیکن قسام ازل نے اسی جاگیر کا ایک حصہ جو سملہ ضلع گیا میں تھا، ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ جاگیر تو ان کے ایک مرید نے لے لی لیکن اس کا ایک ٹکڑا ان کے حصہ میں آ گیا۔ چنانچہ سملہ میں وادی بال کے لوگوں سے ہندوستان کی آزادی کے وقت تک زمین کی مال گذاری حکومت وقت نہیں وصول کرتی تھی۔

دیورہ میں مخدوم برہان الدین کے وقت سے بیعت و ارشاد اور تزکیہ نفس کا سلسلہ شروع ہوا اور محبت الٰہی، سوز دروں اور فکر آخرت کی متاع تقسیم ہوتی رہی۔ مخدوم برہان الدین کے پوتے شاہ معروف کے پرپوتے شاہ غلام علی خانقاہ برہانیہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے بعد اس منصب پر ان کے صاحبزادے شاہ غلام علی فائز ہوئے۔ شاہ غلام علی اور شاہ غلام ولی دونوں کے خلیفہ اجل حضرت شاہ کمال علیؒ تھے۔ حضرت شاہ غلام ولی کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ جب شاہ غلام ولیؒ کا انتقال ہوا تو شاہ کمال علی کا سجادہ خانقاہ برہانیہ کے لئے انتخاب ہوا لیکن آپ نے سجادگی قبول نہیں کی۔ حضرت غلام علی اور حضرت غلام ولی کے خلفاء نے کہا کہ ہم کو جس کا انتخاب کرنا تھا ہم نے انتخاب کر لیا، آپ کے علاوہ ہماری نظر میں کوئی نہیں ہے۔ اب آپ کا جس کو جی چاہے اس جگہ پر بٹھا دیں، ہم لوگ کوئی دوسرا انتخاب نہیں کریں گے۔ حضرت شاہ کمال علی نے شاہ غلام ولی کے نواسہ شاہ خادم علی کو مرید کیا اور اجازت و خلافت دی اور الباس خرقہ کیا اور سجادہ برہانیہ پر ان کو بٹھایا۔ لیکن شاہ غلام علی اجازت و خلافت کے باوجود بیعت نہیں کرتے تھے بلکہ مخدوم برہان الدین کے عرس کے انتظامات پر اکتفا کرتے تھے۔ یہی دستور خانقاہ برہانیہ کے سجادہ نشینوں کا بعد میں بھی رہا۔ لوگ اصلاح و تربیت کے لئے رجوع حضرت کمال علی کی طرف کرتے۔ شاہ خادم علی کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ احمد علی کو شاہ کمال علیؒ نے اجازت و خلافت عطا کی اور الباس خرقہ کیا اور خانقاہ برہانیہ کا سجادہ نشین بنایا۔ شاہ کمال علیؒ (م ۱۲۱۵ھ) کے انتقال کے بعد مخدوم برہان الدین کے پوتے شاہ معروفؒ

کے پرپوتے شاہ جاراللہ صاحب کے صاحبزادے شاہ غلام امام فردوسی سملویؒ کا خانقاہ کمالیہ ربانیہ کی سجادہ نشینی کے لئے انتخاب ہوا۔ شاہ غلام امام سملوی نے اتباع شیخ میں سجادگی قبول نہ کی اور انہوں نے اپنے خالہ زاد بھائی اور حضرت کمال علیؒ کے خلیفہ محمد امین بن مولانا نصیرالدین پھلواروی کے صاحبزادے شاہ انور علی کو اجازت و خلافت دی اور خرقہ پہنا کر خانقاہ کمالیہ ربانیہ کا سجادہ نشین بنایا۔ شاہ غلام امام صاحب کے دو خلیفہ خاص تھے ایک شاہ انور علی جو خانقاہ کمالیہ ربانیہ کے سجادہ نشین تھے دوسرے حضرت شاہ محمد علی جو آپ کے صاحبزادے تھے۔ شاہ انور علی صاحب کے بعد سجادہ نشین شاہ ابوالحسنؒ ہوئے جو مولف کتاب کے دادا شاہ عبدالعلی صاحب کے برادر خورد اور شاہ محمد علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ جب شاہ ابوالحسنؒ کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے شاہ مجیب الحق کمالی نے سجادگی کے منصب پر اپنے بھائی شاہ فدا حسین صاحب کو بٹھایا لیکن انہوں نے شاہ ابوالحسن کے عرس کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہا۔ شاہ فدا حسین نے یہ خدمت ان کے سپرد کردی۔ مجیب الحق کمالیؒ کے نام پر سملہ کی خانقاہ خانقاہ مجیبیہ کہی جاتی ہے اور چونکہ یہ عرس سجادہ خانقاہ کمالیہ کا ہے اس لئے خانقاہ سملہ میں عرس کے موقع پر قرآن خوانی اور مجلس ایصال ثواب کی ابتدا صاحب سجادہ خانقاہ کمالیہ دیورہ کرتے ہیں۔ حضرت مجیب الحق کمالیؒ کے انتقال کے وقت ان کے چچازاد بھائی شاہ غلام شرف الدین شریف کے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہ تھا، جب ان کی آنکھ کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو انہوں نے کہا کہ "کوئی چیز لاؤ ہم لکھ دیں۔" جلدی میں والد کے والد ماجد شاہ غلام شرف الدینؒ نے سلیٹ اور پنسل پیش کی۔ شاہ مجیب الحق صاحب نے شاہ محمد قاسم صاحب اور شاہ محمد صاحب کے لئے اجازت و خلافت تحریر کی اور شاہ غلام شرف الدینؒ کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ" ہم نے لکھ دیا ہے لیکن تم کو اختیار ہے جیسا مناسب سمجھنا کرنا۔ جب لوگ جمع ہوئے تو شاہ غلام شرف الدینؒ اور شاہ فدا حسینؒ نے سجادگی کے لئے شاہ محمد قاسم کا انتخاب کیا۔ شاہ محمد قاسم صاحب نے خاندان فردوس کے بزرگوں کی اتباع میں شاہ غلام شرف الدینؒ کا نام ان کی اجازت سے اپنے شجرہ میں اضافہ کیا۔ موجودہ سجادہ نشین محترم حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی ہیں جو شاہ محمد قاسمؒ کے فرزند ارجمند ہیں۔

زہد و تصوف، ورع و تقویٰ، عبادت و اذکار اور آخرت کی تیاری اور صوفیائے کرام کے تذکروں اور ان کے مکتوبات کے مطالعہ کا ذوق اور مثنوی مولانا روم اور تصوف کی کتابوں سے شغف اس خاندان و خانقاہ

کے لوگوں کا امتیاز خاص رہا ہے۔ والد کے دادا شاہ عبدالعلی صاحب کے دور تک خاندان میں لکھنے پڑھنے کی زبان فارسی تھی۔ صحت کے اعتبار سے خاندان کے لوگ بالعموم وقت سے پہلے پیرانہ سالی، بالوں کی سفیدی اور قویٰ کے انحطاط کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ہر انسانی مجموعہ کی طرح یہ مجموعہ بھی کمزوریوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ قرآن و سنت کو اگر معیار قرار دیا جائے اور صحابہ کرام کی زندگی کو دین کے لئے نمونہ بنایا جائے تو بہت سے خانقاہی اشغال و اعمال ایسے ملیں گے جو نادرست قرار پائیں گے۔ لیکن یہ چیزیں دور ... پیداوار اور ماحول کا گرد و غبار ہیں۔ نئی نسل کے متعدد افراد وقت کے بہترین دینی اور عربی اداروں ... تعلیم پا رہے ہیں۔ بہت سے افراد دینی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور ان کا مختلف دینی تحریکوں سے ربط ... ہے۔ یہ چیزیں مزاج میں میانہ روی اور قوام میں اعتدال پیدا کرتی رہیں گی اور گرد و غبار کو صاف کرتی رہیں ... "امت" روایات سے اور حقیقت خرافات سے الگ اور ممیز ہو جائے گی۔

مؤلف کتاب کے دادا اور والد ماجد

مولف کتاب کے دادا شاہ عبدالعلی صاحب بہت عبادت گذار اور شب بیدار تھے۔ گھر کی جائداد تقسیم ہونے کے بعد تھوڑی رہ گئی تھی اس لئے گھر میں دولت نہ تھی۔ ان کی ایک بہن بی بی ... بیوہ اور لاولد تھیں۔ وہ ان کی کاشتکاری بھی سنبھالتے۔ پانچ وقت نمازیں بستی سملہ کی مسجد میں خود پڑھاتے۔ مغرب کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے، کھانا تناول کرنے کے بعد مسجد آتے، عشاء کی نماز کی امامت کرتے اور ساری رات مسجد میں مصلّٰی پر گذار دیتے۔ مؤلف کتاب کے والد شاہ شریف ... کی کمسنی کا زمانہ تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ان کو ابتداءً حیرت ہوئی کہ ساری رات اس طرح کیسے عبادت کرتے ہیں۔ ان کے اظہار تعجب پر لوگوں نے بتایا کہ جب خدا سے محبت شدید ہو جاتی ہے تو اس کے حضور ہر وقت حاضری میں آرام ملتا ہے اور شب بیداری کی مشقت آسان ہو جاتی ہے جب کھیتی کا موسم نہیں ہوتا تو شاہ عبدالعلی صاحب برادری کی بستیوں سے اعزہ و اقربا سے ملاقات کے لئے جاتے۔ امجھ، بیر بیگھا، مکارم چک، دیورہ، پالی، بہار شریف میں اقربا رہتے تھے۔ دیورہ میں شاہ برہان الدین عثمانی اور سید شاہ کمال علی کی خانقاہ کی سجادگی بڑے بھائی ہونے کے باوجود انہوں نے قبول نہیں کی اس لئے چھوٹے بھائی سید شاہ ابوالحسن صاحب کو جو خود عارف باللہ

تھے اس مسند پر بٹھایا گیا۔

والد محترم مؤلف کتاب کے والد ماجد کا نام شریف تھا۔ مخدوم صاحب بہار شیخ شرف الدین یحیٰ منیری سے بے حد عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ غلام شرف الدین لکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ تصوف کو سمجھنے کے لئے صرف دو کتابیں کافی ہیں ایک مخدوم الملک کی مکتوبات صدی اور دوسری مثنوی مولانا روم۔ خاندان میں پڑھنے لکھنے کی زبان فارسی تھی اس لئے فارسی زبان کا نصاب جو اس زمانہ میں رائج تھا مکمل کیا۔ انگریزی پیر بیگھا کے اسکول میں جسے مولف کتاب کے نانا ڈپٹی حسین علی مرحوم نے قائم کیا تھا پڑھی۔ انگریزی کی صلاحیت اچھی تھی۔ میٹرک تک کی کتابوں میں مؤلف کتاب کی تعلیم میں مدد کی اور کہا کرتے کہ میرا احول بدل گیا ہے ورنہ میں کالج میں بھی تم کو انگریزی پڑھاتا۔ وادیہال میں شاہ شریف صاحب پہلے آدمی تھے جنہوں نے انگریزی پڑھی تھی۔ بعد میں تصوف کا شوق ہوا پھر یہی رنگ غالب آیا۔ اور یہی خاندان کا اصل رنگ تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصوف کی کتابوں کا علمی مطالعہ کیا بلکہ ہندوستان کی خانقاہوں کا سفر بھی کیا۔ مشہور بزرگوں کی مزارات پر چلہ کش ہوئے۔ آخر میں ملا هنڈا قادری سرحدی کے ایک خلیفہ سے قادریہ سلسلہ میں تعلیم حاصل کی لیکن مرید اپنے چچا شاہ ابوالحسن احمد کبیر سے فردوسی سلسلہ میں ہوئے۔ ان کو تمام سلسلوں کی اجازت تھی۔ اپنے ننھیال کے سلسلہ کی اجازت تو صرف ان ہی کو تھی۔ یہ اجازت بھی انہوں نے تحریری طور پر شاہ محمد قاسم صاحب کو دے دی تھی۔ کوئی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو وہ تعلیم دیتے اور مجاہدہ اور ریاضت کرتے لیکن کسی کو بیعت نہیں کرتے۔ کوئی بیعت کرنا چاہتا تو اس کو اپنے چچازاد بھائی شاہ فدا حسین سجادہ نشین خانقاہ دیورہ یا اپنے بھانجے شاہ محمد قاسم سجادہ نشین خانقاہ سملہ کے پاس بھیج دیتے۔ ایک ہندو جو برادری کے اعتبار سے گوالہ تھا، ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ انہوں نے صرف اسی کو مرید کیا۔ عربی زبان کا کوئی لفظ اس کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا۔ مجبوراً ہندی میں اسے نماز سکھائی گئی۔ اس کو مرید کرنے کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ عربی الفاظ اس کی زبان سے بالکل ادا نہیں ہوتے اس لئے وہ ہندی میں نماز پڑھتا ہے۔ اب اگر وہ کسی اور شخص سے جا کر مرید ہوگا تو ڈر ہے کہ اس کو نماز ہی پڑھنے سے منع کر دیا جائے کیونکہ ہندی میں نماز پڑھنے پر فتویٰ نہیں۔ لباس بہار کے صوفیوں کا زیب تن کرتے۔ بڑے پائچوں کا پاجامہ، کرتا، انگرکھا اور مخمل کی ٹوپی جو قدرے کھڑی سلتی تھی لیکن لباس کی زیادہ پابندی نہ تھی۔ تہمد، کرتا اور دوپلی ٹوپی بھی پہنتے۔ گذر اوقات کے لئے تھوڑی زمینداری تھی۔ اتباع سنت میں تجارت کی کوشش کی لیکن معمولات

عبادت کی وجہ سے زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ساری زندگی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ ان کا انتقال ہوا تو شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب نے کہا کہ "شریف میاں اسم بامسمّیٰ تھے"۔ کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی فارسی میں شعر کہتے۔ ان کے دادا شاہ محمد علیؒ کے فارسی خطوط کا مجموعہ "مکتوبات محمدی" کے نام سے شائع ہونے لگا تو اس کی تاریخ کہی کتاب کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:۔

نتیجہ فکر رنگیں جناب شاہ غلام شرف الدین صاحب تمکیں سلوی دام فیضہ

تالیف نمود چوں کمالی این نامہ بے مثال وزیبا
تاریخ نوشت کلک تمکیں مجموع خطوط دولت افزا

جہاں تک بزرگوں کے علمی تحریری سرمایہ کا تعلق ہے تو مکتوبات ملتے ہیں جن کا موضوع اصلاح وہدایت ہے۔ ان کے علاوہ شعری یا نثری مجموعہ نہیں ملتا۔ دادیہال میں سید شاہ کمال علی جو عثمانی تو نہ تھے لیکن شادیوں کے ذریعہ اجداد میں تھے، فارسی اور اردو دونوں کے باکمال شاعر تھے۔ قضاء وافتاء کا منصب اور رسوخ فی العلم اور تصنیف وتالیف کا ذوق عثمانی خاندان کی یہ شاخ پانی پت اور اس کے گرد ونواح میں اپنے ہم جد لوگوں میں چھوڑ کر سلوک کی منزلیں طے کرنے بہار آئی اور جلال الدین کبیرالاولیاء عثمانی پانی پتی کے یہ احفاد جو بہار آئے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے سلسلہ سے وابستہ ہونے کے بعد اذکار واوراد بیعت وارشاد میں مشغول اور بادۂ معرفت میں سرشار رہے۔ بحیثیت مجموعی بہار کے اس عثمانی خاندان کی جو غیر جانبدارانہ تصویر بنتی ہے وہ صلحا کے خاندان کی ہے۔ جس میں عبادت وریاضت کا شوق عام ہے۔ حصن حصین کی دعائیں معمولات میں داخل ہیں، بحر عشق کی طغیانی زیادہ ہے۔ دریائے علم کی روانی کم اور راہوار قلم کی جولانی اس سے کم تر ہے۔ اپنے مرز بوم سے دوری کی وجہ سے اس نے نسب نامہ کی شدید حفاظت کی ہے اور کفاءت کا وہ معیار قائم کیا ہے جس کا شریعت نے مکلف نہیں کیا ہے۔ شادیاں یا تو برادری ہی میں ہوتی ہیں تو صرف صحیح النسب سادات کے گھرانوں میں۔ سادات کے یہاں مسلسل رشتہ کی وجہ سے بعض بستیوں میں عثمانی خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ سید بھی لکھنے لگے اور شرفاء بہار میں اس خاندان کے لوگوں کو سید سمجھا جاتا ہے۔

چند دیگر انساب عثمانی خاندان بہار میں تقریباً چھ سو برس سے آباد ہے۔ اس عرصہ میں افراد خاندان کی شادیاں باستثنائے معدودے چند سادات میں ہوتی رہیں۔ والد کی دادی بی بی صغریٰ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان سے ہیں۔ نسب نامہ اس طرح ہے: بی بی صغریٰ بنت سید شاہ ابوتراب قادری بن سید شاہ طہارت احسن قادری بن سید شاہ داؤد علی قادری بن مولانا سید اشرف علی قادری بن سید شاہ وجیہ الدین قادری بن سید شاہ غلام محی الدین قادری بن مولانا سید محمد صالح بن سید شاہ محمد قادری بن سید شاہ مصطفےٰ قادری بن مولانا سید اسماعیل قادری بن مولانا سید مرتضیٰ قادری بن عاشق الحق قادری بن معشوق الحق قادری بن بن مولانا سید یوسف قادری بن عطاء اللہ قادری بغدادی بن علاء الدین قادری بن ابراہیم گیسو دراز بن الحاج سید محمد بن مولانا سید حسن بن مولانا سید موسیٰ قادری بن سید علی قادری بن سید محمد قادری بن سید حسن قادری بن سیف قادری بن نصر قادری بن منصور قادری بن عبدالرزاق حسنی الحسینی القادری بن سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ۔ مولف کتاب کی پردادی پلاسی کے خاندان سادات سے تھیں۔ مولف کتاب کی والدہ اور والد ایک ہی خاندان سے تھے۔ آٹھویں پشت میں دونوں کا نسب نامہ مل جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی نانی شاہو بیگھا ضلع گیا کے مشہور رئیس خاندان سادات سے تھیں۔ ان کے دادا کے بہن کی شادی امجھر کے سادات میں ہوئی تھی۔ جہاں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ ان کی ساس بی بی ہاجرہ سیدہ تھیں۔ بی بی ہاجرہ کے دادا شاہ فرزند علی صوفی منیری بڑے اچھے شاعر اور غالب کے شاگرد تھے۔ صوفی منیری کی والدہ بی بی رحیمہ مخدوم بہار شرف الدین یحییٰ منیری کے چچازاد بھائی کے خاندان سے تھیں۔ بی بی ہاجرہ کا نسب نامہ اس طرح ہے:۔ بی بی ہاجرہ بنت محمد عمر بن فرزند علی بن محمد علی بن احمد علی بن غلام مرتضیٰ بن جہانگیر بن سید سدا بن فخر الدین بن شہاب الدین بن احمد علی بن جہانگیر بن محمود بن محمد بن علیم الدین گیسو دراز دانش مند نیشاپوری بن مسعود بن عبدالغنی بن حسین بن ابراہیم بن اسماعیل بن جعفر نیشاپوری بن امام محمد دیباج بن امام جعفر صادق بن امام باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن فاطمۃ الزہراء

بطور مثال یہ چند نسب نامے لکھے گئے ہیں ورنہ پورے عثمانی خاندان کا، جو گیا ضلع کی چار

بستیوں میں آباد ہے، یہی حال ہے۔ یعنی ان کی برادری سادات ہی ہے۔ (والد کی خالہ، ان کے منجھلے ماموں ان کی تمام پھوپھیوں اور ان کے بھائیوں اور بہن اور خود ان کی شادی سادات میں ہوئی)۔

عربی النسل خاندانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چند پشت اوپر مرکب ناموں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ منفرد نام ملتے ہیں یا اضافت ترکیبی ملتی ہے۔

عربوں میں منفرد نام رکھنے کا رواج ابھی تک ہے۔ شمالی ہندوستان میں ناموں کو مرکب بنانے اور شروع یا آخر میں محمد یا احمد یا علی وغیرہ لکھنے کا رواج بعد میں شروع ہوا۔ جنوبی ہندوستان میں عربی خاندانوں میں ابھی تک منفرد نام کے ساتھ باپ کا نام ملا کر لکھتے ہیں اور ابن کا لفظ حذف کر دیتے ہیں۔

دیگر اہل خاندان اور اقربا ء ننھیال

میرے ننھیال کے ساتھ ننھیال میں جو ایک ہی خاندان کی دوسری شاخ تھی، فارسی کے ساتھ اردو کا ذوق رہا ہے۔ ننھیال کے لوگوں میں شاہ وارث علی اردو کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے بھانجے اور شاگرد فریاد تھے جو خود پختہ شاعر تھے۔ ان کے شاگرد بہار کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی ہوئے۔ شاہ وارث علی کے لڑکے شاہ حسین علی صاحب عالم اور طبیب حاذق تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوئے۔ ڈپٹی کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے یہ ملازمت مختلف دباؤ کے تحت قبول کی تھی اور ملازمت قبول کر کے روئے بھی تھے۔

ڈپٹی حسین علی صاحب کے بھائی باقر علی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اور غالب سے انہوں نے اصلاح لی تھی۔ والد کے نانا شاہ تقی صاحب کی شادی شاہو بیگھا کے ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی۔ شاہ تقی کے ہم زلف مشہور بیرسٹر اور لیڈر جسٹس شرف الدین مرحوم ہوئے۔ شاہ تقی صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی دوسرے شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب۔ اول الذکر مشہور شاعر ہوئے اور علی گڑھ تحریک سے دلچسپی لیتے رہے۔ سید محب الحق صاحب نے ندوۃ العلماء کی تحریک سے دلچسپی لی۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے اس طرح بہار کے دو بڑے شاعروں کا تعلق والد کے ننھیال سے تھا۔ والد کے کئی ماموں تھے۔ ایک ڈاکٹر شاہ زین العابدین عثمانی ندوی جو آخر میں مکہ مکرمہ میں رہے۔ ان کا تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔

والد کی ایک پھوپھی کی شادی نرہٹ ضلع گیا میں ہوئی۔ ان کے دو لڑکے تھے: قاضی احمد حسین اور قاضی محمد حسین۔ اول الذکر بہار میں خلافت تحریک کے روح رواں، امارت شرعیہ کے ناظم، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور کانگریس کے ٹکٹ پر پارلیامنٹ کے ممبر تھے۔ دونوں بھائیوں کا خاکہ مولف کتاب کے قلم سے اس کتاب میں موجود ہے۔ والد کی منجھلی پھوپھی کی شادی گیا ضلع کے رئیس نواب میر ابو صالح صاحب سے ہوئی۔ میر ابو صالح کی یہ دوسری شادی تھی۔ ان سے صرف ایک بیٹی تھیں خدیجۃ الکبریٰ۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی دوسری شادی شاہ مصطفیٰ احمد صاحب سے ہوئی جو ردولی کے رہنے والے تھے اور بھوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے۔ میر ابو صالح کی پہلی شادی سے ایک لڑکے ظفر نواب صاحب ہوئے جن کی شادی مولف کتاب کی والدہ کی خالہ زاد بہن سے ہوئی۔ دوسری لڑکی سے حسن امام اور حسین امام دو لڑکے ہوئے۔ حسن امام صاحب کی اہلیہ مولف کتاب کی رضاعی بہن تھیں۔ دوسرے بھائی حسین امام صاحب تھے جو انگریزوں کی حکومت کے زمانہ میں کاونسل آف اسٹیٹ (راجیہ سبھا) کے رکن پھر صدر ہوئے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہے اور اب پاکستان میں ہیں۔ والد کے منجھلے ماموں کی شادی شاہ رمضان علی صاحب کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ شاہ رمضان علی صاحب مولف کتاب کے جدی رشتہ میں چچا بھی ہوتے تھے اور ان کی والدہ کی پھوپھی زاد بہن سے ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ شاہ رمضان علی کے صاحبزادے مولانا سید عثمان غنی صاحب عالم دین، دارالعلوم دیوبند سے فارغ، امارت شرعیہ کے ناظم اور مفتی اور جریدہ امارت کے ایڈیٹر تھے۔ میرے والد مولف کتاب کے چچا کی شادی امارت شرعیہ بہار کے امیر شریعت اول حضرت شاہ بدرالدین صاحب کی پھوپھی سے ہوئی۔ پھر شاہ بدرالدین صاحب کے لڑکے شاہ قمرالدین صاحب امیر شریعت ثالث کی شادی مولف کتاب کی چچازاد بہن سے ہوئی۔ مولف کتاب کے والد کی ایک پھوپھی کی شادی اروَل میں ہوئی۔ اس خاندان سے مسٹر زبیر، شاہ عمیر، شاہ عزیر اور شاہ زبیر ہوئے۔ اس خاندان کے لوگ سیاسی اعتبار سے اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ اور بہار کونسل اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہوئے۔ مولف کتاب کی شادی سید محمد مہدی منصف مجسٹریٹ حیدرآباد کی لڑکی بی بی معصومہ سے ہوئی۔ سید محمد مہدی صاحب کا وطن مفتی گنج، تھانہ اکنگر سرائے تھا جو اسلام پور سے نزدیک ہے۔ وہ حیدرآباد میں بعد میں مقیم ہوئے۔ وکالت کی تعلیم حاصل کی اور منصف مجسٹریٹ

ہوئے۔ بہت مذہبی خوش اوقات آدمی تھے۔ ان کے ایک بھائی حکیم قطب الدین صاحب تھے جن کے نام پر شہر پٹنہ کے محلہ سبزی باغ میں قطب الدین لین ہے۔ سید محمد مہدی صاحب کی شادی خانقاہ اسلامپور کے سجادہ نشین شاہ عبدالقادر صاحب کے منجھلے بھائی شاہ عمیر صاحب کی بیٹی بی بی ہاجرہ سے ہوئی تھی جن کا نسب نامہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ شاہ عمر صاحب ممتاز عالم تھے۔ انگریزوں کے خلاف تحریک خلافت کے زمانہ میں پانچ سو علماء کا فتویٰ شائع ہوا تھا۔ اس فتویٰ پر ان کے بھی دستخط تھے

ان صفحات میں تمام اہل قرابت کے تذکرہ کی گنجائش نہیں۔ اصل موضوع پہ آنے سے پہلے مولف کتاب کے حقیقی بھائیوں اور بہنوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مولف کتاب اور ان کے دو بھائیوں کی ایک ہی بڑی بہن تھیں۔ ان کا نام ام حبیبہ تھا۔ ان کی شادی ڈمراواں تھانہ استھاواں بہار کے سید عبدالصمد صاحب سے ہوئی تھی۔ دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی سید عبدالصمد صاحب کے بہنوئی محی الدین صاحب حیدرآباد میں معتمد تعلیمات تھے۔ محی الدین صاحب کے والد عبدالمغنی صاحب نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کے استاذ تھے۔ سید عبدالصمد صاحب مرحوم کے ایک بھائی ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بھوپال میں چیف میڈیکل افسر رہے۔

والد کی یہ بہن شادی کے بعد دہلی اور بھوپال میں رہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وطن میں رہنے لگیں۔ بیعت اور دینی استفادے کا تعلق بھوپال کے ایک بزرگ شاہ یعقوب صاحب مجددی اور خاندان کے بزرگ اور رشتہ میں ان کے بھائی شاہ محمد قاسم صاحب سے رہا۔ شاہ یعقوبؒ کے کچھ خطوط ان کے نام اس کتاب میں شامل ہیں۔ محبت و شفقت میں والد اور ان کے بھائیوں کے لیۓ ماں کے قائم مقام تھیں۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی شاہ امین ندوی عثمانی کا انتقال ہوا تو ان کی دونوں بچیوں کی تعلیم و تربیت اور شادی کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی ادا کیا۔ بیوہ ہونے اور آمدنی کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود مخیر خاتون تھیں خاندان کے بعض لڑکوں کی دینی تعلیم کے سلسلہ میں انھوں نے مدد کی۔ دین دار اور خوش اوقات تھیں۔ حالات اور حادثات نے انہیں بے حد دردمند دل کا مالک بنادیا تھا۔ اپنی بستی سملہ میں اپنے گھر میں بچیوں کی دینی تعلیم کا ایک مدرسہ کھول لیا تھا۔ بستی کی بے شمار بچیوں نے اردو زبان، صحیح تجوید کے ساتھ قرآن اور دینی تعلیم ان کے ذریعہ حاصل کی۔

بچیوں اور عورتوں میں ان کے ذریعہ علم دین کی اشاعت ان کے لئے صدقہ جاریہ ہوگی بھوپال سے آنے کے بعد پٹنہ کے قیام کے دوران وہ ہر ہفتہ گھر میں تبلیغی اجتماع کرتی تھیں۔ یہ ذوق ان کو بھوپال کے قیام کے زمانہ میں ملا تھا۔ رمضان کے آخر عشرہ میں انہوں نے اعتکاف کا اہتمام بھی کیا تھا۔ دینی فہم اور اصلاح و دعوت کے کام سے دلچسپی کے اعتبار سے وہ مثالی خاتون تھیں۔ جب ان کی دونوں یتیم بھتیجیوں کی شادی ہوگئی اور چھوٹی بھتیجی راشدہ کا شادی کے بعد انتقال ہوگیا تو حجاز کے لئے ۱۹۷۱ میں رختِ سفر باندھا جہاں ان کی خالہ اور ایک ماموں شاہ زین العابدین ندوی عثمانی پہلے سے مقیم تھے۔ اپنے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی یعنی اس کتاب کے مولف کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ حج پہلے بھی کر چکی تھیں۔ عمر کی آخری منزل پر پہنچ کر پھر سعادت حاصل کی اور دیارِ حرم میں پہنچ کر ۱۹۸۲ء میں جوارِ حرم میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

بہن سے چھوٹے اور بھائیوں میں بڑے شاہ محمد عیسیٰ صاحب عثمانی فردوسی (۱۹۱۰-۱۹۸۲ء) تھے۔ دینی اور عربی تعلیم ندوۃ العلماء دیوبند اور مدرسہ امینیہ میں ہوئی۔ فراغت سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آئے اور ڈپلوما ان ایڈوکیشن کی سند حاصل کی۔ وراثت میں تصوف کا گہرا ذوق ملا تھا۔ ریاضت و مجاہدہ، مراقبہ و استغراق اور اذکار و اوراد کی دنیا ان کی پسندیدہ دنیا تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ان کے استاذ تھے۔ انہوں نے شاہ عیسیٰ صاحب کو بلانے کی بھی کوشش کی لیکن انہوں نے درویشانہ اور قلندرانہ زندگی کو ترجیح دی۔ آزادی میں خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ شریک رہے۔ ملک تقسیم ہوا تو بہار کے مختلف علاقوں میں جاکر مسلمانوں کو وطن چھوڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد ملکی اور ملی تحریکات سے ان کی عملی دلچسپی ختم ہوگئی۔ تعلق باللہ اور غم آخرت کا رنگ ہر رنگ پر غالب آگیا اور وہ آلام روزگار کا مقابلہ کرتے ہوئے عزم و استقامت کے ساتھ اپنے راستہ پر چلتے رہے۔ لوگوں کو بیعت کرتے لیکن بہت کم۔ ان کی زندگی خاندان کے بزرگوں کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ تصوف کی تعلیم انہوں نے اپنے والد شاہ علامہ شرف الدین سے حاصل کی۔ ان کے والد کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے اس لئے بیعت شاہ محمد قاسم عثمانی سے کی جو گھر کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ شاہ محمد قاسم عثمانی کی ذات فی الواقع جامع صفات تھی۔ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی۔ تحریک آزادی میں شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کے عین شباب کے

زمانہ میں گیا کی جمعیۃ علماء کے صدر رہے۔ تصوف کی تعلیم شاہ بدرالدین پھلواری اور اپنے ماموں شاہ غلام شرف الدین صاحب سے حاصل کی۔ بیعت اپنے دادا شاہ ابوالحسن سے تھے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے رسالہ معارف کے نائب مدیر بھی رہے۔ مسلک اور مزاج کے اعتبار سے صاحبِ دل اور صوفی اور سیاسی فکر کے اعتبار سے اس دور کی امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء کے حامی تھے۔ مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء کے اکابر سے تعلقات تھے۔ آپ جیسے گوں ناگوں اوصاف وکمالات کی مالک کم شخصیتیں ہوں گی شاہ عیسیٰ صاحب عثمانی کو ان ہی سے بیعت اور اجازت وخلافت حاصل تھی۔ شاہ عیسیٰ صاحب کی ایک کتاب اسلامی عقیدہ کے موضوع پر ہے جو شائع نہیں ہو سکی ہے۔ ان کا ایک مضمون محمد رسول اللہ اور قانون جنگ کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں ہفت روزہ نقیب کے سیرت نمبر میں شائع ہوا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔ آخر شب تہجد کی نماز کے لئے اٹھے اور وضو کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ سملہ کے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

شاہ عیسیٰ صاحب عثمانی فردوسی کے چھوٹے بھائی شاہ الیسع عثمانی جو دوستوں میں عبدالرحمان عثمانی کے نام سے مشہور تھے، انڈپنڈنٹ پارٹی کے کاموں میں سرگرم ہوئے۔ اس پارٹی کے بانی مولانا سجاد تھے۔ شاہ الیسع کی آخری زندگی نکبت وناسازگاری میں اور ایک پریشان صحافی کی حیثیت سے گذری۔ انہوں نے چند سال حجاز میں بھی قیام کیا تھا۔ ملازمت جدّہ میں تھی۔ ہر پنجشنبہ کی شام کو مکہ معظمہ آجاتے اور جمعہ کی رات کا اکثر حصہ طواف اور عبادت میں گذارتے جمعہ کی نماز حرم میں پڑھتے اور شام کو جدہ واپس جاتے۔ حجاز سے واپسی ہوئی تو گیا کے مولانا قاری فخرالدین جنہوں نے شمع کعبہ کے چاروں طرف ان کا والہانہ طواف دیکھا تھا، جہاز پر ساتھ تھے۔ قاری فخرالدین نے جہاز پر ان کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

میری قسمت رہنمائی آپ کی	میں ہی کیا ساری خدائی آپ کی
ملتزم، میزاب رحمت آپ کے	بارگاہِ مصطفائی آپ کی
پچھلی شب کعبہ کا پہروں وہ طواف	اللہ اللہ پارسائی آپ کی
یاد ہے وہ آپ کا شغلِ حرم	یاد ہے وہ جبہ سائی آپ کی
اتنا ممنونِ کرم کیوں کر دیا	شاق ہو گی اب جدائی آپ کی

کیا کہوں میں، کس قدر پر لطف ہے ۔۔۔ یہ رفاقت میرے بھائی آپ کی
آپ میں ہے جذب تاثیر حرم ۔۔۔ خلق ہو گی اب فدائی آپ کی
شوق سے ہر ہفتہ مکہ کا سفر ۔۔۔ تھی یہ جدہ میں کمائی آپ کی
کر رہا ہوں عرض حال واقعی ۔۔۔ یہ نہیں مدحت سرائی آپ کی
حج بیت اللہ سے ہے دل میں نور ۔۔۔ بڑھتی جاتی ہے صفائی آپ کی

۱۹۵۶ میں آپ کا انتقال ہوا اور اپنے سسرال بیلا میں مدفون ہوئے۔

شاہ محمد عثمانی: مولف کتاب

بہن اور بھائیوں میں سب سے چھوٹے اس کتاب کے مولف شاہ محمد عثمانی صاحب ہیں۔ جو ان سطور کی تحریر کے وقت مکہ معظمہ میں ہیں اور سولہ سال سے وہاں مقیم ہیں۔ آخری دو سالوں کے سوا انہوں نے ہر سال حج کیا۔ یہ بذاتِ خود بڑی توفیق الٰہی ہے۔ دینی توفیق اور دنیاوی خوش بختی اپنی نیکی کے نتیجہ میں اور کبھی والدین کی نیکی کے نتیجہ میں مشیت الٰہی کے تحت انسان کو ملتی ہے۔ سورہ کہف کی آیت "وکان ابوھما صالحا" جو حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ میں ملتی ہے۔ اس حقیقت کی شاہد ہے۔

والد ماجد شاہ محمد عثمانی صاحب کی پیدائش ۱۹۱۵ میں ہوئی۔ صلحار کا گھرانہ تھا۔ دینداری وراثت ملی۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ آزادی کی تحریک اور سیاست و صحافت میں گذارا۔ انہوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان میں خلافت تحریک، جمعیۃ علمار، کانگریس اور مسلم لیگ کا زمانہ تھا۔ جنگ بلقان ختم ہو چکی تھی اور پہلی جنگ عظیم بھی ۱۹۱۸ میں ختم ہو چکی تھی۔ جنگ بلقان پر شبلی کی نظم اور الہلال کے مضامین کی گونج فضائے ادب و سیاست میں باقی تھی۔ مولانا آزاد کے یہ الفاظ لوگوں کی زبانوں پر تھے۔

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جو خفتگانِ خوابِ غفلت کو بیدار کر دے"

گھر کے بزرگوں نے انہیں کمسنی میں یہ بتایا تھا کہ ان کے پردادا منشی محمد علی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے لیکن انہوں نے جلد ہی اس ملازمت کو ترک کر دیا تھا کیونکہ مسلمانان ہند

۱۸۵۷ کے انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور کمپنی کو مسلمانوں کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے پرنانا حسین علی کا بھی نام سنا تھا۔ جو عالم دین اور طبیب تھے اور کمپنی میں بادل ناخواستہ بعض دباؤ کی وجہ سے ملازم ہوئے تھے۔ اور کمپنی کا عہدہ قبول کر کے رو ئے تھے۔ انہوں نے شاہ ابوالحسن صاحب کا ذکر بھی سنا ہو گا جو ان کے دادا شاہ عبدالعلی صاحب کے برادر خورد اور سجادہ نشین تھے۔ اور لوگوں سے حتی المقدور انگریزوں کے خلاف کام کرنے کی بیعت لیتے تھے۔ یہ خبر چے گھر کے لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ سملہ کے علاوہ ان کے والد کا مکان گیا شہر میں تھا اور وہاں کپڑوں کی ان کی ایک دوکان بھی تھی عمر چھ یا سات سال کی رہی ہو گی۔ وہ گیا شہر میں اپنے والد کی دکان پر بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے کہ اچانک بازار کی تمام دوکانیں بند ہونے لگیں۔ معلوم ہوا کہ قاضی احمد حسین صاحب جو ان کے پھوپھی زاد بھائی ہیں گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد شاہ غلام شرف الدین صاحب سے پوچھا کہ "کیوں گرفتار ہوئے؟" بتایا کہ "قاضی صاحب نہیں چاہتے کہ انگریز ہندوستان میں رہیں۔ یہ ملک مسلمانوں کا تھا جسے انگریزوں نے غصب کر لیا ہے اور کوشش میں ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کی سلطنت کہیں نہ رہے۔" انہوں نے گھر آکر اپنی والدہ سے کہا کہ "احمد بھائی گرفتار ہو گئے ہیں۔" والدہ نے جواب دیا "ہاں وہ انگریزوں سے لڑ رہے ہیں۔ تم بھی جوان ہو کر انگریزوں سے لڑو گے۔"

مؤلف کتاب کا بیان ہے کہ "جب احمد بھائی جیل سے رہا گئے گئے تو بہت سے لوگ استقبال کے لئے اسٹیشن گئے۔ گیا اسٹیشن کا کمپاؤنڈ اور اس کا پلیٹ فارم ہندوؤں اور مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گیا ریلوے اسٹیشن پر میرے ننھیال کے کئی آدمی ملازم تھے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ میں بہت چھوٹا ہوں، کچل نہ جاؤں، مجھ سے کہا کہ چلو اسٹیشن کی عمارت کے اوپر کے حصہ میں۔ وہاں سے پورا منظر دکھائی دے گا۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ گاڑی آئی اور قاضی صاحب اترے تو ان کو ہار پہنایا گیا۔ ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔"

شام کو وہ اپنے منجھلے بھائی الیسع عثمانی صاحب کے ساتھ قاضی احمد حسین صاحب سے ملنے گئے اور سلام و مصافحہ کے بعد قاضی احمد حسین نے کہا کہ "تمہارے بدن پر ولایتی کپڑے تو نہیں ہیں؟ میں ولایتی کپڑوں سے اسی طرح دور بھاگتا ہوں جس طرح برہمن اچھوت کے سایہ سے بھاگتا ہے۔

گھر پر جب تینوں بھائی جمع ہوتے تو بڑے بھائی شاہ عیسیٰ صاحب عثمانی کبھی انگریزوں کے مظالم کے واقعات سناتے اور کبھی مسلمانوں کے جہاد کے قصے سناتے۔ خاندان کے لوگوں کے اس سیاسی ذوق نے جذبۂ حریت اور جوش جہاد کمسنی کے زمانہ سے ان کے دل میں پیدا کیا تھا۔ آزادی کا یہ جذبہ گھر کی خواتین تک میں پیدا ہو گیا تھا۔ جب بی اماں یعنی مولانا محمد علی جوہر کی والدہ شہر گیا آئی تھیں اور انگریزوں کے خلاف تقریر کی تھی اس وقت بڑی رقم چندہ کے طور پر دی گئی تھی۔ ان کی بڑی بہن ام حبیبہ نے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے اپنے کان سے سونے کی بالی اتار کر دی۔ اس زمانہ میں یہ شعر ہر شخص کی زبان پر تھا:۔

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

والد اپنی نہایت کمسنی کے باوجود بی اماں کی تقریر سننے گئے تھے۔ اور جب ان کی عمر ۸ سال کی تھی، کانگریس کا گیا میں سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ یہ اجلاس ۱۹۲۲ میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم جو اس اجلاس کی شرکت کے لئے آئے تھے۔ والد کے گھر آئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے تعلقات والد کے بہنوئی ہمارے پھوپھا سید عبدالصمد صاحب سے تھے جو دہلی میں رہتے تھے۔ والد مدظلہ اپنے اپنے والد کے ساتھ کانگریس، خلافت کمیٹی، اور جمعیۃ علمار ہند کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ان رہنماؤں کو قریب سے دیکھا جن کے چرچے گھروں میں ہوتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اور اس عہد کی سرگرمیاں

مولف کتاب کے مکتب کی رسم نامور عالم مولانا سجادؒ کے ہاتھوں ہوئی تھی جن سے خاندان کے لوگوں کے گہرے روابط تھے۔ اپنے والد سے گیا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ قرآن مجید صحیح مخارج کے ساتھ پڑھنے کی تعلیم شیخ سنوسی کے ایک رفیق کار عرب مجاہد شیخ منصور عرب کے ہاتھوں انجام پائی۔ منصور عرب صاحب طرابلس میں جہاد کر رہے تھے کہ اٹلی کی فوجوں نے ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ اتحادیوں کے درمیان باہمی مفاہمت کے رو سے عراق برطانیہ کا حصہ قرار پایا تھا۔ اس لئے منصور عرب صاحب کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا اور وہ ہندوستان میں نظر بند کئے گئے تھے۔ چونکہ اتحادی کامیاب ہو چکے تھے اس لئے ان کو منصور عرب صاحب سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ منصور عرب صاحب کو ہندوستان میں ہر جگہ گھومنے کی اجازت تھی صرف

اتنی پابندی تھی کہ جب وہ ایک شہر سے دوسرے شہر جائیں تو پولیس کو اطلاع دیدیں۔ منصور عرب صاحب بہت اچھے قاری تھے۔ تجوید کی اہمیت دادیہال میں سب سے پہلے والد کے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی بہن ام حبیبہ مرحومہ کو بچپن میں قرآن مجید پانی پت کے ایک قاری صاحب نے پڑھایا تھا۔ ارزانی کے اس زمانہ میں مولف کتاب کے والد ان کو سواری کے خرچ کے علاوہ ماہانہ پچاس روپے دیتے تھے۔ قرآن پڑھانے کے لئے والد ماجد کو عرب بھی وہ ملے جو انگریزوں کے خلاف جہاد میں عملاً شریک ہو چکے تھے۔ وہ اکثر اپنے اور شیخ سنوسی کے جہاد کے قصے بھی سناتے تھے۔

ابتدائی اردو اور قرآن کی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ مدرسہ انوار العلوم گیا میں ہوا جسے مولانا سجادؒ نے قائم کیا تھا۔ ابھی یہ تعلیم جاری تھی کہ جامعہ ملیہ میں داخلہ کے لئے دہلی بھیج دیا گیا جہاں ان کی بہن کا قیام تھا۔ وہ کبھی اپنی بہن کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کے گھر جاتے۔ اور بیگم انصاری کی محبت و خلوص سے متاثر ہوتے دہلی میں ان کے بڑے بھائی پہلے سے جامعہ ملیہ میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں بھائی ہر جمعہ کو جامع مسجد میں نماز پڑھتے جہاں نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی تقریر ہوتی تھی۔ ان تقریروں سے بھی استفادہ کا موقعہ ملتا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی چانسلری کا زمانہ تھا کہ والد جامعہ میں بیمار ہو گئے۔ صحت خراب رہنے لگی تو دادا غلام شرف الدین صاحب جو دہلی اکثر آتے اور پانی پت بھی جاتے تھے والد کو گھر واپس لے آئے کچھ عرصہ کے بعد ان کا داخلہ ہادی ہاشمی اسکول گیا میں ہوا جس کے سکریٹری ان کے پھوپھی زاد بھائی قاضی محمد حسین صاحب تھے۔ اس اسکول میں ان کا داخلہ آٹھویں درجہ میں ہوا تھا۔ گھر اور جامعہ کی تربیت گاہ نے دینی ذوق اور سیاسی شعور دونوں کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فکر و شعور کا تفاوت موجود ہے۔ مسلمان طلبہ میں نہ دینی ذوق ہے اور نہ سیاسی۔ انہوں نے جمعیتہ الطلبہ کے نام سے انجمن قائم کی جس کا مقصد تھا طلبہ میں علمی اور عملی ذوق پیدا کرنا۔ اسکولوں اور مدرسوں کے طلبہ کو متحد کرنا۔ اور مسلم طلبہ کو جنگ آزادی میں شرکت کی تلقین کرنا۔ انہوں نے اس انجمن کی جانب سے ایک کتاب خانہ قائم کیا۔ مجلس مکالمہ بنائی اور کئی قلمی رسالے نکالے۔ ایک رسالہ کا نام تھا "طالب علم" دوسرے کا نام تھا "ہندوستان" اور تیسرے کا نام تھا "احساس"۔ ان رسالوں کو گیا کی لائبریریوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ والد کے ماموں شاہ زین العابدین عثمانی صاحب نے گیا شہر میں اپنے مکان کے اوپر کا حصہ بلا معاوضہ اس انجمن کے دفتر کے لئے دے دیا تھا۔ اس انجمن کے اراکین اور

منتظمین میں ان کے منجھلے بھائی الیسع عثمانی صاحب اور رشتہ کے ایک بھائی حکیم فضل الرحمٰن صاحب تھے جن کا لقب بلال تھا۔ حکیم فضل الرحمٰن صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور ہاسٹل میں رہتے تھے مسلمان طلبہ کے ساتھ بلند آواز سے اذان دے کر نماز پڑھتے۔ انہیں اذان دینے سے ذمہ داروں نے روکا۔ وہ نہیں مانے۔ یونیورسٹی سے ان کا اس پر اخراج ہوا۔ انجمن جمعیۃ الطلبہ نے گیا میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کا لقب بلال رکھا گیا۔ قریبی رشتہ بھی کے علاوہ ذہن وجذبات کی یکسانیت انجمن جمعیۃ الطلبہ کی رفاقت کا باعث بنی۔ حکیم فضل الرحمٰن صاحب عمر میں بڑے تھے۔ شاعر تھے۔ آزادی کے موضوع پر نظمیں کہتے اور گیتیں لکھتے۔ جہاد اور آزادی کی تڑپ نے شاعروں سے بہترین نظمیں کہلوائیں۔ ایک شاعر نے تکیہ کے لئے عجیب وغریب شعر کہے، تکیہ کے اشعار کی تاریخ میں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ تکیہ کے غلاف پر تلوار کی تصویر کے ساتھ شعر لکھے گئے۔

جی میں آتا ہے کہ تکیہ پہ بناؤں تلوار
ہو نہ تلوار تو تلوار کی تصویر سہی

تلوار پہ سر رکھنے کی عادت تو پڑے
جذبۂ بندۂ مومن کی یہ تعبیر سہی

مولف کتاب کے بلال بھائی نے بھی گیت کہے اور ان کو سنائے۔ چند شعر یہ ہیں:-

اے ری اے ری سکھی مری بانہیں سنو پیا جاتے ہیں رن کو میں اب کیا کروں
گھر ہی بیٹھی ہوئی دکھڑا رویا کروں یا کہ میں بھی سپاہی کا پیشہ کروں
مثل خولہ کبھی جو ضرورت پڑے شہسوارانہ میدان میں آیا کروں
دشمنوں کی صفوں میں الٹ پھیر کر تیغ کا اپنے جوہر دکھایا کروں

حکیم فضل الرحمٰن صاحب کے دو بھائی ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ ایک یحییٰ ندوی اور دوسرے طہٰ کمال ندوی۔ یہ دونوں جب ندوہ سے آئے تو انجمن کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے۔ شریک ہونے والوں میں وجیہ الدین منہاجی صاحب بھی تھے۔ جو شاہ زین العابدین صاحب کے رشتہ میں عزیز ہوتے والد کے ایک خالہ زاد بھائی محمد علی بھی انجمن کے کاموں میں شریک ہوتے تھے۔

ہادی ہاشمی اسکول میں اسی زمانہ میں ہیڈ ماسٹر شرف عالم صاحب آرزو جلیلی مرحوم تھے۔

ان کے ایک عزیز نے مولانا احمد سعید صاحب کو گیا میں کسی وعظ کے لئے بلایا۔ والد نے انجمن کی طرف سے انہیں مدعو کیا اور ان کے منجھلے بھائی الیسع عثمانی صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں مولانا احمد سعید صاحب نے مختصر مگر پرجوش تقریر کی۔ والد اور ان کی انجمن کی سرگرمیوں کو دیکھ کر قاضی احمد حسین صاحب نے سائیکلو اسٹائل کرنے کی مشین تحفہ میں پیش کی۔ آزادی کی حمایت میں اور انگریزوں کی مخالفت میں مضامین اس مشین کے ذریعہ سیکڑوں کی تعداد میں چھاپ کر گھروں میں تقسیم کئے جائے۔ وہ نمک ستیہ گرہ کا زمانہ بھی تھا۔ کانگریس اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے پنجاب میں مجلس احرار قائم کی تو حکیم بلال صاحب نے گیا میں اس کی شاخ قائم کی۔ گیا کی جامع مسجد میں جلسہ ہوا۔ والد کے بڑے بھائی شاہ عیسیٰ صاحب عثمانی نے، جو جامعہ سے گیا آگئے تھے، مجلس احرار کے قیام کی حمایت میں تقریر کی۔ وجیہ الدین منہاجی صاحب نے ایک نظم پڑھی جس میں پر تشدد بغاوت پر اکسایا گیا تھا۔ اس کے بعد مرکزی مجلس احرار سے سول نافرمانی کا مکمل پروگرام آیا جس میں ہدایت تھی کہ مجلس احرار توڑ دی جائے اور ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔ انجمن کے اراکین نے مل کر قاضی محمد حسین صاحب کو ڈکٹیٹر بنایا۔ قاضی صاحب اس عہدہ کی وجہ سے جیل بھی گئے۔ جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تو والد نے انجمن کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قلمی پرچوں کا خاص نمبر نکالا تھا۔

ایک بار جمعیتہ الطلبہ کا مدرسہ انوار العلوم میں سالانہ اجلاس کیا گیا۔ قاضی احمد حسین صاحب نے اس اجلاس میں تعلیمی نوعیت کی تقریر کی۔ یہ انجمن مولف کتاب کی کوششوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوگئی تھی۔ وہ اپنے رفقاء کے ساتھ تمام اسکولوں کے طلبہ سے ملتے اور انجمن میں شریک ہونے کی دعوت دیتے اسی کے ساتھ کانگریس کے جلسوں میں بھی شریک ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔

کلکتہ میں قیام اور سیاسی مشغولیت

مؤلف کتاب کے والد نے شہر گیا سے مستقل منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کے منجھلے بھائی تعلیم کے لئے کلکتہ جا چکے تھے۔ مولف کتاب کا داخلہ بھی ۱۹۳۴ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہوا۔ مدرسہ عالیہ کا ایک حصہ اسکول اور ایک حصہ دینی تعلیم کا تھا۔ مدرسہ عالیہ کے ایلیٹ ہوسٹل میں رہنا ہوتا۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہوسٹل کے طلباء میں ذہن وفکر کے اعتبار سے ممتاز اور ہر دلعزیز تھے۔ اس کے باوجود کہ وہاں بنگالیوں میں تعصب تھا اور بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان منافرت اور کشیدگی کی فضا

تھی ؛ وہ ہوسٹل کے کامن روم کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ایسے ہوسٹل میں جہاں کچھ پہلے بنگالیوں کے ہاتھوں ایک بہاری کا قتل بھی ہو چکا ہو۔ یہ انتخاب بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

آزادی کے بعد پروان چڑھنے والی نسل اس دور کا پورے طور پر اندازہ نہیں کر سکتی ہے جو آزادی سے پہلے گذرا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر دھڑ کی بازی لگ رہی تھی۔ لوگوں کے دل جذبۂ انقلاب سے معمور تھے۔ اسلام کے شیدائی آزادی کے لئے سر بکف ہو گئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک تنہا ایک ملک کی آزادی کی تحریک نہیں یہ دراصل اس دیو استبداد کے پنجۂ ظلم و ستم کو توڑنے کی تحریک ہے جس نے پورے عالم اسلام کو جکڑ رکھا ہے۔ مصر پہ انگریزوں کی حکومت تھی۔ عرب دنیا کے بیشتر حصے برطانوی استعمار کے زیر اثر آ چکے تھے۔ مراقش پر فرانس کا قبضہ تھا۔ الجزائر بھی فرانس کے زیر نگیں تھا۔ طرابلس المغرب کا صوبہ افریقہ میں کھو چکا تھا۔ ایران روس اور برطانیہ کا غلام ہو چکا تھا۔ اس صدی کی ابتدا میں ترکی ایک مرد بیمار کی طرح اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ شبلی کی نظم میں ان حالات کی طرف اشارہ ہے ؎

مراقش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ نیم جاں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں یہ حشر سامانیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی تقریباً تمام اہم شخصیات آزادی کی تحریک اور سرفروشانہ جد و جہد میں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں وہ لوگ تھے جو سواران اشہب دوراں تھے اور اسلامی علوم و فنون کے امام بھی تھے۔ تحریر و تقریر کے میدان کے مرد بھی تھے۔ مسلمانوں میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے دانشوروں کی ایک کہکشاں تھی جو تحریک آزادی کے آسمان پر تاباں اور منور تھی۔ مولانا آزاد، شیخ الہند، محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد سجاد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر سید محمود اور دوسرے بے شمار لوگ جن کی فہرست طویل ہے، ان سب کا خیال تھا کہ ہندوستان

جیسے زرخیز ملک سے برطانیہ کو نکال باہر کر دینے کے بعد اس کا نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پھر اس کی تیزی دنداں اور شوخیٔ چشم شرفشاں کا وجود باقی نہیں رہے گا، دوسرے بہت سے اسلامی ملک آزاد ہو سکیں گے اور اس طرح سے یہ اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اس دور میں علماء اور قائدین کا انداز فکر یہی تھا۔

اس کتاب کے مؤلف نے عمر کے آغاز اور تعلیم کے زمانہ سے ان لوگوں کو دیکھا اور اسی نقطۂ نظر کو صحیح سمجھا۔ گھر اور خاندان کے بزرگ اسی فکر کے حامی تھے۔ والد کے ایک قریبی رشتہ دار ترک موالات کے زمانہ میں علی گڑھ کی تعلیم چھوڑ چکے تھے۔ اس لئے بچپن سے اگر سیاسی سرگرمیوں اور آزادی کی تحریک میں شرکت کا مزاج بنا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہی اس دور میں اہل فکر اور اہل دین کے نزدیک صحیح ترین راستہ تھا۔

ان تمام سیاسی دلچسپیوں کے ساتھ میٹرک کا امتحان کلکتہ کے اسکول سے پاس کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱-۲۲ سال تھی۔ امتحان کے بعد ان کے والد شاہ شریف صاحب نے چاہا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کا داخلہ علی گڑھ میں کر دیا جائے۔ داخلہ کی درخواست بھی دے دی گئی اور داخلہ منظور بھی ہو گیا۔ لیکن مولف کتاب نے علی گڑھ تعلیم پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ کا ماحول محبانِ حریت کے لئے سازگار نہیں ہے۔ علی گڑھ تحریک جو سرسید نے چلائی تھی، اس نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو برطانیہ کا وفادار اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا پختہ حامی بلکہ غلام بنا دیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء کا انحصار برطانوی حکومت کے باقی رہنے میں مضمر ہے۔ علی گڑھ تحریک کا اثر اس طبقہ پر زیادہ تھا جو سرکاری نوکریوں اور سرکاری مراعات پر تکیہ کئے ہوئے تھا۔ جاگیر دار اور تعلقہ دار اپنے مفادات کے تحت اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں اور صرف تعلیم تک اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دینے میں سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی میں جکڑے رہیں۔ انگریز ہندوستان سے نہ جائیں کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ سرسید مسلمانوں کو سیاست میں دلچسپی سے نہ روک سکے۔ علی گڑھ تحریک کے حامیوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی جس کا رخ حکومت وقت کی حمایت کی طرف تھا۔ الغرض مؤلف کتاب اس جگہ تعلیم حاصل کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے جو مسلمانوں میں تاجِ برطانیہ کی وفاداری کا اس وقت سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں کے لوگ

انگریزوں کو بہت مہذب اور شریف سمجھتے تھے اور میز پر چھری اور کانٹے سے کھانے کو تہذیب کی معراج سمجھتے تھے۔ وہ تو مولانا آزاد کے حامی تھے جن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت کے ساتھ عدم تعاون اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزہ۔ ان کے پیشِ نظر مولانا سجادؒ کی تحریر تھی جو انہوں نے ایک استفسار کے جواب میں لکھی تھی۔ اور وہ یہ کہ "ہندوستان کی آزادی اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ اگر اہل ثروت بخل سے کام لیں تو بالجبر حسب ضرورت روپے لے لینا جائز ہوگا۔"

۱۹۲۵ کا زمانہ ہو گا کہ مولف کتاب نے اپنے والد صاحب کی اجازت سے علی گڑھ کے بجائے کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن پہلے ہی ان کو معلوم ہوا کہ کالج میں کھدر کے کپڑے پہننے کی شرط ہے۔ چنانچہ اس کالج کو بھی انہوں نے چھوڑا اور بنگاباشی کالج میں سائنس میں داخلہ لے لیا۔ ان کے منجھلے بھائی شاہ الیسع عثمانی نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ سائنس نہ لیں۔ کیونکہ سائنس کے لئے غیر معمولی محنت درکار ہے اور سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ سائنس کی تعلیم مشکل ہے۔ مولف کتاب کے پیشِ نظر غالباً یہ بات تھی کہ مغرب سے مسلمانوں کو جو چیز حاصل کرنی ہے وہ سائنس ہے نہ کہ آرٹ۔ لیکن تجربات نے بتایا کہ شاہ الیسع عثمانی صاحب کا مشورہ صحیح تھا۔ کالج میں آئی ایس سی تک تعلیم چل سکی۔ اور بی ایس سی کے مرحلہ سے پہلے سیاسی کاروانکار نے اتنی شدت اختیار کی کہ تعلیم کا جاری رکھنا ممکن نہ ہو سکا۔

کالج کی تعلیم کے زمانہ میں اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک انقلابی جماعت بنائی۔ ہندو طلبہ انقلابی تحریکوں میں شریک تھے۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان طلبہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں پیچھے نہ رہیں۔ جس طرح ہندو طلبہ انگریزوں کے خلاف تشدد آمیز تحریکوں میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان طلبہ بھی شریک ہوں۔ اس جماعت کا نام مسلم یوتھ اسمبلی اور اردو میں انجمن شباب المسلمین رکھا۔ مولف کتاب خود اس تنظیم کے صدر تھے۔ اس کے سکریٹری ان کے دوست ظہیر الدین صاحب تھے جو بعد میں پاکستان میں وزیر تعلیم بھی ہوئے۔ جب آرگنائزیشن کے خلاف حکومت کا عملہ حرکت میں آیا اور سی آئی ڈی والوں نے تفتیش شروع کی تو ظہیر الدین صاحب اس تنظیم سے دست بردار ہو گئے۔ بعد میں وہ شہید سہروردی کے حامی اور معتقد ہو گئے تھے۔ اس تنظیم میں ان کے ایک اور دوست قاضی معز الدین احمد صاحب بھی شریک تھے جو اس وقت اسلامیہ

کالج کلکتہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور بنگال صوبائی اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے صدر بھی ہو گئے تھے اس زمانہ میں مولانا آزاد کا قیام کلکتہ میں تھا اور مولف کتاب کا قاضی معزالدین صاحب کے ساتھ اکثر مولانا آزاد کے یہاں جانا ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے یہ مشورہ دیا کہ مسلمان انگریزوں کی مخالفت میں ابھی اس درجہ شدت نہیں اختیار کر سکتے ہیں جتنی ہندو اختیار کر سکتے ہیں اس لئے مسلمانوں کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے مناسب یہی ہے کہ انتہا پسندانہ ذوق کی تربیت کے لئے فی الحال خدمتی ادارہ قائم کیا جائے۔ مولانا آزاد کے مشورہ سے مسلم یوتھ اسمبلی کو توڑ کر خدام خلق کے نام سے ادارہ قائم کیا گیا۔ اس نئے ادارے کی ذمہ داری بھی مؤلف کتاب کے سپرد تھی۔ مولانا آزاد مشورے دیتے انہوں نے اس تنظیم کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا۔ اس تنظیم کے تحت مسلمان طلبہ مختلف محلوں میں جاتے۔ وہاں کے غریب لوگوں سے رابطہ قائم کرتے۔ صفائی کے کام کرتے۔ صفائی کے کام کو عیب نہ سمجھنے کی تربیت والد ماجد کو جامعہ ملیہ میں ملی تھی جہاں جلیاں والا باغ کا دن اسی طرح منایا جاتا تھا کہ باورچی، دھوبی اور مہتروں کو چھٹی دے دی جاتی تھی اور طلبہ سارے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔

مولانا آزاد کے علاوہ والد کی ملاقات ڈاکٹر بی سی رائے سے تھی۔ ڈاکٹر بی سی رائے اس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور آزادی کے بعد بنگال کے چیف منسٹر ہوئے۔ انہوں نے خدام خلق کی تنظیم کے لئے فرسٹ ایڈ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ روزانہ شام کو ایک ڈاکٹر تنظیم کے دفتر میں آتا اور فرسٹ ایڈ پر لکچر دیتا۔ اس زمانہ میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا عتیق الرحمٰن بھی کلکتہ میں رہتے تھے دونوں اگرچہ عمر میں کافی بڑے تھے لیکن والد کے ان سے بھی تعلقات تھے اور یہ تعلقات ہمیشہ باقی رہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔

بنگال میں مسلم لیگ کی تحریک کے عروج اور اقتدار کے زمانہ میں جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو کانگریس اور تحریک آزادی میں شامل کرنے کے لئے ایک تنظیم "مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی" قائم کی۔ والد اس تنظیم میں شریک ہوئے اور ہر ہفتہ اس کا جلسہ کرتے۔ یہ تنظیم کانگریس کے ماتحت تھی۔ مسلمان عوام سے رابطہ قائم کرنا مولانا عبیداللہ سندھی کے مشورہ کے مطابق ان کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دینا ملک کی آزادی کی اہمیت سمجھانا، انگریزوں کی عالم اسلام میں لائی ہوئی تباہیوں سے

واقف کرانا، اسلامی غیرت وحمیت پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ ان کاموں میں ان کی صبح سے شام تک مشغولیت ہوتی۔ نماز کے اوقات اور کھانے کے سوا اور کوئی آرام کا وقفہ نہ تھا۔ عوامی سطح پر کام کرنے والے اور اتنا وقت دینے والے کم تھے۔

کلکتہ میں مسلمانوں کا نیشنلسٹ اخبار ہند تھا اور عبدالرزاق ملیح آبادی اس کے ایڈیٹر تھے اخبار کی بعض تحریروں کی وجہ سے نیشنلسٹ مسلمان ایک دوسرے اخبار کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو جمعیۃ علماء کی پالیسی کے مطابق ہو۔ چنانچہ مولانا آزاد کے مشورہ اور خان بہادر کے مالی تعاون اور فہیم صاحب کے پریس کے تعاون سے ایک اخبار استقلال کے نام سے نکلا۔ اداریہ نویسی کے فرائض کامل صاحب نے انجام دیئے باقی ترجمہ اور ترتیب کی ذمہ داریاں مؤلف کتاب کے سر پر تھیں۔ جب کامل صاحب اخبار سے الگ ہو گئے تو اداریہ نویسی کی ذمہ داری بھی مولف کتاب کے سر پر آگئی۔ اور انہوں نے بہت عرصہ تک اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس اخبار میں حکومت وقت کے خلاف سخت مضامین شائع ہوئے۔ بنگال میں شہید سہروردی کی حکومت کا زمانہ تھا۔ اخبار ان کے زمانہ میں کئی بار عتاب کا شکار ہوا۔

مؤلف کتاب کی تحریک پر بنگال میں اس وقت جمعیۃ علماء قائم کی گئی۔ حکیم راحت حسین بہاری صدر اور قاری رحمت اللہ صاحب کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ بنگال میں جمعیۃ العلماء کا وہ تاریخی اجلاس جس میں مولانا عبیداللہ سندھی، بحیثیت صدر، شریک ہوئے تھے اور مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شرکت کے لئے آئے تھے، مولف کتاب کی کوششوں کا رہین منت ہے شہید سہروردی اس اجلاس کو ناکام بنانا چاہتے تھے اور دوسری طرف منتظمین اس کو کامیاب کرنا چاہ رہے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے قائدین نے مؤلف کتاب کو صوبہ بنگال کی جمعیۃ علماء کا ناظم عمومی بنانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے نام پیش کیا اور قاری رحمۃ اللہ صاحب نے اس کی تائید کی لیکن انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کی اور یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد پھر ان سے اس عہدہ کے قبول کرنے پر اصرار کیا گیا۔ اس مسلسل اصرار پر انہوں نے کہا کہ میں صرف کلکتہ ضلع کی نظامت لے سکتا ہوں پورے صوبہ کی نظامت اس شخص کے سپرد کرنی چاہیئے جو بنگالی زبان سے پورے طور پر واقف ہو۔ چنانچہ ضلع کی نظامت ان کے سپرد کی گئی۔

والد نے کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فلسطین کانفرنس بھی منعقد کی اور مفتی عتیق الرحمٰن کو اس کا صدر بنایا۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ والد کی سیاسی اور ملی اور

بھوپال اور پھر بہار میں قیام

صحافتی مشغولیات کے شباب کا زمانہ تھا۔ تعلیم منقطع ہو چکی تھی کہ ان کو اپنے والد ماجد کی علالت کی خبر سن کر بہار آنا پڑا۔ ایک دو ماہ کے قیام کے بعد ان کو بھوپال میں قیام کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جہاں ان کے برادر نسبتی نے بڑے پیمانے پر انگریزی دواؤں کا بزنس شروع کیا تھا۔ اور ان کو معاون کی ضرورت تھی۔ متاہل زندگی کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ اس لئے معاشی ضرورتیں بھی اس کی متقاضی تھیں۔ بھوپال میں سات برس قیام رہا۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس زمانہ میں بھوپال قاضی ہو کر تشریف لائے تھے اور والد کے برادر نسبتی سے ان کی قرابت بھی تھی۔ علماء کے طبقہ میں سید صاحب سے اہل تصوف میں مولانا یعقوب صاحب مجددی اور سیاسی لوگوں میں شاکر علی خاں سے ان کے تعلقات تھے۔ والد کے برادر نسبتی کے بھائی ڈاکٹر عبد الرحمان صاحب جو چیف میڈیکل افسر تھے اور ڈاکٹر انصاری کے دوستوں میں تھے، ان کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر کے داماد شعیب قریشی صاحب سے بھی تعلقات ہوئے جو وزیر تعلیم تھے۔ بھوپال میں قیام کے دوران وہ مضامین لکھتے رہے جو زیادہ تر انصاری دہلی اور مدینہ بجنور میں شائع ہوئے۔ جمعیۃ علماء کے کاموں کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے مراسلت جاری رہی

جب الیکشن کا زمانہ آیا اور مولانا حفظ الرحمان صاحب نے انہیں لکھا کہ بہار میں نیشنل مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو سنبھالنے کے لئے آپ کی ضرورت ہے تو وہ بہار آ گئے۔ الیکشن کے بعد وقف بل کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمود کی قائم کردہ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ان کو رانچی بلایا گیا۔ اس اجلاس کے بعد پورے بہار میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ۱۹۴۷ کے اس لرزہ خیز فسادات نے پورے بہار کو ہلا دیا۔ فسادات کے سلسلہ میں مونگیر میں صوبائی جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں وہ شریک ہوئے اور فسادات کے سلسلہ میں ان ہی کی مرتب کردہ تجویز منظور ہوئی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی دعوت پر دہلی میں جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ اس سفر میں ان کے پھوپھی زاد بھائی قاضی احمد حسین صاحب بھی شریک تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد سے مل کر بہار کی صورتحال بتائی۔ انہوں نے دہلی میں خان عبد الغفار خان سے ملاقات کی اور بہار

کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ خان عبدالغفار خاں بہار آئے اور انہوں نے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ اس پُر آشوب زمانہ میں پٹنہ سے نکلنے والے ایک اخبار الہلال کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور خان عبدالغفار خاں کے دورہ کی تفصیلات الہلال میں شائع ہوئیں۔ کلکتہ کے استقلال کے بعد یہ پٹنہ کا اخبار الہلال تھا جس میں بحیثیت ایڈیٹر انہوں نے کام کیا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے والد کو پٹنہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم مقرر کیا۔ انہوں نے نظامت کے زمانہ میں ریلیف کمیٹی بھی قائم کی جس کی مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ مسلمانوں کی جائدادیں بحق کسٹوڈین ضبط ہو رہی تھیں۔ ملی خدمت کی نئی ذمہ داریاں ان کے سر پڑ گئیں۔ مسلمانوں کی شکایتیں سننا اور وفد لے کر وزراء سے رابطہ قائم کرنا وقت کا بڑا حصہ اس طرح کے کاموں میں گذرتا۔ کاموں کے ہجوم کے ساتھ ڈاکٹروں نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ اس لئے جمعیۃ علماء کی نظامت سے مستعفی ہو کر وہ اپنے وطن سملہ چلے گئے جہاں انہوں نے کاشتکاری شروع کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد قاضی احمد حسین صاحب، مولانا عبدالصمد رحمانی اور امیر شریعت مولانا شاہ قمر الدین کے اصرار پر امارت شرعیہ آگئے۔ نائب ناظم کے علاوہ انہیں ہفت روزہ نقیب کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ صحافتی زندگی میں یہ تیسرا اخبار تھا جس میں انہوں نے بحیثیت ایڈیٹر کام کیا۔

بحیثیت ناظم انہوں نے بہار کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور اس کی رپورٹ حکومت کو بھیجی۔ اسکولوں میں جو نصابی کتابیں چل رہی تھیں ان میں فرقہ وارانہ زہر موجود تھا۔ انہوں نے قابل اعتراض مواد کی نشاندہی کی اور حکومت کے ذمہ داروں کو اس سے مطلع کیا۔ اس وقت کے چیف منسٹر سری کرشن سنہا نے محکمۂ تعلیم کے افسروں کو بلا کر کہا کہ اس کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ ان کی کوششوں سے امارت کا دائرۂ اثر بھی بڑھا اور نقیب کی تعداد اشاعت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ یہ زمانہ ان کی بہار کے مسلمانوں کی دینی رہنمائی ملی خدمت اور جانی اور مالی تحفظ کی کوششوں کا عنوان ہے۔ ایک طرف فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور حکومت کا غیر منصفانہ رویہ اور دوسری طرف خود مسلمانوں کی بے شعوری اور احساس کمتری اور دینی ذوق کی کمی، ان حالات میں انہوں نے وہی خدمت انجام دی جو ملت کے بعض ممتاز اور بے لوث خادموں نے انجام دی ہیں۔ دنیا میں کسی صلہ اور ستائش سے بے پرواہ ہو کر۔ اقبال کا مصرعہ "بیا تا کار ایں امت بسازیم" ان کے خلوص اور خدمات کا صحیح تر عنوان بن سکتا ہے۔

حالات اگر اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو ملی خدمت کا یہ باب وسیع تر اور مفید تر ہوتا لیکن امیر شریعت ثالث اور قاضی احمد حسین صاحب کے انتقال کے بعد نئے ذمہ داروں کی آمد کے ساتھ ذہن اور ذوق کے اختلاف کی خلیج پیدا ہوتے لگی۔ مولف کتاب نے آزادی کی تحریک میں اس لئے تو حصہ نہیں لیا تھا کہ آزادی کے سورج کے طلوع ہوتے کے ساتھ مسلمان نئی آقائیت کی مصیبت سے دوچار ہو جائیں۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایتیں تھیں اور اس بارے میں ان کا قلم حکومت کے خلاف ناقدانہ اور بے باکانہ چلتا تھا اور یہ بات نئے ذمہ داروں کے ذوق پر گراں گذرنے لگی۔ اختلاف کا نقطۂ عروج اس وقت ہوا جب ۱۹۶۲ میں چین کی جارحیت کا واقعہ پیش آیا۔ امیر شریعت نے فتویٰ دیا کہ چین سے جنگ ایک جہاد ہے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی نے کمیونسٹ چین سے جنگ کے سلسلہ میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے تھے وہ خوف اور احساس کمتری کے شکار تھے۔ وطن کے سلسلہ میں مسلمانوں کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ عام حالات میں بھی حکومت کے خلاف لکھنا مصیبتوں کو دعوت دینے اور سرکاری اشتہارات سے محروم ہونے کے مترادف تھا۔ جنگ کے زمانہ میں تو حکومتیں زیادہ حساس ہو جاتی ہیں۔ لیکن چین سے جنگ جہاد ہے یا نہیں یہ ایک اصولی مسئلہ تھا۔ انہوں نے نقیب میں اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا کہ "یہ جنگ مذہبی نہیں" انہوں نے اس اداریہ میں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو خود حکومت سے بنیادی شکایتیں ہیں۔ مسلمانوں کو جان و مال مذہب اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ چین نے ہندوستان پر اس لئے حملہ نہیں کیا ہے کہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے۔ اس لئے جارحیت کے اس واقعہ کی دینی اصطلاح میں تعبیر صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاد کی بات اتنی غلط تھی کہ ایک لمحہ کا منطقی تجزیہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن خوف و ہراس کا شکار ذہنوں کے لئے یہ صحیح تحریر بھی چین کی جارحیت کی طرح خطرناک سمجھی گئی۔ یہ اختلاف کا نقطۂ عروج تھا۔ اس کے بعد ان کا امارت سے تعلق باقی نہیں رہا۔ لیکن یہی تحریر جو امارت کے نئے ذمہ داروں کو ناگوار گذری مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہت پسند کی اور انہوں نے اسے تعریفی نوٹ کے ساتھ صدق جدید میں شائع کیا۔ پاکستان کی جماعت اسلامی نے اس جنگ میں ہندوستان کے بجائے چین کے موقف کو صحیح قرار دیا۔ اگر محض چین کے کمیونسٹ ہونے کی بنا پر اس جنگ کی نوعیت جہاد کی ہوتی تو

پاکستان کی جماعت اسلامی کے نزدیک بھی چین کے ساتھ یہ جنگ جہاد قرار پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک سرحدی جھگڑا تھا۔ اور اسے جہاد قرار دینا ایک غلطی کا ارتکاب تھا۔

عام طور پر فکر و ذہن کے اختلافات ذاتی اختلافات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں پھر اختلاف اور مخالفت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا ہے پھر وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا نمونہ حال ہی میں دارالعلوم دیوبند کے جھگڑوں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ بالجہر تبرا سے لے کر رفع یدین تک کی نوبت آتی ہے لیکن مولف کتاب اور امیر شریعت کے درمیان بعد کی زندگی میں مودت و رحمت کے تعلقات باقی رہے۔ یہ سب کچھ دونوں کی بلند ظرفی اور فراخدلی کی دلیل اور قرآن کی آیت " وَ لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا " کی عملی تفسیر ہے۔

دوبارہ کلکتہ میں قیام اور دعوتی کام

امارت کے کاموں سے علیحدگی کے بعد فوراً غلام سرور صاحب نے اپنے اخبار سنگم میں اداریہ نویسی کے کام کی پیشکش کی۔ غلام سرور صاحب سے غالباً فکری اتحاد کا رشتہ نہ تھا البتہ جرارت اور ہمت کیساتھ حکومت پر ان کی تنقید کو وہ قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ دنوں تک سنگم میں کام کیا اور اداریئے لکھے۔ اس کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ اس شہر میں رہنے کے لئے ان کی دوسری بار آمد تھی لیکن اس بار جمعیۃ علماء وہ جمعیۃ علماء نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ مفتی عتیق الرحمان دست کش ہو گئے تھے۔ ملی تنظیموں سے علیحدہ رہ کر انہوں نے غیر مسلموں میں کام کا آغاز کیا۔ معاشی ضرورت کے لئے اخبارات میں کام کیے۔

جب ونوبا بھاوے کلکتہ آئے تو انہوں نے ملاقات کی۔ ونوبا جی نے کہا کہ " عثمانی صاحب! مسلمان میرے ساتھ نہیں آتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے، روح القرآن مرتب کی ہے، آپ سب کے سامنے اسلام کی تعلیمات کی سچائی کا اقرار کیجئے۔ گاندھی جی اپنے کو مسلمان تک کہتے ہوئے نہیں ہچکچاتے تھے۔" ونوبا جی خاموش رہے لیکن محمد علی پارک میں جب جلسہ ہوا تو انہوں نے اپنی تقریر کی ابتدا سورہ والعصر کی تلاوت سے کی اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ خدا کو ایک مانتا ہوں، نبیوں کو مانتا ہوں، مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔

کلکتہ میں مارواڑیوں کی ایک اسٹڈی سرکل تھی۔ وہاں دانشور اور جدید تعلیم یافتہ لوگ علمی انداز

میں مذہبی اور سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ مولف کتاب دعوتی ذہن کے ساتھ ہر ہفتہ اس کے جلسہ میں شریک ہوتے اور اسلام کی تعلیمات کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں ہوتیں اسے دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ان عالمانہ گفتگو اور مذہبی معلومات سے متاثر ہو کر اسٹڈی سرکل کے لوگوں نے ہر ہفتہ درس قرآن کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ۔ ۔ مہینے تک انہوں نے درس قرآن بھی دیا اور مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ علماء جب دہلی آئے تو ہندوؤں کی اس اسٹڈی سرکل میں ان سے اسلام پر تقریر کرائی۔ باثر مارواڑیوں کے درمیان کام کرنے کا اتنا فائدہ ہوا کہ جب کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑا تو مارواڑیوں کے اس علاقہ میں جو زکریا اسٹریٹ سے ہوڑا اسٹیشن تک تھا، مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ مارواڑیوں نے ریلیف کا کام بھی کیا۔ کلکتہ کے اس قیام کے دوران مسلمانوں میں وہ سب سے زیادہ مولانا حکیم زماں حسینی صاحب سے ملتے جو بڑے عالم دین، صاحب ورع و تقویٰ اور طبیب حاذق ہیں اور آج تک ان سے گہرے اور مخلصانہ تعلقات ہیں۔

حجاز کا سفر اور مکہ معظمہ میں قیام

۱۹۶۸ میں مولف کتاب نے اپنی ہمشیر کے ساتھ حجاز کا سفر کیا۔ ان کی ہمشیر کو وہاں قیام کرنا تھا اور وہ ہجرت کی نیت سے آئی تھیں۔ مولف کتاب کو حج کے بعد واپس آنا تھا لیکن اعزہ نے مشورہ دیا کہ یہاں کا "اقامہ" حاصل کر کے مکہ میں ٹھہرو، معاشی شکل بھی نکل آنے گی جو ہندوستان سے ہزار درجہ بہتر ہو گی اور اس قیام سے حرم شریف میں عبادت بھی زیادہ ہو گی اور دینی خیر و برکت بھی حاصل ہو گی۔ عنفوانِ شباب سے لے کر بڑھاپے کی منزل تک مسلسل سیاسی اور ملی جدوجہد کے راستہ کے تھکے ہارے مسافر کو اب آرام اور خدا کی طرف لو لگانے اور عبادت کے لئے یکسو ہونے اور "فسبح بحمد ربك واستغفره" پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اس نیک مشورہ کو قبول کیا۔ مکہ مکرمہ میں ان کے ماموں شاہ زین العابدین صاحب عثمانی ندوی کے اہل و عیال پہلے سے رہتے تھے۔ ان سب لوگوں کو وہاں کی شہریت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کی خالہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مستقل طور سے وہاں مقیم اور مصروف عبادت ہو گئی تھیں اور اب ان کی بیوہ بہن بھی آگئی تھیں۔ اور بہن کے سسرالی رشتہ دار بھی وہاں آباد ہو چکے تھے۔ اس طرح دیار حجاز میں بھی وطن کی بو باس موجود تھی۔ ان سب کے علاوہ وہ گہرا دینی ذوق جو بچپن سے لے کر عمر کی اس منزل تک ہمیشہ ان کا رفیق اور دمساز رہا مشورہ قبول کرنے اور جوار حرم میں قیام کرنے

پران کو آمادہ کرتا رہا ہوگا۔ انہوں نے سب کے مشورہ سے وہاں کا قیام منظور کیا۔ اچھی انگریزی دانی کی وجہ سے بہتر معاش کی شکل حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی اور اللہ تعالیٰ نے وہاں کے قیام کو دینی اور دنیاوی خیر و برکت کا ذریعہ بنایا۔ راقم السطور کے چھوٹے بھائی احسن عثمانی سلمہ کی شادی شاہ زین العابدین صاحب عثمانی کی صاحبزادی سے ہوئی جو مکہ مکرمہ میں سرکاری اسکول میں معلمہ ہیں۔ چند سال سے سب سے چھوٹے بھائی احمد عثمانی سلمہ بھی مکہ میں ہیں اور وہاں حکومت کے ایک محکمہ میں ملازم ہیں۔ تقریباً ہم سب بھائی بہنوں کو حج کی سعادت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ ہم لوگوں کی والدہ نے بھی انتقال سے پہلے مکہ معظمہ میں قیام کیا تھا اور حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئی تھیں۔ خود والد ماجد نے اس سولہ برس میں ایک دو بار کو چھوڑ کر ہر سال حج کیا حرم شریف کی مسلسل حاضری، عبادت و تلاوت، طواف وعمرہ و حج یہی اصل وہاں کے قیام کے فائدے اور نفع کی چیز ہیں۔ باقی جو کچھ ہے وہ انسان کو دنیا میں کہیں بھی مل سکتا ہے اور وہاں سے زیادہ مل سکتا ہے۔ روحانی سوغات کی قدر و قیمت سے واقفیت بھی خدا کی طرف سے ایک انعام ہے۔ اگر اس حقیقی قدر و قیمت سے انسان ناواقف ہے تو روئے زمین کے اس قلب میں قیام کر کے بھی انسان محروم اور تہی دامن رہتا ہے۔ مولف کتاب کو مکہ مکرمہ میں رہ کر دینی اور روحانی استفادے اور معاشی فراغت کے ساتھ عالم عربی اور عالم اسلامی کے لوگوں سے ملنے اور ان کے حالات کو جاننے کا موقع ملا۔ انہوں نے وہاں قیام کے دوران لبنان اور شام کا سفر کیا اور سعودی عرب کے مختلف شہروں اور مقامات کی سیاحت کی۔

حجاز میں طویل عرصہ تک یہ قیام اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ انہیں اس شرف کے حاصل کرنے کا پہلے خیال تک نہ تھا۔ لیکن خواب میں انہیں وہ زندگی دکھائی گئی تھی جو مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ ہے کہ:-

> " زندگی میں بہت بار خواب میں زیارت بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ کبھی میں نے حرم شریف میں غسل کرتے ہوئے اپنے کو دیکھا، کبھی اونٹ پر خود کو سوار پایا، کبھی اونٹوں کا جھنڈ دیکھا۔ ہوش و حواس میں بیداری کے ساتھ ایک بار حج کا ارادہ کیا لیکن سامان نہ ہو سکا۔"

والد ماجد نے جب پہلے پہل حجاز کا سفر کیا تو رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد رمضان کے آخر عشرہ میں حرم میں اعتکاف کیا اور قرآن کے دو ختم کئے۔ رمضان کے بعد مدینہ منورہ جانا ہوا اور تیرہ دن وہاں قیام کیا۔ یہ

مدینہ کا پہلا سفر تھا۔ حج کے بعد دوسرا سفر ہوا اور پھر بار بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

ذاتی اوصاف اور خصوصیات

اس مقدمہ کے اختتام پر بعض اوصاف کا تذکرہ ضروری ہے۔ مؤلف کتاب کا خاص ذوق ورع و تقویٰ، تسبیح و تلاوت اور عبادت کا ذوق ہے۔

جو پورے خاندان کا مشترک وصف رہا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ اختلافِ ذوق و مزاج کے باوصف خاندان کے بزرگوں میں جو چیز کہ قدر مشترک ہے وہ یہی روحانیت اور سادہ الفاظ میں آخرت کی تیاری ہے۔ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کا خاندان جو بہار میں آکر فردوسی سلسلہ سے وابستہ ہوگیا دینی ذوق کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ نوک قلم سے اس وصف کا تذکرہ جتنا آسان ہے، عملی زندگی میں وہ اسی قدر مشکل ہے۔ آج کوئی شخص چاروں طرف نظر ڈالے تو دنیا کی طلب کا بحران نظر آئے گا۔ ہر انسان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اس کا معیارِ زندگی بلند سے بلند تر ہو جائے خواہ معیار بندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جائے آسائش کی زندگی کی طلب زیادہ معیوب نہیں لیکن اگر یہی زندگی کا مقصود بلکہ معبود بن جائے تو اس کا نام دنیاداری اور آخرت فراموشی ہے۔ اب بہت سے لوگ دین کا لبادہ بھی دنیا حاصل کرنے کے لئے اوڑھ لیتے ہیں۔ موت کا استحضار اور آخرت کی فکر کرنے والے افراد ہی فی الواقع عقلمندوں کے زمرہ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر زندگی گذارنے والے حقیقت پسند کہلانے کے مستحق ہیں۔ ورنہ مال و دولت کی ریل پیل اور سیم و زر کی فراوانی سے بہرہ مند زندگی کو جن لوگوں نے کامیاب زندگی سمجھ لیا ہے وہ کھلونوں سے بہل جانے والے بچوں کا ذہن رکھتے ہیں۔ اور آج کی دنیا ایسی ہی احمق انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔

یہ بات صرف ایک شخص کا ذاتی وصف بیان کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس لئے لکھی گئی ہے کہ نونہالانِ خاندان اور تازہ واردانِ بساط عالم کو معلوم رہے کہ خاندان کا اصل مزاج کیا ہے۔ وہ اس نعمت کی قدر کرنا اور اسے حاصل کرنا ضروری سمجھیں۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ کسی خاندان کی بات نہیں بلکہ دین اور قرآن کی بات ہے بلکہ یہی اصلِ دین ہے اور اسے ہر مسلمان کی زندگی کا مطلوب اور مقصود ہونا چاہئے خدا طلبی کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان کی صبح سے شام تک کی زندگی میں یہی پہلو نمایاں ہو۔ خدا انسان کے دل کی دھڑکن بن جائے اور خدا کا دین اس کے فکر کا محور۔ اس کی باتوں کا موضوع اور اس کی سرگرمیوں کا میدان بن جائے۔ اس کی زندگی اسی رنگ میں اس طرح رنگ جائے جس طرح رنگ ملانے سے گلاس

کا پانی رنگین ہو جاتا ہے۔

راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا، والد ماجد مولف کتاب مدظلہ کو اذکار و اوراد کا پابند دیکھا اور انہیں نئی نسل کی دینی تربیت کے لئے بے چین پایا۔ ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ہمیشہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا۔ عبد اللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ قرآن اور حواشی انہیں بہت پسند ہیں۔ حجاز جانے سے پہلے میں نے دیکھا کہ وہ رمضان کے زمانہ میں پانچ چھ بار قرآن مجید کا ختم کرتے اور ایک بار عبد اللہ یوسف علی کے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ پورے قرآن کا ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے۔ مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انہوں نے کئی بار ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی۔ تفہیم القرآن اور بعض دوسری تفسیروں سے بقدر ضرورت استفادہ کیا۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی قرآن کا کئی بار مطالعہ کیا اور ان کو ان حواشی کا بہت معترف و مداح پایا۔

سحر خیزی اور اذکار و اوراد کی پابندی اور تسبیح و تلاوت کے شوق کے باوجود خاندان کی عام روش کے خلاف وہ کسی کے دست گرفتہ اور کسی کے دامن سے وابستہ نہیں ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ بیعت و ارشاد کے سلسلہ کے مخالف ہیں بلکہ خام صوفیاء اور تصوف کے لباس میں اہل دنیا کی کثرت دیکھ کر ان کی طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ حصولِ دین کے لئے یہ چیز اتنی لازمی نہیں جتنا اب لوگوں نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے مسلسل اشتغال، دینی کتابوں کا مطالعہ، مسنون اذکار کی پابندی اور اس کے ساتھ اہل دین سے تعلق اور صحبت، یہ چیزیں حصول مقصود کے لئے کافی ہیں۔ اور اگر یہ چیزیں انسان کی زندگی میں نہ ہوں تو صرف بیعت ہو جانے سے مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ائمہ دین اور علماء سلف میں بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے رسمی طور پر کسی سے بیعت نہیں کی تھی لیکن انہیں وہ چیزیں حاصل ہوئیں جو دین کا مقصود ہیں

دوسری خصوصیت ان کا علمی شوق اور مطالعہ کا ذوق ہے۔ نئی شائع ہونے والی کتابیں اکثر خرید کر پڑھتے ہیں۔ دار المصنفین کی کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور علامہ شبلی اور سید صاحب کی کتابوں کی علمیت اور وزن کے قائل اور معترف ہیں۔ ندوۃ المصنفین کی کتابوں میں صدیق اکبر انہوں نے بہت پسند کی اور دو سال پہلے جب اس ادارہ سے سیدنا عثمان شائع ہوئی تو مکہ مکرمہ سے خط لکھا کہ اسے ضرور بھیج دو۔ پاکستان سے تدبر قرآن کی تمام جلدیں منگائیں۔ مفتی کفایت اللہ کے فتاویٰ کا مجموعہ کئی جلدوں

شائع ہوا تو اسے خریدا۔ تذکیر القرآن کا پہلا حصہ شائع ہوا تو اسے ہندوستان سے منگا کر پڑھا۔ اور اس پر اپنا تبصرہ لکھ کر بھیجا۔ تازہ ترین خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ فرانسیسی عالم کی کتاب کا انگریزی ترجمہ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ دی سائنس" انہوں نے ابھی ختم کی ہے۔ انگریزی میں زیادہ تر سیاسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا سیاسی شعور پختہ اور علمی دینی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے دینی مدارس کے بہت سے فارغ التحصیل مجلسوں میں ان کی معلومات سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کی تیسری خصوصیت رہن سہن اور پوشاک میں ان کی وضع داری ہے۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں بھی وہ نہ صرف کرتا پاجامہ پہنتے بلکہ سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے۔ ناواقف لوگ انہیں مدرسہ کا مولوی سمجھتے۔ ماحول سے متاثر نہ ہونا اور اپنے طریقہ کو صحیح سمجھنا ایسی خصوصیت ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے حجاز میں قیام سے پہلے تک صرف کھدر کا کپڑا پہنتے تھے۔ حجاز میں قیام کے بعد عربوں کا لباس پہنتے ہیں۔

موجودہ دینی تحریکات میں سب سے زیادہ مداح تبلیغی جماعت کے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے باضابطہ طور پر بہت کم کام اس جماعت میں کیا ہے۔ سیاسی تحریکات میں پاکستان بنانے کی تحریک انہیں کبھی پسند نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ تحریک آزادی میں شامل علماء کے حامی رہے۔ مولانا مودودی کے وہ مضامین جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" میں شامل ہیں، انہیں پسند نہیں ہوئے۔ لیکن جماعت اسلامی کے سلسلہ میں دوسرے علماء کی طرح سخت لب ولہجہ انہوں نے کبھی نہیں اختیار کیا بلکہ تحریک کے مفید پہلوؤں کی تعریف کی۔ بہار میں سب سے زیادہ متاثر مولانا سجادؒ سے ہوئے اور خاندان میں اپنے بڑے بھائی شاہ عیسیٰ صاحب عثمانیؒ اور اپنے پھوپھی زاد بھائی قاضی احمد حسین صاحب کا اثر قبول کیا۔

انہوں نے حجاز کی سولہ سترہ سالہ زندگی میں احتیاط اور تقویٰ کی وجہ سے مغربی ملکوں سے درآمد کئے ہوئے ٹن کے ڈبوں والے ماکولات اور مشروبات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں بسکٹ اور چاکلیٹ اور پیسٹری سے لے کر دودھ، گھی اور کریم سب باہر سے منگایا جاتا ہو، اور ملک کے اندر کے ڈیری فارم کا دودھ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو، ان ماکولات سے مستقل طور پر پرہیز کرنا سخت مجاہدہ ہے ہندوستان کے بنے ہوئے بسکٹ وغیرہ کوئی آنے والا تحفتاً دیتا ہے تو اسے کھا لیتے ہیں لیکن مغربی ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں جن میں روغنیات کا استعمال ہو، خود نہیں کھاتے لیکن گھر کے لوگوں کو نہیں روکتے ہیں۔ لیکن مغربی عطریات سے

کے استعمال سے جن میں الکحل ہوتا ہے اور جن کے استعمال کا عام رواج ہے، گھر کے لوگوں کو بھی منع کرتے ہیں۔
ایک بار مجھے اپنی ایک نئی ملازمت کے سلسلہ میں ایک موہوم سی پریشانی لاحق ہوئی۔ میں نے اپنی پریشانی کا تذکرہ اپنے خط میں بھی کیا۔ انھوں نے اپنے جواب میں رفع اضطراب کی کوشش کرتے ہوئے حرص ملازمت کے رویہ پر تنقید کی اور یہ لکھا کہ دینی تعلیم کے بعد بھی یہ حال ہے تو دینی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں اس کے بعد یہ مسنون دعا اللھم لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا مفہوم کے استحضار کے ساتھ روزانہ سو بار پڑھنے کی تاکید کی۔ جو بات انہوں نے میرے دل میں بٹھانی چاہی اسے ایک شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے:-

نہیں ہے غم جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ یار سلامت ہزار مے خانے

پاکستان اور ہندوستان کے لوگ جو سعودی عرب جاتے ہیں، عام طور پر عربوں کے سلسلہ میں ان کی زبان تنقید بے حد دراز ہو جاتی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہاں کے علماء اور صلحاء سے ان کا واسطہ نہیں ہوتا، دوسرے عربی نہ جاننے کی وجہ سے عام عربوں سے بھی زیادہ گھل مل نہیں پاتے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ حرمین کے احترام کے تقاضے انہیں معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ اس سرزمین سے محبت کے آداب کیا ہیں۔ حجاز میں طویل عرصہ تک قیام کے باوجود عربوں کی عام طور پر وہ فراخ دلی کے ساتھ تعریف کرتے ہیں البتہ لبنان میں بر سر عام جو فسق و فجور نظر آیا اس پر انہوں نے کئی بار اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔
خوشحالی اور فارغ البالی کے موجودہ دور میں بھی وہ سادگی اور جفاکشی کی زندگی پسند کرتے ہیں۔ برادرم احسن سلمہٗ اور ان کے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ مکان ایر کنڈیشنڈ ہے لیکن انہوں نے اپنے کمرہ میں ایر کنڈیشنڈ نہیں لگوانے دیا۔ ہندوستان سے آنے والے تمام اعزا اور احباب سے ملنا، ان کی دعوت اور خاطر مدارات کرنا اور تھوڑے عرصہ پر ہندوستان میں آکر قریب اور دور کے تمام اعزہ سے کبر سنی کے باوجود جا جا کر ملنا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ان کی تہذیب اور اخلاق کا حصہ ہے۔
حسب و نسب کے سلسلہ میں خاندان کے روایتی تصور کو وہ دین کے خلاف سمجھتے ہیں اور ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو دین داری اور نمازوں کے اہتمام سے عاری نوجوانوں سے صرف نسبی طور پر بہتر ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کی شادی کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ فاطمہ بنت اللہ ینسے کی صریح خلاف ورزی

ہے۔ اصل معیار دین ہے نہ کہ حسب ونسب۔

زبان و اسلوب کے سلسلہ میں بہت زیادہ سادگی انہیں پسند ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان ایسی ہونی چاہیئے جسے کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکیں۔ وہ خود بھی اس اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں صحافتی زندگی میں ان کی تحریریں عام طور پر سادہ ہیں۔

یہ مقدمہ جو "مؤلف کتاب کے بارے میں" کے عنوان سے لکھا گیا وہ مؤلف کے علم کے بغیر لکھا گیا۔ چند روز پہلے ان کا خط آیا کہ "میں خواب میں گھر کے تمام بزرگوں کو، جن کا انتقال ہو گیا ہے، دیکھ رہا ہوں اور ان کے ساتھ تمہیں بھی دیکھ رہا ہوں۔ خیریت کا خط لکھو۔" میں نے جواب میں لکھا کہ آپ کی کتاب "ٹوٹے ہوئے تارے"، جو پریس میں جا رہی ہے، اس کا مقدمہ میں نے لکھا ہے اور اس میں میں نے ان مرحوم بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے جن کو آپ نے دیکھا ہے۔ صحیح تعبیر اللہ کے علم میں ہے اور وہی علیم وخبیر ہے۔

محسن عثمانی
سنٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز
اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز
جواہر لال نہرو یونی ورسٹی۔

مقدمہ

اس کتاب میں بعض ان شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات اور ملاقاتوں کے احوال درج ہیں جن سے مجھ کو خلوص رہا۔ ایسے لوگ اور بھی ہیں۔ اپنا سفینہ تو کنارے آلگا ہے۔ بہتر برس کی عمر ہو چکی، کوئی دم کا مہمان ہوں، امید نہیں کہ آئندہ اس طرح کے تاثرات لکھنے کا موقع ملے۔ پھر بھی اگر زندگی نے وفا کی اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں ان کا بھی حال لکھوں گا۔ میرے مضامین میں پھولوں کی خوشبو بھی ہوگی اور کانٹوں کی چبھن بھی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اگر میرے مضامین کو مکمل طور پر پڑھا گیا تو امید ہے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

سورج کی کرنیں چھوٹے بڑے امیر غریب، دوست دشمن سب کو نفع دیتی ہیں۔ جو پبلک زندگی میں رہے ہیں وہ سورج ہی کی طرح ہیں۔ اگر ہم اپنی آنکھیں بند نہ کریں تو ہم کو ان سے روشنی ملے گی اور اگر آنکھیں بند کر لیں تو بھی موسم کی تبدیلی کے ذریعہ ہم پر ان کا اثر پڑ کر رہے گا۔ بہتر ہے ہم ان محسنوں سے واقف رہیں۔

اس کتاب میں سب وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں باقی نہیں بجز دو اشخاص کے ان میں ایک خان عبدالغفار خان ہیں۔ ان کا ذکر اس لئے کر دیا کہ ان کی عمر نوے برس کی ہو چکی۔ یہ چراغ سحری ہیں۔ ممکن ہے ان پر کچھ لکھنے کا موقع آئندہ نہ ملے۔

اس کتاب میں زیادہ تر ان کا تذکرہ ہے جو کانگریس میں رہے یا جنھوں نے کانگریس کے ساتھ آزادی کی جنگ میں حصہ لیا، اس لئے ان کے حالات بیان کرنے سے پہلے کانگریس اور اس کی تحریک کا تعارف درج ہے۔

محمد عثمانی

۷ رجمادی الاول ۱۴۰۳ھ ۔

انڈین نیشنل کانگریس — ایک اجمالی تعارف

انڈین نیشنل کانگریس کو مسٹر ہیوم ایک انگریز نے ۱۸۸۹ء میں قائم کیا تھا، غرض یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو حکومت برطانیہ کے حضور میں استدعائیں اور درخواستیں پیش کرنے کے آداب سکھائے جائیں. شروع میں بہت زیادہ حکومت نواز ہندو اور مسلمان شریک ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں اصحابِ اعتدال داخل ہوئے۔ جو نہ حکومت کے پورے طور پر باغی تھے اور نہ پورے وفادار۔ اور درخواستوں نے مطالبات کی شکل اختیار کر لی لیکن اس دور میں کانگریس اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکی کہ اس کے سالانہ اجتماعات ہو جاتے تھے اور اس میں کچھ مطالبات منظور کر لئے جاتے تھے۔ پھر جنگ بلقان کا زمانہ آیا۔ مسلمانوں میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیلی۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی افریقہ سے آئے۔ اور عدم تشدد کی جنگ کا اور ان کی اپنی زبان میں ستیہ اور اہنسا کا تجربہ لے کر آئے۔ ہندوستان میں بھی دو ایک جگہ انھوں نے اس کا کامیاب تجربہ کر لیا۔ پھر مسلمانوں کی مدد سے انھوں نے کانگریس پر قبضہ کیا۔

چونکہ گاندھی جی ترکی خلافت کی حمایت کر رہے تھے اس لئے مسلمان ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ معتدلین کو گاندھی جی اور ان کے ساتھی انتہا پسند معلوم ہوئے۔ کیونکہ وہ کسی ایسے قانون کی پابندی کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان کے خیال میں غلط ہوتے تھے۔ یا جو اعلانِ حق میں مزاحم ہوتے تھے گاندھی جی کہتے تھے جو تمہارا ضمیر صحیح کہے اس کو علی الاعلان کہو، خواہ اس کے لئے قید و بند کی سزا بھگتنی پڑے۔ اگر کوئی حکم شہری آزادی میں مداخلت کرے تو اس کو نہ مانو۔ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے انگریزی سامانوں کے مقاطعہ کا مشورہ دیا۔ اور دیسی چیزوں کے استعمال کی ہدایت کی یہاں تک کہ دستکاری پر زور دیا۔ اپنے ہاتھوں سے موٹا کپڑا تیار کر کے اس کو پہننے کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ان معتدلین نے کانگریس کو چھوڑ دیا۔ تلک اور گوکھلے وغیرہ تو موجود نہیں رہے تھے۔ ان کے متبعین سر سپرو اور جناح وغیرہ نے یہ کہہ کر کانگریس کو چھوڑا دیا کہ وہ قانون شکنی کے حامی نہیں ہیں۔

اب گاندھی جی کا کانگریس پر قبضہ تھا۔ مطالبوں کو منظور کرانے کے لئے مظاہرے ہونے لگے، دفعہ ایک سو چوالیس اور کرفیو آرڈر کو توڑا گیا۔ لوگ خوشی سے قید خانوں کو لبیک کہنے لگے۔ انگریزی کپڑوں کو برسرِ عام جلایا گیا۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ کیا گیا، جا بجا آزاد اسکول اور کالج کھولے گئے۔

گاندھی جی معتدلین کے مقابلہ میں تو انتہا پسند تھے لیکن ایک جماعت ہندوستان میں اور کام کر رہی تھی جو تشدد اختیار کرنے کی حامی تھی اور انگریزوں کا مکمل اخراج اس کا مقصد تھا۔ گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء سے پہلے مکمل آزادی کی حمایت نہیں کی تھی۔ حسرت موہانی نے کانگریس میں مکمل آزادی کی تجویز پیش کی، تو اس کو رد کر دیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے ہم نوا اس کے مخالف تھے۔ اس لئے ان تشدد پسندوں کے مقابلہ میں گاندھی جی معتدل گروہ میں شمار ہو سکتے تھے، لیکن یہ لفظ ان کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ گویا ملک کی سیاست میں چار طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو حکومت کے بالکل ہاں میں ہاں ملانے والے تھے دوسرے وہ جو قانون کے دائرے میں رہ کر مطالبات پیش کرنے کے حامی تھے۔ تیسرے وہ جو تشدد سے بچتے ہوئے حکومت کے غلط احکامات کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ اس کے لئے قید و بند کی سزائیں بھگت لیتے تھے، اور پولیس کی لاٹھیاں کھا لیتے تھے، لیکن تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیتے تھے۔ چوتھے وہ لوگ تھے جو تشدد کا جواب تشدد سے دیتے تھے۔ گاندھی جی تیسرے لوگوں میں تھے جو ستیہ گرہ یا عدم تشدد کی جنگ کی دعوت دیتے تھے۔ اور انگریزوں سے اپنے مطالبات کی صحت کے بارے میں بحث و استدلال کی راہ بھی اختیار کرتے تھے۔ پہلا اور دوسرا گروہ تو کانگریس سے بالکل علیحدہ ہو چکا تھا۔ چوتھا گروہ اگر کچھ کانگریس میں تھا تو کانگریس کے عدم تشدد کے طریقہ کو مصلحتاً قبول کرکے تھا، ورنہ اس کا نظام کانگریس سے علیحدہ تھا اور وہ خفیہ نظام تھا۔

اوپر لکھ چکا ہوں کہ گاندھی جی نے مسلمانوں کی مدد سے کانگریس پر قبضہ کیا تھا۔ مسلمانوں میں ترکی کی خلافت کے سلسلہ میں بے چینی تھی۔ انگریز، فرانسی، اطالوی اور زار روس وغیرہ جنہیں اتحاد کی طاقتوں کا نام دیا جاتا تھا۔ ترکی کے مقبوضات پر قبضہ کرکے آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ امریکہ نے انگریزوں کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ فلسطین یہودیوں کو دے دیا جائے اور اس شرط پر انگریزوں کو اس سے مدد ملی تھی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا، اس لئے وہ ان کے ساتھ ہو گئے، لیکن جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کا خاتمہ کر دیا تو ہندوستان میں بھی

دھیرے دھیرے یہ تحریک ختم ہوگئی اور مسلمانوں کو کانگریس سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی، لیکن اس وقت تک گاندھی جی کو ہندوؤں میں کافی آدمی مل چکے تھے۔ ملک میں ان کی مقبولیت بڑھ گئی تھی۔ ہر شخص ان سے متعارف ہوچکا تھا۔ ولایتی مال کے مقاطعہ کی تحریک نے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے دل میں ان کی حمایت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے کارخانوں کا مال ہندوستان کے بازاروں میں نکل سکتا تھا، ورنہ ان کا مال باہر کے مال کے مقابلہ میں بھدا ہوتا تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اخبارات سوائے اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا کے (جو انگریزوں کے تھے) انہی سرمایہ داروں کی ملک تھے۔ یہ اخبارات گاندھی جی کی ہم نوائی کرتے، انکی شہرت بڑھاتے اور انکی تحریک کو مقبول بنانے کیلئے یہ سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کی تحریک جس قدر زور پکڑے گی اتنا ہی غیر ملکی مال ملک میں کم نکلے گا۔ اور ہندوستانی کارخانوں کی پیداوار ملک میں مقبول ہوگی۔ ورنہ ان کی پیداوار غیر ملکی مالوں کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو زیادہ بھلا لگتا تھا خواہ وہ کسی درجہ کی آزادی ہو، کیونکہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار انہی کی طرف منتقل ہوگا۔

مسلمانوں میں جو انگریزی پڑھ لیتے تھے وہ سرکاری ملازمتوں کے خواہاں ہوتے تھے۔ اس لئے ان کا مفاد انگریزی پڑھے لکھے ہندوؤں سے ٹکراتا تھا۔ کانسلوں میں بھی یہی انگریزی داں جاتے تھے۔ تجارت میں مسلمان کم تھے لیکن جو تھے ان کی کش مکش بھی ہندو تاجروں سے تھی۔ غرض ہر جگہ تعلیم یافتہ ہندوؤں سے انگریزی داں مسلمانوں کا مفاد ٹکراتا تھا۔ چنانچہ جیسے جیسے عام ہندوؤں میں کانگریس کی مقبولیت بڑھتی گئی، ویسے ویسے مسلمان کانگریس سے پیچھے ہٹتے گئے۔

عام مسلمان دنیاوی معاملات میں انگریزی داں مسلمانوں کے زیر اثر تھے۔ انگریزی تعلیم اونچے طبقہ ہی میں تھی۔ نچلا طبقہ کوئی شعور نہیں رکھتا تھا اور وہ رجواڑوں، تعلقہ داروں اور زمینداروں سے دبا ہوا تھا۔ ملازمت کے لئے شرافت وجہ ترجیح ہوتی تھی اس لئے اونچے طبقہ کے بچے یعنی تعلقہ داروں اور زمینداروں کے بچے انگریزی پڑھتے تھے اور ملازمتوں میں اور کانسلوں میں آتے تھے۔ یا وکالت کرتے تھے یا یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ ہندوؤں میں دو طرح کا تعلیمی نظام نہیں تھا جو پڑھتے تھے انگریزی پڑھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں دو تعلیمی نظام

تھا۔ ایک حکومت کی منظور شدہ انگریزی تعلیم، دوسرے زکوٰۃ وصدقات اور مسلمانوں کے چندے کے ذریعہ مذہبی تعلیم۔ یہ دوسرا نظام مسلمانوں نے دین کی محبت اور اس کی حفاظت کے جذبہ سے پھیلا دیا تھا اس نظام سے جو فارغ ہوتے تھے ان کو مولوی کہتے تھے۔ یہ لوگ عموماً اونچے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اور اس لئے بھی عربی پڑھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی ان کو سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ مسلمانوں کو دنیاوی معاملات میں ان مولویوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ وہ ان کو اس لائق سمجھتے تھے۔ خالص مذہبی معاملات کے سوا ان کی رائے قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔ مذہبی معاملہ کی اہمیت کم تھی اسے وہ دوسرا درجہ دیتے تھے۔ جو مولوی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے ان کی رائے کی اشاعت اخبارات میں پوری طرح نہیں ہوتی تھی۔ عام مسلمان سمجھتے تھے کہ وہ غلطی کرتے ہیں ان کو سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اخبار والے بھی جن کا تعلق زیادہ تر سرمایہ دار ہندوؤں سے تھا مولویوں سے نفرت کرتے تھے۔ انگریزی داں مسلمانوں کو وہ اپنے سے قریب سمجھتے تھے۔ ان پر الٹا اثر تھا ان کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دور رکھنے کے ذمہ دار یہ مولوی تھے۔

مولویوں کا مفاد حکومت سے وابستہ نہ تھا ملازمتوں میں عموماً ان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور وہ مذہبی غیرت کی بنا پر انگریزوں کو ناپسند بھی کرتے تھے یا یوں کہئے کہ انگریزی داں مسلمانوں کی غیرت انگریزوں سے جلب منفعت کی بنا پر مردہ ہوگئی تھی الا ماشاءاللہ۔ لیکن مولویوں کی غیرت عمومی طور پر متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کانگریس جیسے جیسے مخالف برطانیہ ہوتی گئی ویسے ویسے ان کا جھکاؤ کانگریس کی طرف بڑھتا گیا۔ اور وہ عام مسلمانوں کی پرواہ کئے بغیر کانگریس کی حمایت کرنے لگے۔ ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ انگریز ہندوستان سے نکالے گئے تو عالم اسلامی پر ان کی گرفت کمزور ہو جائے گی اور وہ مسلمان ممالک کو جو ان کے قبضہ میں ہیں تدریجی طور پر چھوڑتے جائیں گے۔ وہ اس کے حامی بھی نہیں تھے کہ نفرت کا جواب نفرت سے دیا جائے اور ہندو مسلم کشیدگی بڑھائی جائے اس کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن سب مولویوں کا یہ حال نہیں تھا۔ کچھ ان عام مسلمانوں کو اہمیت دیتے تھے جن کی وفاداری تعلقہ داروں اور زمینداروں سے وابستہ تھی۔ اس لئے وہ کانگریس نواز مولویوں کی مخالفت کرتے تھے۔ اس طرح مولویوں کی دو جماعتیں ہوگئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک مسلک کے مولوی دوسرے مسلک کے مولویوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس

وجہ سے بھی وہ دوسروں کے مقابلہ میں کمزور پڑتے تھے۔ گرچہ اختلاف کچھ مولویوں کے لئے مخصوص نہیں۔ ہر قوم ہر مذہب اور ہر گروہ میں اختلاف موجود ہے۔ عیسائیوں کا اختلاف باہم جتنا شدید ہے، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ تو تازہ ہے۔ جس میں عیسائی حکومتوں نے باہم لڑ کر چھ کروڑ انسانوں کا خون بہایا اور عیسائیوں کے اس اختلاف پر قرآن کی یہ آیت بھی شاہد ہے۔ " واغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الیٰ یوم القیامۃ " (ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے بغض وعداوت پیدا کر دی) (مائدہ) لیکن علماء اسلام کا باہم اختلاف ان کے لئے اس لئے زیادہ مضر ثابت ہوا کہ ان کے پاس وسائل کی بہت کمی تھی۔ عام مسلمان بھی پاس کے ہاتھوں میں نہ تھے اور حکومت اپنے ان تمام وسائل پر پہرے بٹھائے ہوئی تھی جن سے علماء کو کوئی مدد مل سکتی تھی۔ ہاں اپنی مخالفت کو علماء میں کم کرنے کے لئے حکومت ملک میں دو چار عربی مدرسے چلا رہی تھی۔ وسائل کی کمی کا حال یہ تھا کہ جمعیۃ علماء کا اخبار "الجمعیۃ" مسلسل جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کو مالی دشواریاں پیش آتی رہتی تھیں۔ بہرحال صورت حال یہ ہوئی کہ کانگریس میں انگریزی داں مسلمان برائے نام رہ گئے، کیونکہ ان کا دل جائز اور ناجائز وجوہ کی بناء پر نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ عام مسلمان بھی ان کے اثر سے علیحدہ رہے۔ علماء کی تعداد کانگریس میں کافی تھی، لیکن ان کو عام مسلمانوں میں وہ مقام حاصل نہیں تھا جو انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حاصل تھا۔ یہ ہندوؤں سے اتنا ربط بھی نہیں رکھتے تھے کہ اثرات کی کمی دوسری طرف سے پوری ہوتی۔

۳۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کی تجویز منظور کی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کی رکنیت سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ اصل میں جواہر لال نہرو نے ان کو لکھا تھا کہ " آپ کی شخصیت کانگریس میں اس طرح چھا گئی ہے کہ آپ کی موجودگی میں کوئی اپنی رائے نہیں دیتا ہے۔ جو آپ بولتے ہیں وہی سب بولنے لگتے ہیں۔ اس سے خطرہ ہے کہ کانگریس کے اندر جمہوریت پروان نہیں چڑھے گی "۔ گاندھی جی نے یہ خط پا کر اعلان کیا کہ وہ کانگریس کے معمولی رکن بھی نہیں رہیں گے۔ ان کے حامیوں نے جب ان پر زور دیا کہ وہ کانگریس کو نہ چھوڑیں تو انھوں نے یقین دلایا کہ وہ کانگریس کو مشورے دیتے رہیں گے۔ اور بلائے جائیں گے تو کانگریس کے جلسوں میں شرکت بھی کریں گے، لیکن وہ اس کے کسی درجے کے ممبر نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہوا گاندھی جی کانگریس کے معمولی ممبر بھی نہیں رہے، لیکن ملک میں

ان کا جو اثر تھا اس کی وجہ سے کانگریس نے ان کو نہیں چھوڑا۔ اور وہ بدستور ملک کی اور کانگریس کی قیادت کرتے رہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل چیز عہدہ نہیں بلکہ انسان کی اپنی صلاحیتیں ہیں جن کے ذریعہ انسان دوسروں سے اپنا اعتراف کرالیتا ہے۔

۱۹۳۵ کا دستور ہند منظور شدہ برطانوی پارلیمنٹ نافذ ہوا اور کانگریس نے انتخابات میں حصہ لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی تو وہ حلقے بھی کانگریس میں شامل ہو گئے جو گاندھی جی کے طریقۂ کار سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، لیکن آزادی کے حامی تھے۔ جے پرکاش نے کانگریس کے اندر سوشلسٹ پارٹی بنائی کمیونسٹ بھی کانگریس میں آگئے۔ ایم ان رائے بھی جیل سے چھوٹ کر کانگریس میں پہنچ گئے، لیکن دوسری جنگ عظیم چھڑی تو ایم این رائے انگریزوں کی حمایت کرنے لگے۔ کیونکہ ان کے خیال میں انگریزوں سے زیادہ مفر ہٹلر کے تصورات تھے، جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو کمیونسٹ پارٹی بھی انگریزوں کے ساتھ ہو گئی، بہرحال تھوڑے عرصہ کے لئے ایسی صورت ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے حامی سوشلسٹ، کمیونسٹ، گاندھیائی، مذہبی مسلمان، مذہبی ہندو، ملحد و بے دین سب کانگریس کو متحدہ محاذ بنا کر جمع ہو گئے، صرف مسلم لیگ علیٰحدہ رہی کیونکہ اس میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو انگریزوں سے بہت قریب تھے۔ اور وہ انگریزوں کے جانے سے ڈرتے تھے کہ ہندوؤں کی حکومت ہو جائے گی جو زیادہ بری ہو گی۔

مسلم لیگ کے سوا سب انگریزوں کے مقابلہ میں ایک تھے لیکن ہندوستان کی آزاد حکومت کس طرح کی بنے گی اس میں ان کا اتفاق نہیں تھا۔ جواہر لال تھے جو سیکولر حکومت چاہتے تھے۔ ٹنڈن جی اور ان کے ہم خیال افراد تھے جو ہندو تہذیب کو غالب رکھنا چاہتے تھے، مسلمان تھے جن میں ایک گروہ اسلامیات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، دوسرا گروہ ایسی متحدہ قومیت کا حامی تھا، جس میں مذہب کا کوئی اثر نہ ہو۔ سوبھاس بوس کی صدارت میں کانگریس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کانگریس انگریز شہنشاہیت کے خلاف متحدہ محاذ ہے۔ آزادی کے بعد کانگریس توڑ دی جائے گی اور خیالات کی بنیاد پر پارٹیاں بنیں گی۔ لیکن آزادی کے بعد اس سابقہ تجویز کو اور گاندھی جی کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے جواہر لال نے کانگریس کو برقرار رکھا جو اس وقت ان کے زیر اثر تھی اور ملک میں بہت منظم تھی نئی پارٹی بنانے میں اور اس کو منظم اور متعارف کرنے میں اور طاقت ور بنانے میں کافی محنت

درکار تھی۔ اس لئے اس اعلان پر جو سبھاس چندر بوس کی صدارت میں کانگریس نے کیا تھا عمل نہیں کیا گیا۔

مسٹر جناح لندن سے برٹش پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے الیکشن لڑے اور ناکام ہو گئے۔ وہاں سے انگریزوں کے خلاف غم و غصہ لے کر ہندوستان آئے۔ اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی جو پہلے آغاخاں کے ہاتھ میں تھی وہ مرکزی اسمبلی میں حکومت کے خلاف کانگریس کا ساتھ دینے لگے۔ انتخابات شروع ہوئے تو جمعیۃ علمار کے ایک گروہ نے یوپی میں ان کا ساتھ دیا کیونکہ مسلم لیگ نے بھی انگریزوں کی حکومت کی مخالفت کی تھی۔ جمعیۃ علمار کا خیال تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی متحدہ وزارت بنے گی لیکن کانگریس اتنی بڑی اکثریت سے آگئی کہ اس کو مسلم لیگ کی ضرورت نہیں رہی۔ جواہر لال نے رفیع احمد قدوائی کے مشورے سے یہ طے کیا کہ کانگریس تنہا وزارت بنائے گی۔ مسٹر جناح نے جو مسلم لیگ کے لیڈر رہتے گاندھی جی سے رابطہ قائم کیا لیکن چونکہ گاندھی جی کو کانگریس کا عندیہ معلوم ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ٹال دیا۔ اب مسٹر جناح کا غصہ کانگریس کی طرف منتقل ہو گیا۔ مسٹر جناح کی نفسیات منفی تھیں۔ پہلے انتقامی نفسیات کے ساتھ وہ لندن سے ہندوستان آئے اور انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔ ہندوستان میں کانگریس نے تنہا وزارت بنانے کا اعلان کیا تو انھوں نے کانگریس کو انتقامی نفسیات کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے کانگریس کے خلاف مہم چلادی۔ تمام تعلقہ دار، زمیں دار، مسلمان سرکاری ملازم اور مسلمان وکلار نے مل کر جناح کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ پاکستان کا مطالبہ کھڑا ہو گیا۔ اور انتہائی کشیدگی کے عالم میں پاکستان بن گیا اور ملک میں کشت وخون شروع ہو گیا۔ جواہر لال نے ماونٹ بیٹن سے حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور پھر ان کو عارضی طور پر واپس کی تاکہ وہ کشت وخون کو بند کرائیں۔ جب کچھ حالات سدھرے تو پھر جواہر لال نے وزیر اعظم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ماونٹ بیٹن نے اس شرط پر کچھ عرصہ کے لئے ذمہ داری لی تھی کہ جو کچھ وہ کریں گے جواہر لال اور سردار پٹیل اس کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ حکومت ہند نے جن کی قیادت جواہر لال کے ہاتھوں میں تھی پاکستان کو وہ رقم دینے سے انکار کیا جو اس کو تصفیہ کی رو سے ملنا چاہیئے تھی۔ گاندھی جی کو معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئے انھوں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کو اس کا حق دے دیا جائے۔ انھوں نے اس کے لئے مرن برت رکھ لیا۔ جواہر لال نے سمجھایا کہ یہ کاروائی عارضی اور پاکستان کو جنگ سے روکنے کے لئے

ایسا کیا گیا ہے لیکن جب گاندھی جی نہ مانے تو پاکستان کو اس کی رقم دے دی گئی۔ گاندھی جی نے سیاسی تقاضوں کو نظر انداز کر کے اخلاقی قدروں کو اہمیت دینے کی روایت قائم کی لیکن ملک میں گاندھی جی کے جانشین اس اعلیٰ روایت کو باقی نہ رکھ سکے اور اخلاقی اصولوں کے مقابلہ میں سیاسی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

گاندھی جی نے فسادات کے خلاف بھی برت رکھا کیونکہ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ پولیس، فوج، عدالت سب پر مسلم دشمن ہونے کے الزامات تھے۔ کانگریس بھی کچھ نہیں کر رہی تھی اس کے لوگ بہ استثنائے چند کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے، مسلم لیگ بھی کچھ نہیں کر رہی تھی صرف گاندھی جی کے آشرمی سوشلسٹ پارٹی کے افراد جامعہ ملیہ کے طلبہ و اساتذہ اور جمعیۃ علماء کے کارکن آگ بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کے برت سے فسادات دبے، امن کی فضا پیدا ہوئی لیکن آر آر ایس کا ایک کارکن آگے بڑھا اور اس نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

آر ایس ایس پر پہلے ہی یہ الزام تھا کہ وہ ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کرانے کا عزم رکھتی ہے۔ ہندوستان کی عارضی وزارت نے یہ طے کیا تھا کہ اس جماعت کو خلاف قانون قرار دیا جائے لیکن ماونٹ بیٹن نے اس پر عمل نہیں ہونے دیا تھا۔

گاندھی جی کے قتل کے بعد دو واقعات ہوئے، ایک یہ کہ سردار پٹیل نے آر ایس ایس کو خلاف قانون قرار دیا اور اس کے لیڈروں کو گرفتار کیا گیا لیکن صرف کچھ عرصہ کے لئے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ سوشلسٹ پارٹی کانگریس سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کے بعد سے کانگریس اب تک نہرو خاندان کے زیر اثر ہے۔ حکومت کے ذمہ داروں میں ایسے کانگریسی تھے جو فسادات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن سرکاری ملازموں کے تبادلہ نے ان کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ تبادلہ سے پہلے فوج میں، پولیس میں مرکزی سکریٹریٹ میں، ریلوے میں، ڈاک خانے کے محکمہ میں یا تو مسلمان اکثریت میں تھے یا قریب قریب برابر تعداد میں تھے۔ ایسی حالت میں کہ ہندوستان اور پاکستان فرقہ وارانہ نفرت کی آگ میں جل رہا تھا، مسلمان ملازموں کے چلے جانے سے ان محکموں میں صرف ہندو رہ گئے تھے، اور وہ آسانی سے آر ایس ایس والوں کی اشتعال انگیزی سے متاثر ہو جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد فوج میں اور ریاستوں کی پولیس میں بھرتی فرقہ وارانہ

بنیادوں پر ہوتی کہ اس لئے ان میں مسلمان بہت کم ہیں یا نہیں ہیں اور جب مسلمانوں پر حملے ہوتے ہیں تو ان کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کانگریس میں سمجھدار اب بھی موجود ہیں ان کو اس صورت حال پر غور کرنا چاہیئے۔ سب فرقہ کے لوگوں کو فوج اور پولیس میں ہونا ضروری ہے تاکہ ایک فرقہ کی زیادتی سے دوسرے فرقہ کو روکا جاسکے۔ میری سمجھ میں یہ منطق نہیں آئی کہ غیر فرقہ وارانہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہندو بھرتی ہوں اور صرف ان کو ملک کی خدمت کا موقع دیا جائے اگر مسلمانوں کو بھی ملک کی خدمت کا موقع دیا گیا تو یہ فرقہ پرستی ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے کئی سو برس تک ملک کی خدمت کی ہے اور وہ اس خدمت کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہماری فوج اور پولیس کمیونل ہو یا ملٹی کمیونل ہو۔ کہا جاتا ہے پاکستان جناح صاحب کے مطالبہ پر بنا۔ لیکن محض مطالبہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جناح صاحب قانون شکنی کے خلاف تھے، ایسی ہر تحریک کے خلاف تھے جس میں جیل جانا پڑے یا پھانسی پڑے یا جائدادیں ضبط کرانی پڑیں۔ ایسے حالات میں ایک بار نہیں سو بار بھی مطالبہ کیا جاتا تو اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ تو کانگریس کی تحریک تھی جیل جانے کی۔ پھانسی پڑنے کی۔ انگریزی حکومت کا مقاطعہ کرنے کی۔ یہ کانگریس کا نعرہ تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے برصغیر ہندوستان کو چھوڑا اور چلتے چلتے کانگریس کو راضی کر کے اس کا ایک حصہ پاکستان کے نام سے جناح صاحب کے حوالہ کر دیا۔

پاکستان وجود میں آچکا، اور اس کے لئے مسلمانوں کو خون کے دریا سے گزرنا پڑا۔ پاکستان اپنے وجود کو بھی پورے طریقہ پر باقی نہ رکھ سکا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک حصہ بنگلہ دیش بن گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو مسلم منافرت کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اسی لئے اس ماحول میں تہذیبی وجود کی حفاظت کے مسئلے نے مسلمانوں کی ساری توجہ مرکوز کر لی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے تعارف اور دعوت کا مسئلہ جو مسلمانوں کا فرض منصبی ہے، معتدل ماحول چاہتا ہے۔ یہ ماحول اب تک پیدا نہیں ہو سکا ہے۔

ممتاز علمائے دین

اور

قائدین

مولانا ابوالکلام آزاد

غالباً جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی ابتدائی زندگی میں دورحاضر کی تین انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا موقع ملا تھا جن سے ان کو اپنی راہ متعین کرنے میں مدد ملی۔

پہلی تحریک جمال الدین افغانی کی تھی۔ ان کے کچھ ایرانی متاثرین حبل المتین کے نام سے ایک رسالہ کلکتہ سے نکالتے تھے۔ مولانا کا فارسی ذوق بہت گہرا تھا۔ اسی ذوق نے ان کو ایرانیوں سے قریب کیا اور ان کو جمال الدین افغانی کی تحریک کو سمجھنے کا موقع ملا۔

دوسری انقلابی تحریک سید احمد بریلویؒ کی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی جماعت کے امیر مولانا ولایت علی صادق پوری ہوئے تھے۔ انھوں نے اور ان کے خاندان والوں نے اس راہ میں کافی قربانیاں دی تھیں۔ حکومت کی داروگیر کی وجہ سے یہ تحریک سیاسی کم رہ گئی تھی اور اصلاحی زیادہ ہوگئی تھی بہرحال اس تحریک کا ایک مرکز صادق پور پٹنہ تھا۔ مولانا آزاد کے ایک استاذ شوق نیموی پٹنوی تھے۔ ان کی ہی وجہ سے وہ پٹنہ کے لوگوں سے متعارف ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ صادق پور والوں سے ملنا جلنا ہوا اور آخر میں ان سے اتنے قریب ہوئے کہ ان کا معاملہ بالکل گھر والوں کی طرح کا ہوگیا تھا۔ مولانا آزاد کے والد اہل حدیث حضرات کے سخت خلاف تھے۔ لیکن مولانا کے خیالات میں بڑا اعتدال تھا۔ اور غالباً یہ اعتدال صادق پور والوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

تیسری انقلابی تحریک بنگالی ہندوؤں کی تھی۔ ابتدا میں بنگالی انگریزوں سے بہت قریب ہوئے یا انگریزوں نے ان کو اپنے سے قریب کیا تاکہ مسلمانوں کو نیچا دکھائیں جن کو یہ انگریز اپنا مخالف سمجھتے تھے لیکن جب بنگال تقسیم ہوا تو اس کی مخالفت بنگالی ہندوؤں کی طرف سے شدت کے ساتھ ہوئی۔

بنگال کے بڑے بڑے ہندو زمیں دار مغربی بنگال کے تھے۔ لیکن ان کی زمیں داریاں زیادہ تر مشرقی بنگال میں تھیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ بندوبست دوامی کے ذریعہ انگریزوں نے یہ نظم کیا تھا تاکہ مسلمانوں کی بغاوت ہندوؤں کے ذریعہ روکی جاسکے۔ لیکن جب مسلمانوں کی بغاوت کا خطرہ نہیں رہا تو انتظامی سہولت کے پیش نظر مغربی بنگال کو بہار کے ساتھ ملاکر علیٰحدہ صوبہ کردیا گیا اور مشرقی بنگال

کو علیحدہ ۔ ممکن ہے اس تقسیم میں کسی سرکاری مسلمان کا مشورہ بھی رہا ہو لیکن اس سے ہندو بنگالی سخت ناراض ہوئے اور انھوں نے آئینی مخالفت سے آگے بڑھ کر سازشوں اور دہشت انگیزیوں کا راستہ اختیار کیا اور پھر ان کی مخالفت تقسیم بنگال تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ انھوں نے یورپ کے انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور آزادی وطن کی تحریک چلادی ۔ انگریزی حکومت نے تقسیم بنگالہ کو تو منسوخ کر دیا، لیکن بنگالیوں کی طرف سے انگریزوں کی مخالفت بند نہیں ہوئی، بلکہ زور پکڑتی گئی ۔ مولانا آزاد کلکتہ میں رہ کر اس تحریک سے ناواقف نہیں رہ سکتے تھے ۔

غرض ان ہی تحریکات نے مولانا آزاد کو آمادہ کیا کہ وہ مسلمان نوجوانوں سے ربط پیدا کرکے کوئی انقلابی اقدام کریں ۔ ان کی خواہش ہوئی کہ مسلمانوں کی انقلابی جماعت بنائیں اور انگریزوں کو نکال کر کم از کم عالم اسلامی پر سے ان کا تسلط ختم کریں ۔ اور ملک میں مسلمانوں کو اہم مقام دلائیں ۔ یہ جنگ بلقان کا زمانہ تھا اور مولانا اسی غرض سے مسلمان نوجوانوں سے مل رہے تھے جن نوجوانوں سے اس زمانہ میں مولانا ملے ان میں ایک گیا کے ڈاکٹر قمر الدین تھے ۔ یہ کلکتہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے ان کے ذریعہ گیا کے ایک نوجوان رئیس قاضی احمد حسین صاحب سے مولانا کی ملاقات ہوئی ۔ یہ ہندو بنگالیوں کی دہشت پسند تحریک میں عملاً شریک تھے ۔ انھوں نے مولانا کو "الہلال" نکالنے میں بڑی مدد دی ۔ بعد میں قاضی احمد حسین مرحوم گیا میں خلافت تحریک کے روح رواں ہو گئے تھے اور مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کے معتمد لوگوں میں شمار ہوتے تھے ۔ قاضی احمد حسین صاحب کی دعوت پر مولانا آزاد گیا تشریف لائے تھے، اور قیام شاہ مصطفیٰ احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہوا تھا ۔ دونوں میرے عزیز قریب تھے اس لئے مجھ کو گیا میں مولانا کی زیارت کا موقع ملا تھا ۔ لیکن میں بہت کم سن تھا اس لئے اس وقت کی کوئی بات یاد نہیں ہے ۔ میرے ایک اور بزرگ مولانا کے الہلال کے انتظامی شعبہ میں تھے ۔ مولانا ان پر اعتماد کرتے تھے ۔ کوئی خفیہ پیغام بھیجنا ہوتا تو انھیں کے واسطے سے بھیجتے تھے ۔ مولانا آزاد کے بارے میں ابتداءً میں ان ہی حضرات سے باتیں سنتا رہا ۔ والد مرحوم تصوف سے گہرا ذوق رکھنے کی وجہ سے سیاسیات میں کوئی عملی حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن سیاسی خیالات ان کے وہی تھے جو مولانا آزاد اور جمعیۃ علماء والوں کے تھے اس کا بھی میرے ذہن پر اثر تھا ۔ خلافت تحریک کے زمانہ میں ایک سلی ہوئی پگڑی ملتی تھی جو اس طرح کی تھی جیسی مولانا آزاد باندھا کرتے تھے ۔ پیچھے عمامہ کے شملہ پر ابو الکلام آزاد لکھا ہوا تھا ۔ والد

مجھ کو وہ پگڑی پہنائی گئی جس کو میں بڑے شوق سے پہنتا تھا۔ جب میں اردو اچھی طرح پڑھنے لگا تو میں نے والد صاحب کی لائبریری سے الہلال کی فائلیں نکال کر پڑھیں۔ الہلال کی پر جوش تحریروں کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ لیکن میں نے مولانا کو اچھی طرح اس وقت دیکھا جب وہ اہل حدیث کانفرنس کلکتہ کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۲۴ یا ۱۹۲۵ کا زمانہ تھا۔ اس وقت مجھ میں سیاسی اور مذہبی مسائل کو سمجھنے کی پوری صلاحیت تھی۔ مولانا کی خطابت اور سحر آفریں زبان سے میں بھی مسحور ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میرا مستقل قیام کلکتہ میں رہنے لگا۔ مولانا کی جہاں بھی تقریر ہوتی تو میں کوشش کرتا کہ اس میں ضرور شرکت کروں۔ ایک زمانہ میں مولانا بالی گنج مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے لگے تھے۔ میں ان کا خطبہ سننے کی غرض سے وہاں ضرور جاتا تھا۔ مشاہیر میں جن لوگوں کو وہاں پاتا ان میں سر ناظم الدین بھی ہوتے تھے۔ مولانا کے دو خطبے مجھے یاد ہیں۔

کلکتہ میں کسی زمانے میں محمڈن اسپورٹنگ کا زور تھا۔ مسلمانوں نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے کھیل کے مسئلہ کو اسلام کا مسئلہ سمجھ لیا تھا۔ جب محمڈن اسپورٹنگ کو شکست ہوتی تو بہت سے حضرات اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ہر جگہ حسرت و غم کا اظہار کیا جاتا اگر محمڈن اسپورٹنگ کو کامیابی ہوتی تو فرط خوشی میں مسلمان نہایت نازیبا ناشائستہ اور حیا سوز حرکتیں کرتے جن کو دیکھ کر بعض مذہبی مسلمان دل گیر اور مغموم ہوتے تھے۔ مولانا آزاد نے ایک جمعہ میں اسی پر خطبہ دیا اور بتایا کہ کھیل کھیل ہے۔ ورزش کے نقطۂ نظر سے قابل تعریف بھی ہے، لیکن اس کو مذہبی مسئلہ بنا لینا اور کامیابی پر ناشائستہ حرکتیں کرنا اسلام کی توہین ہے۔

دوسری تقریر جو مجھے یاد ہے وہ محرم پر تھی۔ مولانا نے محرم کی بدعات و خرافات کو جو ہندوستان میں رائج ہیں بتایا تھا اور کہا تھا کہ ان میں اکثر ایسی بدعات ہیں جو خود ایران میں نہیں ہوتیں اور جن کے خود ایرانی علماء خلاف ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ان کی بعض ایرانی علماء سے گفتگو ہوئی اور ان بدعات کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ وہ جہالت کی وجہ سے ہیں۔ مسلمانوں نے دین سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے نہ جانے کتنے مسئلوں کو دین کا مسئلہ سمجھ رکھا ہے۔

۳۷-۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔ میں بنگا باسی کالج کا طالب علم تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ مسلمان انقلابیوں کی ایک جماعت بناؤں۔ کالج میں داخلہ سے پہلے ہی میں کلکتہ کے مسلم طلبہ میں متعارف ہو گیا تھا۔ ان سے

سے سیاسی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب یہ جماعت بنی اور سی۔آئی۔ڈی والوں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان مسلم طلبہ سے پوچھ گچھ شروع کی جو ذرا کمزور واقع ہوئے تھے ان میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اس جماعت کے سکریٹری ظہیر مرحوم تھے۔ انھوں نے استعفار دے دیا۔ ظہیر مرحوم پڑھنے کے بعد شہید سہروردی کی جماعت میں شریک ہو گئے تھے اور پھر پاکستان میں کچھ عرصہ وزیر تعلیم بھی رہے تھے۔ میرے دوست معزالدین صاحب نے جو دہلی کے رہنے والے تھے اور کچھ ہی دن ہوئے کلکتہ آئے تھے، اسلامیہ کالج سے بی۔اے کر رہے تھے اور ہماری جماعت میں شریک ہو گئے تھے اور آج کل مسلم یونیورسٹی کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ کے ایڈیٹر ہیں، مشورہ دیا کہ مولانا آزاد کے پاس چل کر ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ ان کا مشورہ پسند آیا اور ہم سب ایک روز مولانا کے یہاں حاضر ہوئے۔ کافی طلبہ ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا سے پہلے سے کوئی وقت بھی نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے جب مولانا کو معلوم ہوا تو حیرت کے ساتھ نیچے کے کمرہ میں آئے، اور حیرت کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک پر نظر ڈالی، اس کے بعد مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ معزالدین صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ آپ کی شکل کچھ پہچانی ہوئی۔ ہے۔ معزالدین صاحب نے اپنے ایک عزیز کا نام لیا جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ مولانا سے مرید تھے۔ جواب سن کر مولانا نے کہا: آپ تو ہمارے عزیز ہیں۔

اس کے بعد اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ مولانا نے کہا کہ انقلاب وغیرہ کی گفتگو جب مسلمانوں اور خاص کر مسلمان نوجوانوں میں ہوتی ہے تو حکومت کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کے خیال میں مسلمانوں کا دائرہ ایسا ہے جہاں انقلاب کے جراثیم بہت کم ہیں۔ اس لئے اس دائرہ کو انقلاب سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ کم ہے اس لئے حکام کی معمولی دوڑ دھوپ سے وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایثار و قربانی کا جذبہ خدمت کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی خدمت کی جائے گی اس سے محبت ہوگی جس سے محبت ہوگی اس کے لئے ایثار کا جذبہ پیدا ہوگا اس لئے آپ حضرات خدمتی ادارے بنائیے اور پہلے عوام کی اور ملک کی غیر سیاسی خدمت کیجئے پھر انقلاب کی خواہش اور اس کے لئے قربانی کا جذبہ آپ سے آپ پیدا ہوگا۔

میں نے اپنی تنظیم کے تحت خدام خلق کے نام سے ایک شعبہ رکھا تھا جس کے تحت مسلم طلبہ کو لے کر میلی گندی بستیوں میں ہر ہفتہ ہم جاتے تھے اور علاقہ کی اپنے ہاتھوں سے صفائی کر کے لوگوں کو جمع کرتے

اور بتاتے کہ صفائی کی اور اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی کیا اہمیت ہے اور ہم کارپوریشن سے اپنے علاقہ کی صفائی کے سلسلہ میں کیا کام لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی طبی امداد (فرسٹ ایڈ) کا پروگرام بھی ہم نے رکھا تھا۔ مولانا نے سنا تو بہت پسند فرمایا اور کہا کہ بس یہی کام ابھی کیجیے۔ مولانا نے اپنے پاس سے ایک رقم بھی دی تاکہ ہم ضروری دفتری انتظامات کر لیں۔ انھوں نے ڈاکٹر بی سی رائے سے ہمارا تعارف کرایا اور سفارش کی کہ وہ کوئی ڈاکٹر مقرر کر دیں جو ہم سب کو فرسٹ ایڈ کی تعلیم دے۔ ڈاکٹر بی سی رائے نے یہ انتظام کر دیا اور ہر ہفتہ ہمارے دفتر میں ابتدائی طبی امداد کی تعلیم ہونے لگی۔ خدمت خلق اور جماعتی تنظیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اب ہم مولانا کے پاس اکثر جاتے اور اپنے کاموں کی رپورٹ دیتے اور ان کے مشورے سنتے۔ کبھی کبھی سیاسی مذہبی اور تاریخی باتیں پوچھتے اور مولانا بہت خندہ پیشانی سے ان کا مفصل جواب دیتے۔ مولانا سے استفادہ کرنے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ملتے رہے۔ ایک ہفتہ ہم کلکتہ کے "تارکل ڈنگلہ" کی طرف گئے تھے، وہاں مسلمانوں نے ہم کو کام کرنے سے روک دیا اور کہا کہ اس سے مسلمانوں کی ذلت ہوتی ہے۔ آپ لوگ کالج کے نوجوان ہیں، صاف ستھرے کپڑوں میں آتے ہیں اور جب یہ کام کرتے ہیں تو ہندو ہنستے ہیں۔ چونکہ روکنے والے شہید سہروردی مرحوم کے لوگ تھے اس لئے ہم نے انہی کے لوگوں سے رجوع کیا اور ان کو اپنا کام بتایا۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوا اس کے بعد شہید صاحب کے لوگوں نے کہیں بھی ہمارے کاموں میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ مولانا آزاد کو جب ہم نے یہ اطلاع دی تو انھوں نے کہا کہ جہاں لوگ روکیں وہاں کام نہ کیجیے، دوسری جگہ کام کیجیے۔ جس کے پاؤں میں درد ہوگا وہ اپنا پاؤں بڑھائے گا۔ خدمت ایسی چیز نہیں جو زبردستی کی جائے۔ خدمت کا میدان بہت وسیع ہے اس کے لئے ٹکرانے اور لڑنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہاں کام مت کیجیے یا یہ کام میں کروں گا تو آپ دوسری جگہ چلے جائیں یا دوسرا کام کریں۔

۱۹۴۵ء کے دستور کے مطابق انتخابات ہو رہے تھے مولانا کی مشغولیت بڑھتی جارہی تھی، اس لئے ایک روز قاضی معز الدین صاحب نے مولانا سے کہا کہ کوئی اور صاحب بھی ایسے ہیں کہ اگر آپ سے مشورہ لینے کا موقع نہ ملے تو ان سے مشورہ کر لیں؟ مولانا نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا نام لیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے حالات کے سلسلہ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ ایک روز ہم نے مولانا آزاد

سے دریافت کیا کہ کیا آپ انتخابی دورے پر جائیں گے۔ مولانا نے جواب دیا "اس قدر بے کار تو نہیں ہوں۔"

جواہر لال نے جب کانگریس میں "مسلم ماس کنٹیکٹ سب کمیٹی" قائم کی اور مسلمانوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ہندوستان گیر تحریک چلادی تو ہم اور ہمارے ساتھی اس کام میں لگ گئے۔ مولانا سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اور کہا کہ یہ مسلمان لیڈر شپ کو چیلنج کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی قیادت اچھے ہاتھوں میں نہیں ہے لیکن اگر ہم اس سے لڑائی میں الجھیں گے تو ہمارے سارے ضروری کام پس پشت پڑ جائیں گے پھر بھی جب کام شروع ہو گیا ہے تو میں روکتا نہیں ہوں آپ کام کریں۔ مولانا بہت اونچے انسان تھے اور اختلافات سے بلند ہو کر سوچنا اور کام کرنا جانتے تھے۔

میں نے ایک بار مولانا سے درخواست کی کہ 'مسلم انسٹی ٹیوٹ' میں میلاد کے موقع پر تقریر فرمائیں۔ مولانا نے پہلے تو یہ کہا کہ یہ میلاد کا موسم نہیں ہے عموماً میلاد کی مجلسیں ربیع الاول سے رجب تک ہوتی ہیں۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کا جلسہ شعبان میں ہونے والا تھا۔ بہرحال مولانا راضی ہو گئے اور اس موقع پر تاریخی تقریر کی جس میں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں رحمۃ للعالمین ہیں؟ یورپ، ایشیا، افریقہ میں مذہبی رہنماؤں کی طرف سے جو افراط و تفریط ہوتی رہی، ان کا ذکر کیا اور بتایا کہ اسلام نے ان کی کیا اصلاح کی اور یورپ میں غیر مسلموں کے اندر کیا مذہبی اور سیاسی اور سماجی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ "جدید دور کے فکر پر اسلام کے اثرات" ایک ایسا موضوع ہے جس پر مولانا کی معلومات وسیع تھیں۔

ایک بار ہم بیکر ہاسٹل (جو سرکاری ہاسٹل تھا) کے طلبہ کی خواہش پر مولانا کے پاس گئے کہ وہاں بھی سیرت پر تقریر فرمائیں۔ مولانا نے ہماری درخواست رد کر دی۔ اور کہا کہ وہ ایک سرکاری ہاسٹل ہے۔ ذمہ داروں نے شوق میں خواہش کی ہوگی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ پریشانی میں پڑ جائیں میرے ساتھ ہاسٹل کے جو طلبہ گئے تھے انھوں نے بہت کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ لیکن مولانا راضی نہیں ہوئے۔ مولانا کو مصلحتوں کا بھی لحاظ تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے کسی اقدام سے کسی کو معمولی نقصان پہنچے۔

ایک بار طلبہ نے عیدری یونین کی مجلس منعقد کی اور مولانا کو بھی مدعو کیا۔ مولانا بلا جھجک

تشریف لائے اور جب اس مجلس میں جناب رضا علی وحشت کلکتوی پہنچے تو ان سے بہت بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے اور قدیم اساتذہ شعراء کے اشعار بھی دہراتے رہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مولانا کے ابتدائی دور میں وحشت صاحب ان کے ہم جلیسوں اور دوستوں میں تھے۔

نواب نصیر حسین خیال نے فردوسی پر ایک مقالہ لکھا تھا ان کی خواہش تھی کہ کسی مجلس میں اس کو پڑھیں اور اس مجلس کی صدارت مولانا آزاد کریں۔ لیکن مولانا آزاد نے انکار کردیا تو آغا حشر بگڑے گئے۔ آغا حشر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ "ایک زمانہ تھا کہ میرا اور مولانا آزاد کا بہت ساتھ رہتا تھا، لیکن ان کی قسمت میں امام الہند بننا تھا، وہ امام الہند ہوگئے اور میری قسمت میں بھانڈ بننا تھا، میں بھانڈ بن گیا۔ آغا حشر کاشمیری اور مولانا آزاد بچپن کے دوست تھے۔ مولانا آزاد کا نصب العین دوسرا تھا اور آغا حشر کاشمیری کا الگ۔ نصب العین کے فرق نے دونوں کی راہیں بدل دیں۔ خان بہادر محمد جان کلکتہ کے بڑے تاجر تھے اور مختلف قسم کے ادارے ہائی اسکول اور اسپتال وغیرہ قائم کئے ہوئے تھے۔ مدارس دینیہ میں بھی دل کھول کر چندے دیتے تھے۔ ابتداءً مسلم لیگی تھے، جب مسٹر جناح کلکتہ آنے والے تھے تو ان کے استقبال کی تیاری پر انھوں نے کثیر رقم خرچ کی تھی۔ ہمارے ایک دوست کے مشورے سے وہ اس بات پر آمادہ ہوئے کہ مسٹر جناح آجائیں تو مولانا آزاد سے بالمشافہ گفتگو کا نظم کیا جائے شاید مسلمانوں میں اس طرح اتحاد کی کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ چنانچہ خان بہادر اولاً مولانا آزاد کے پاس گئے، مولانا آزاد نے کہا کہ "یہ تو آپ کا مجھ پر احسان ہوگا، آپ کو بتاؤں کہ اکثر راتیں اس طرح گزرتی ہیں کہ میں سوتا ہی نہیں ہوں۔ بس یہ سوچتا رہ جاتا ہوں کہ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا"، مولانا آزاد کے نزدیک مسلمانوں کا اتحاد قیمتی تھا۔ اس کے لئے وہ فکری اختلاف سے بلند ہو سکتے تھے، لیکن جب مسٹر جناح آئے اور خان بہادر نے ان سے مل کر اپنا مدعا بیان کیا تو مسٹر جناح بہت ناراض ہوئے کہ "انھوں نے مولانا آزاد سے کیوں بات کی"، انھوں نے مولانا سے ملنے سے انکار کردیا۔ خان بہادر جب مولانا کو اپنی ناکامی کی خبر دینے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ "مجھ کو یہ معلوم تھا کہ مسٹر جناح صاحب مجھ سے نہیں ملیں گے، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ آپ حضرات بھی تجربہ کرلیں" چنانچہ اس کے بعد سے مرتے دم تک خان بہادر مولانا آزاد کے مداح اور کانگریس کے ممبر رہے۔

خان بہادر نے مجلس ادب اردو کی بنیاد بھی رکھی تھی وہ اس کا ہفتہ وار جلسہ بھی کرتے تھے تین چار دفعہ مولانا آزاد بھی اس کے ہفتہ وار اجتماع میں آئے اور اردو ادب کی تاریخ پر تقریر کی۔ مولانا نے بتایا کہ یہی اردو ہے جسے کبھی ہندوی اور کبھی ریختی کہا گیا۔ مولانا نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمۂ قرآن کا ذکر کیا اور بتایا کہ انھوں نے اپنے ترجمہ اردو کے بارے میں لکھا ہے کہ چوں کہ ہندوستان کے لوگ عربی نہیں جانتے اس لئے ان کی آسانی کے لئے وہ قرآن کریم کا ہندوی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ مولانا کی یہ تقریریں بہت پسند کی گئیں اور ہمارے دوست سیف صدیقی رائے بریلوی مرحوم نے قلم بند کرکے اخبارات میں شائع بھی کرائیں اور شاید کتابی شکل میں بھی بمبئی سے شائع ہوئیں۔ مرحوم اردو شارٹ ہینڈ جانتے تھے لیکن جہاں جہاں فروگزاشت ہوئی تھی انھوں نے مجھ سے مدد لی تھی۔

جب مولانا عبیداللہ سندھیؒ جمعیۃ علماء بنگال کے اجلاس کی صدارت کے لئے کلکتہ تشریف لائے تو میں ان کے ساتھ ہر جگہ جاتا تھا چنانچہ مولانا آزاد کے یہاں بھی ان کو لے گیا۔ ڈاکٹر منظور احمد مرحوم سابق ایم ایل اے بہار اور طیب بھائی ظریف (جواب روزنامہ ہند کلکتہ کے مالک ہیں) بھی میرے ساتھ تھے۔ ان دنوں مولانا آزاد پاؤں کے ایک حادثہ کی وجہ سے جو الہ آباد میں پیش آیا تھا بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اوپر اپنے کمرے میں بلایا تو ڈاکٹر منظور نے کہا ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں بڑے آدمی آپس میں کیسے ملتے ہیں۔ ان کی اس خواہش پر میں نے کہا چلئے اور تینوں آدمی مولانا کے پیچھے ہو لئے، اور مولانا آزاد لیٹے لیٹے بغل گیر ہوئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے بیٹھتے ہی اپنے خیالات پیش کرنا شروع کر دیا۔ مولانا آزاد کچھ دیر تک ان کی باتیں خاموشی کے ساتھ سنتے رہے پھر بولے طیب بھائی! مجھ کو اور مولانا کو تنہا چھوڑ دیجئے" یہ سن کر ہم تینوں آدمی باہر آکے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مولانا سندھی کئی روز تک تنہا جاتے رہے۔

ایک بار خواجہ عبدالحیٔ صاحب استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کلکتہ تشریف لائے اور انھوں نے دفتر ہمدردان جامعہ میں قیام کیا جہاں میں رہتا تھا۔ خواجہ صاحب مولانا کے الہلال میں کام کر چکے تھے اور تفسیر میں مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد

تھے۔ ایک روز صبح ہونے سے پہلے انھوں نے مجھ کو اٹھایا اور کہا چلو مولانا آزاد کے یہاں چنانچہ ہم زکریا اسٹریٹ سے بالی گنج گئے جو کافی دور تھا، سویرا ہی تھا ہم مولانا کے یہاں پہنچے تو انھوں نے حسب معمول اوپر اپنے کمرہ میں بلا لیا اور اپنے ملازم عبداللہ کو پکار کر کہا کہ ہماری چائے لے آؤ۔ عبداللہ چائے لایا اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کیلے جن کو کلکتہ میں چنیا کیلا کہتے ہیں اور معمولی بسکٹ جن کو کلکتہ میں لڑوا بسکٹ کہتے ہیں۔ مولانا خود سے چائے بنا نا چاہ رہے تھے لیکن خواجہ صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ جب خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو شکر زیادہ دوں؟ تو مولانا نے مسکرا کر کہا کہ کیا آپ شکر زیادہ استعمال کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا نہ زیادہ نہ کم۔

اس کے بعد مولانا آزاد نے مولانا عبیداللہ سندھی کی خیریت دریافت کی جو ان دنوں جامعہ ملیہ میں مقیم تھے۔ اس کے بعد کہا کہ میرے علم میں دو آدمی ہیں جو عوام میں بہترین سیاسی اور سماجی کام کر سکتے ہیں ایک خان عبدالغفار خان اور دوسرے مولانا عبیداللہ سندھی لیکن مولانا نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے پروگرام میں داخل کیا ہے جن سے خطرہ ہے کہ ان کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ مولانا آزاد نے مثال کے طور پر جوتا پہن کر مسجد میں داخل ہونے اور نماز پڑھنے کی بات کہی۔ بولے مولانا عبیداللہ سندھی اپنے پروگرام میں شامل کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حضور کا فرمان ہے اور حدیث سے ثابت ہے لیکن اس سے لوگوں کو مخالفت کا موقع ملے گا۔ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مباحات کا دائرہ وسیع ہے، لیکن انسان کو اپنی ذہانت سے سمجھنا چاہئیے کہ کہاں کیا چیز قابل عمل ہے اور کس چیز پر عمل کرنے سے مقصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ایک مجلس میں مولانا سے امارت شرعیہ پر گفتگو آئی۔ مولانا نے کہا کہ بڑے اسلامی انقلابی نقطۂ نظر سے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کی تاسیس میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔ لیکن ایسے بڑے انقلابی کام کے لئے جس طرح کے امیر کی ضرورت تھی وہ نہ مل سکے۔ شاہ بدرالدین صاحبؒ بہت عمدہ آدمی تھے، لیکن ان کے ساتھ خانقاہ کی بہت سی پابندیاں تھیں۔ مولانا سجاد خود یہ بار گراں اپنے کندھوں پر اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ بس وہ نیابت کا

فریضہ ادا کرنا چاہتے تھے عظیم کاموں کے لئے عظیم صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے میری رائے تو اب یہ ہے کہ یہ کام معمولی کمیٹیوں اور جماعتوں کے ذریعہ لیا جائے اور کل ہند امارت کے قیام کی کوشش نہ کی جائے۔ مولانا نے کہا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں امارت بن گئی ہے اس کو توڑ دیا جائے بلکہ اس کو جہاں تک ممکن ہو چلانا چاہیئے۔ کل ہند امارت قائم ہوئی اور غلط آدمی امیر ہوئے تو اس سے خوفناک غلط نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ تاریخ ساز افراد تیار کرنے کا ہے جس کے بغیر ہر منصوبہ، ناکام ہو جائے گا۔

۳۶ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا انتقال ہوا تو کلکتہ میں میں نے قاضی معزالدین احمد صاحب اور برادرم محبوب اشرفی کی مدد سے جلسۂ تعزیت کا نظم کیا۔ مولانا آزاد نے صدارت فرمائی۔ اس جلسہ میں مولانا نے کہا کہ ڈاکٹر انصاری کے بارے میں کئی باتیں کہی جاسکتی ہیں اور وہ سب صحیح ہیں۔ وہ تحریک آزادی کے جرأت مند رہنما تھے، بڑے محب وطن تھے، کانگریس کا دماغ تھے، بڑے اچھے ڈاکٹر تھے، بہت مخیر تھے، لیکن ان کی جو خوبی سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ ان کی شرافت تھی، وہ بہت شریف اور مہذب آدمی تھے۔ اپنی ذات سے کبھی انھوں نے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔

ایک دن قاضی احمد حسین صاحب مرحوم ناظم امارت شرعیہ کے ساتھ مولانا سے ملا۔ قاضی صاحب ایک صاحب کی سفارش میں مولانا کے پاس گئے تھے۔ مولانا نے کہا مجھ سے زیادہ ڈاکٹر محمود صاحب کو ان کی فکر ہے۔ وہ انھیں کی خاطر پٹنہ میں اردو لائبریری قائم کر رہے ہیں لیکن ان کا یہ رویہ صحیح نہیں ہے کہ جو جگہ بھی معلوم ہو اس کے لئے امیدوار ہو جائیں۔ یہ غلطی ہے جس میں کثرت سے لوگ مبتلا ہیں۔ انسان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے اور میدان کار کا صحیح انتخاب کرنا چاہیئے۔ میں نے ایک مجلس میں مولانا سے پوچھا کہ جب جواہر لال کہتے ہیں کہ پاکستان کا نظریہ قابل عمل نہیں ہے، تو پاکستان کی مخالفت کر کے مسلمانوں کو مشتعل کیوں کیا جاتا ہے۔ کیوں نہیں یہ کیا جاتا کہ اگر قابل عمل ہے تو بنالو، ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں، انگریزوں سے مطالبہ کرو۔ مولانا نے جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ انگریز ملک چھوڑنے کو تیار ہیں یا نہیں۔ اگر تیار ہیں اور واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ جا رہے ہیں تو پاکستان سے بڑا بھی کوئی مطالبہ ہوگا تو قبول کر لیا جائے گا، لیکن ویسے ایک مطالبہ انگریزوں نے پیش کرا دیا اور اس کو قبول کیا گیا تو فوراً دوسرا مطالبہ سامنے آگیا اور جب اس کو قبول کیا گیا تو تیسرا مطالبہ سامنے آگیا، تو اس کے لئے

کانگریس تیار نہیں ہے۔ یہ تو ہندوستانیوں کو آپس میں لڑانے کی ایک چال ہے۔ مسلمان تو کشیدہ ہیں ہی ہندو بھی کشیدہ ہو جائیں گے کیونکہ کانگریس کا ہی کام ہے کہ مسلمان مطالبے کیا کریں اور وہ قبول کیا کرے، پھر ہندوؤں کی کوئی طاقت اور جماعت کانگریس کی جگہ لے لے گی۔ اور آزادی کے مسئلہ کو مؤخر کر کے فرقہ وارانہ جھگڑوں میں ملک کو اور زیادہ الجھا دے گی۔

جب سلطنت برطانیہ کے آخری دور میں آر ایس ایس کی تنظیم ہوئی تو مولانا کی اوپر کی باتیں مجھ کو اکثر یاد آئیں۔ زیادہ دینے کی بات یوں رہی کہ مولانا کی تحریک پر کانگریس نے کابینہ مشن کی تین زون کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے تین زون ہوں گے۔ ایک مغربی جو موجودہ پاکستان ہے مع مشرقی پنجاب (یعنی پنجاب کا دونوں حصہ) دوسرا مشرقی جس میں پورا بنگال (یعنی بنگال کے دونوں حصے، اور آسام اور تیسرا باقی ہندوستان۔ تینوں حصوں کا ایک برائے نام وفاق ہوگا۔ تجویز وہی مقبول ہوگی جس پر تینوں حصوں کا اتفاق ہوگا اور اگر کچھ عرصے کے بعد مغربی اور مشرقی حصے یہ سمجھیں گے کہ ساتھ نہیں چل سکتے تو ان کو علیحدہ ہونے کا اختیار ہوگا۔ گاندھی جی نے اس میں اتنی ترمیم چاہی تھی کہ آسام کو اختیار ہوگا کہ جس زون میں چاہے رہے، لیکن جب جناح صاحب نے یہ کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس مشن کی تجویز کو نہیں مانتی تو کانگریس نے پوری تجویز کو من وعن قبول کر لیا لیکن مسٹر جناح نے اس کو ایک چال سمجھ کر رد کر دیا یا انھوں نے یہ سمجھا کہ موجودہ پاکستان سے زیادہ لیں گے تو اس کو ہضم نہیں کر سکیں گے۔ انھوں نے راجگوپال اچاری کی اس تجویز کو قبول کر لیا جسکی مولانا آزاد اور گاندھی جی نے مخالفت کی تھی۔ کہ پنجاب اور بنگال کی ہندو آبادی کا حصہ نکال کر باقی مطلوبہ حصہ جناح صاحب کو دے دیا جائے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

مولانا آزاد نے ایک بیان میں کہا تھا کہ اگر برطانوی حکومت ہندوستان کی باگ ڈور کانگریس کے حوالہ نہیں کرتی ہے تو مسلم لیگ ہی کے حوالہ کر دے۔ گاندھی جی نے ماونٹ بیٹن سے کہا کہ ملک کو تقسیم مت کیجئے، بلکہ پورا ہندوستان جناح کے حوالہ کر دیجئے۔ معلوم ہوا کہ جواہر لال اس پر راضی نہ ہوئے۔

آزادی کے بعد مولانا نے لکھنؤ میں کل ہند مسلم کانفرنس طلب کی جو آزاد کانفرنس کے نام سے مشہور رہے۔ اس اجلاس میں مولانا نے کہا کہ "کابینہ مشن کا پلان دراصل میرا ہی پلان تھا، افسوس کہ

اس کو مسلم لیگ نے قبول نہیں کیا۔ اس کو قبول کر لیا جاتا تو نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یہ اظہار واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے۔ کسی کو مطعون کرنے کے لئے نہیں۔ مطعون کس کو کروں؟ اپنوں کو کروں؟ اس کے بعد مولانا نے کہا کہ میں نے لیاقت علی خاں صاحب سے کہا کہ آپ کا مقصد حاصل ہو گیا، اب ایک بات میری مان لیجئے۔ ہندوستان کے مسلمان ملازموں کو پاکستان نہ لے جایئں، لیکن لیاقت علی خاں یہ بھی نہیں مانے اور مسلمانوں کی حفاظت و مدافعت کا مسئلہ شدید ہو گیا۔

مولانا کی دعاؤں کے ساتھ ہمارے ایک دوست سید فہیم الدین احمد صاحب نے خان بہادر محمد جان سے قرض لے کر روزانہ اخبار نکالا تھا۔ مولانا ہی کی تجویز پر اس کا نام "استقلال" رکھا گیا شروع میں ایک صاحب کی رفاقت میں اور بعد میں تنہا میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ ایک روز فہیم صاحب میرے ساتھ مولانا کے یہاں گئے اور مولانا سے کہا کہ "اگر آپ اجازت دیں تو الہلال کے مضامین جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دوں" مولانا نے جواب دیا کہ "الہلال کے سب مضامین میرے نہیں ہیں" فہیم صاحب نے کہا کہ "الہلال کے ان مضامین پر نشان لگا دیں جو آپ کے ہیں" مولانا نے جواب دیا کہ اچھا ابھی تو آپ مقدمہ میں پھنسے ہوئے ہیں آپ کو اطمینان ہو جائے تو ملئے گا، لیکن اس کے بعد فہیم صاحب سے مولانا کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر یہ کام ہو جاتا تو وہ اختلاف نہ پیدا ہوتا جو بعد میں الہلال کے مضامین کے بارے میں پیدا ہوا۔

ایک ذی الحجہ کے موقع پر جس کے بعد مولانا نے کبھی کلکتہ کے میدان میں نماز نہیں پڑھائی مولانا نے خطبہ میں کہا کہ تاریخ کے دو واقعات نے ان کی زندگی پر بہت اثر ڈالا ہے "ایک گلیلیو کا واقعہ کہ جب اس نے انکشاف کیا کہ زمین سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے تو کلیسا کی عدالت نے اس کو سزائے موت دی۔ لیکن گلیلیو نے ابتداً توبہ کر لی اور اس کو معافی دی گئی۔ پھر اس نے سوچا یہ تو غلط ہے ایک صحیح واقعہ سے رجوع کرنا دنیا کو دھوکہ دینا ہے۔ اس نے ججوں کو روکا اور کہا تم نے مجھ سے تو توبہ کرا لی لیکن یہ زمین تو توبہ نہیں کرتی۔ یہ تو سورج کے گرد اسی طرح گھوم رہی ہے۔ دوسرا واقعہ امام احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ خلق قرآن کی حمایت میں فتویٰ دیں۔ انھوں نے فرمایا کہ جو قرآن نے نہیں کہا اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہا وہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اسلامی عقیدہ میں کسی بدعت کو داخل کرنے کی ذمہ داری کیونکر لے سکتا ہوں۔ چنانچہ ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ دوسرے علماء کے

کے سمجھانے پر بھی اس طرح کا فتویٰ دینے پر راضی نہ ہوئے۔

مولانا نے کہا "اپنی کھلی آنکھوں سے جو میں دیکھ رہا ہوں اور میری زندگی کی حقیقتوں نے مجھ کو جس نتیجہ تک پہنچایا ہے میں اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ میں اس پر اٹل ہوں، لوگوں کی مخالفت میرے نزدیک مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ نہیں" مولانا نے عزیمت کا درس تاریخ سے لیا تھا۔

اس خطبہ کے بعد مولانا کی امامت عیدین کے خلاف مسلم لیگ نے مہم چلائی۔ صوبہ سرحد کے باشندے جو کثیر تعداد میں کلکتہ میں مقیم تھے اور ایک دو کے سوا مولانا آزاد کے معتقد تھے۔ لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا آپ نماز پڑھائیں گے؟ مولانا نے جواب دیا کہ آپ نماز پڑھیں گے تو میں نماز پڑھاؤں گا۔" فوراً پشاوری تجار اور نیشنلسٹ مسلمان جمع ہوئے اور انھوں نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ مسلم لیگ کی اس مہم کا مقابلہ کیا جائے۔ میں اس تحریک میں باقاعدگی کے ساتھ شریک نہیں ہوا تھا کیونکہ مجھ کو نماز پڑھانے کی بات کوئی اہم نہیں معلوم ہو رہی تھی لیکن ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے مسلم لیگ کے خلاف محاذ پر آ گئے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ جلسوں میں چلا جاتا تھا۔ انھیں کے ساتھ مولانا کے یہاں بھی چلا جاتا تھا۔

ایک روز مولانا حکیم عبدالروف دانا پوری کے یہاں گیا۔ یہ بہار کے رہنے والے تھے۔ سیرت کی مشہور کتاب "اصح السیر" کے مصنف تھے، کافی ذی علم تھے اور کلکتہ مسلم لیگ کے صدر رہتے۔ اکابر جمعیۃ علماء کے خلوص اور علم کے معترف تھے، کہتے تھے کہ جمعیۃ علماء میں صحیح العلماء ہیں لیکن شہید سہروردی صاحب سے ان کے تعلقات تھے اور ان ہی کی وجہ سے وہ شروع سے مسلم لیگ میں رہے۔

میں نے مولانا عبدالروف صاحب سے پوچھا کہ آپ نے مولانا آزاد کی تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ جب آپ کی جماعت کی طرف سے مولانا پر یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ مولانا نے اس تفسیر میں برہمو سماج مذہب کی حمایت کی ہے تو آپ کو اس کا مطالعہ بھی کر لینا چاہئے تھا کیونکہ آپ مسلم لیگ کے ایک ذمہ دار رکن ہیں۔ انھوں نے مطالعہ کی خواہش کی تو میں نے ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں ان کو لے جا کر دیں اور اس کا وہ حصہ بھی دکھایا جس میں مولانا نے لکھا ہے کہ تمام انبیاء کو ماننا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے، کسی ایک نبی کا انکار تمام نبیوں سے انکار ہے۔ مولانا عبدالروف صاحب نے کہا "آپ نسخوں کو چھوڑ دیجئے، میں خود دیکھوں گا"، چنانچہ میں نے وہ نسخے چھوڑ دئیے کچھ

دنوں کے بعد میں ان کے پاس گیا اور پوچھا آپ نے مطالعہ کے بعد کیا رائے قائم کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ مولانا کی تحریر میں قابل اختلاف حصے ہیں لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کی امامت باطل ہو یا ان کو کافر کہا جائے۔ میں یہ سن کر چلا آیا۔ دوسرے روز ملاجان محمد ان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت کے خلاف فتویٰ دیجئے۔ انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مولانا آزاد سے ہمارا سیاسی اختلاف ہے، ہم سیاسی بنیاد پر ان کی مخالفت کریں گے، لیکن مذہبی بنیاد پر ان کی امامت کے باطل ہونے کا فتویٰ نہیں دیں گے۔ دوسرے روز ملاجان محمد کا یہ بیان اخبار میں نکلا کہ کانگریسی مسلمان مولانا عبدالروف صاحب سے مولانا آزاد کی حمایت میں فتویٰ لینے گئے تھے، لیکن مولانا عبدالروف صاحب نے انکار کر دیا اور کہا کہ مولانا آزاد کے پیچھے تو مفتی کفایت اللہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا عبدالرؤف صاحب اس جھوٹے اور غیر ذمہ دارانہ بیان کو پڑھ کر برہم بیٹھے تھے کہ میں ان کے پاس پہنچ گیا، ایک استفتا بھی ساتھ لے گیا تھا جس میں عرض کیا گیا تھا کہ "ملاجان محمد کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مولانا آزاد کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں سمجھتے، جو صورت واقعہ ہو وہ تحریر فرما دیں۔ مولانا عبدالرؤف صاحب نے لکھا کہ "میں مولانا آزاد کی امامت کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔ میری نسبت ملاجان محمد نے اخبار میں جو خبر دی ہے وہ جھوٹ ہے" مولانا عبدالروف کا یہ فتویٰ اخبار میں چھپا تو شہید سہروردی صاحب ان کے پاس گئے، اور ان سے کہا کہ آپ فتویٰ دے کر اس قابل ہو گئے ہیں کہ مولانا آزاد کے پاس جائیں اور ان سے اپیل کریں کہ وہ از خود امامت سے دست بردار ہو جائیں، کیونکہ اگر وہ دست بردار نہ ہوئے تو مسلمانوں میں باہم کشت و خون کا خطرہ ہے چنانچہ مولانا عبدالروف صاحب مولانا آزاد کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ وہ امامت نہ کریں کیونکہ دونوں طرف کافی جوش ہے۔ خطرہ ہے کہ مسلمان باہم لڑ پڑیں۔ مولانا نے کہا کہ "آپ حضرات نے امامت کو ایسی عزت کی چیز کہاں رہنے دی ہے کہ میں اس کے لئے جان دوں گا۔ مجھ کو اپنی امامت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن مجھ پر یہ بہتان باندھا گیا ہے کہ میں نے 'ترجمان القرآن' میں برہمو سماج مذہب کی وکالت کی ہے۔ اس الزام کو واپس لیا جائے میں امامت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ گرچہ خلافت کمیٹی کے وجود کے پہلے سے میں کلکتہ میدان میں عیدین کی امامت کرتا آیا ہوں" عیدین کی نماز کا کلکتہ میدان میں نظم کلکتہ خلافت کمیٹی کر رہی تھی جو مسلم لیگ کے ساتھ تھی اور جس کا جھنڈا ملاجان محمد

اٹھائے ہوئے تھے۔ اس سال بھی وہی اس کا نظم کرنے والی تھی۔ اسی لئے مولانا نے اس کا ذکر کیا۔
چنانچہ مولانا عبدالرؤف صاحب نے راغب احسن اور محمد عثمان صاحب سے جو مسلم لیگ کلکتہ کے سکریٹری تھے اور اخبارات و رسائل اور اشتہارات کے ذریعہ یہ الزام شائع کر رہے تھے تأسف اور معذرت کا اعلان لکھوایا اور مولانا آزاد نے لکھ دیا کہ میں عیدین کی امامت نہیں کروں گا۔ یہ خبر جب مولانا کے حامیوں میں پہنچی تو وہ مولانا آزاد کے یہاں گئے، وہ غصے میں تھے اور رو رہے تھے۔ اور پوری رات مولانا کی ان کو سمجھانے میں گزری، مولانا نے ان کی محبت کی تعریف کی جو خالصۃً لوجہ اللہ تھی اور کہا کہ عبادت کے معاملہ میں اختلاف اور لڑائی مناسب نہیں ہے۔ جس کے پیچھے سب مسلمان نماز پڑھیں، اس کے پیچھے آپ بھی نماز پڑھئے اور جہاں تک میرا معاملہ ہے میں نے ہاتھ کاٹ کر دے دیا ہے اس لئے میں تو کسی صورت میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔ جب مولانا کو بتایا گیا کہ ایک جگہ نماز پڑھنے میں لڑائی یقینی ہے، جذبات بہت مشتعل ہیں تو مولانا نے کہا کہ اس بار آپ حضرات علیحدہ نماز پڑھ لیں لیکن ذی الحجہ میں ساتھ نماز پڑھیں، علیحدہ نہ پڑھیں۔ چنانچہ ذی الحجہ کا موقع آیا تو مولانا نے اپیل کی کہ سب مسلمان ایک جگہ نماز پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا نے کبھی نماز نہیں پڑھائی۔ اس موقع پر یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ تاج محمد پشاوری کی طرف سے (جو ملا جان محمد کے دوست تھے اور ہندو پاک پہلی جنگ کے موقع پر ملا جان محمد کے ساتھ بلا وجہ گرفتار کئے گئے تھے۔ جنگ کے بعد رہا ہوئے تو مستقلاً پاکستان چلے گئے) ایک اشتہار شائع ہوا جس میں مولانا آزاد کے خلاف سوقیانہ حملے ہوئے۔ تاج محمد کو خود خیال ہوا کہ چند دن پہلے مولانا آزاد نے ان پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔ اس کا یہ جواب نہیں ہے۔ مولانا آزاد کیا خیال کریں گے چنانچہ وہ مولانا کے پاس معذرت کے لئے گئے اور کہا کہ "لوگوں نے میری اجازت کے بغیر میری طرف سے یہ اشتہار شائع کیا ہے۔ میرا کوئی تعلق اس اشتہار سے نہیں ہے اور نہ میں اس کو پسند کرتا ہوں" مولانا نے جواب دیا کہ "جب میں رانچی میں نظر بند تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ میں اپنے مخالفوں کی مخالفت کا برا نہیں مانوں گا خواہ وہ مخالفت کسی قدر اذیت سے بھری ہوئی ہو، اگر آپ لکھتے بھی تو میری طرف سے وہ معاف تھا اور یہ تو آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے لکھا ہی نہیں اس لئے شکایت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" مولانا بہت وسیع النظر انسان تھے لیکن مولانا جس قوم کے لیڈر تھے اس میں زوال آمادہ قوم کی تمام برائیاں

پیدا ہو چکی تھیں ۔

دوسرا واقعہ قابل ذکر یہ ہے کہ جب انگریزی دور کے آخری انتخابات ہو رہے تھے ۔ اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے جمعیۃ علماء کی کوشش سے مسلم لیگ کے مقابلہ میں مسلم نیشنلسٹ پارلیمنٹری بورڈ بنالیا تھا تو بہار صوبہ کے صدر قاضی احمد حسین صاحب بنائے گئے تھے۔ مجھ کو بھوپال سے تار دے کر پھلواری شریف بلایا گیا جہاں صوبہ بہار کے بورڈ کا دفتر تھا اور مجھ کو دفتر کا انچارج بنایا گیا۔ قاضی احمد حسین صاحب کو اصرار تھا کہ جو مسلمان بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑے نہیں ہوں گے ۔ کانگریس یا مومن کانفرنس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے ان کی حمایت بورڈ کی طرف سے اسی وقت ہوگی جبکہ وہ اس کا وعدہ کریں کہ مسلمان بچوں کی لازمی مذہبی تعلیم کی حمایت کریں گے۔ قیوم انصاری صاحب نے وعدہ کرلیا اور مطبوعہ فارم پر دستخط کر دیا لیکن ڈاکٹر محمود صاحب اور شاہ عزیز منعمی صاحب دستخط کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ صرف کانگریس ٹکٹ پر کھڑے تھے اور کانگریس نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ان کی وجہ سے راجندر پرشاد کی قاضی صاحب سے خط وکتابت ہوئی اور بالآخر ان کی خواہش پر مولانا آزاد نے قاضی صاحب کو بلایا اور کہا کہ اس موضوع پر زور دینے کا یہ موقع نہیں ہے اس کا جو موقع اور محل ہوگا میں خود اس کے لئے کوشش کروں گا۔ اس کے لئے تو کل ہند پیمانہ پر ہی کوشش ہونی چاہیئے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے شرط واپس لے لی اور کانگریسی مسلمان امیدواروں کی تائید کر دی گئی۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد وزیر تعلیم ہوئے اور سرکاری سطح پر آل انڈیا ایجوکیشنل ایڈوائزری بورڈ کا جلسہ ہوا تو اس میں مولانا نے یہ تجویز رکھی اور اس کی حمایت میں پرزور تقریر کی کہ بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا نظم حکومت کرے۔ لیکن مولانا اپنی بات منوانہ سکے۔ گاندھی جی، جواہر لال، ڈاکٹر رادھا کرشنن حتی کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب سبھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ یہ مولانا آزاد کی مذہبی ذہن تھا جو ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے

آزادی کے بعد لوگ مولانا کے پاس گئے اور ان سے امامت کی درخواست کی لیکن مولانا نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ عیدین کی امامت ہمیشہ کے لئے ترک کر چکے ہیں۔ مولانا امامت کس کی کرتے اور عقل و شعور والے مقتدی کہاں سے لاتے ۔

رام گڑھ کانگریس کا اجلاس ہوا تو میں بعض ساتھیوں سے پہلے رام گڑھ پہنچ گیا تھا۔ کچھ ساتھی

بعد میں آنے والے تھے۔ میں کانگریس کی کسی انتخابی مجلس کا کبھی امیدوار نہیں ہوا۔ اس لئے میں صرف تماشائی کی حیثیت سے ہی گیا تھا۔ رام گڑھ پہنچ کر میں نے اخبار امرتا بازار پتریکا میں پڑھا کہ مولانا کو قشقہ لگایا گیا، چونکہ یہ خبر واقعہ کے خلاف تھی اور مسلم لیگی سچ تو سچ جھوٹی باتوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اور ہر طرح کانگریسی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے اس لئے میں مولانا آزاد کے پاس گیا، اجمل خاں (مولانا آزاد کے سکریٹری) نے کہا کہ مولانا بے حد مشغول ہیں ملاقات اس وقت تو نہیں ہو سکتی ہے۔ البتہ مولانا نے کہا ہے کہ ان سے پوچھ لو کتنے آدمی ہیں، اتنے آدمیوں کا صدارتی ٹکٹ ان کو دے دو۔ میں نے سب جوڑ کر بتایا کہ ہم سولہ آدمی ہیں، چنانچہ اجمل خاں نے اتنے ٹکٹ مجھ کو دے دیئے۔ یہ ٹکٹ ڈائیس پر لیڈروں کے ساتھ بیٹھنے کے تھے لیکن ہم آل انڈیا کانفرنس کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ اصرار کر کے بیٹھ گئے۔ رضاکاروں نے ہزار کہا کہ آپ کی بڑی جگہ ہے یہ بیٹھنا بے ضابطہ بھی ہوگا لیکن سامنے سے کارروائی دیکھنے اور سننے میں جو مزا تھا وہ مزا ڈائیس پر بیٹھنے میں نہ تھا۔ اس لئے میں کسی طرح نہ مانا اور رضاکاروں نے آخر مجھ کو چھوڑ دیا۔ بعد میں افسوس بھی ہوا کیونکہ ضابطہ کے مطابق مجھے بیٹھنا چاہیئے تھا۔

میں نے اجمل خاں صاحب سے امرتا بازار پتریکا کی خبر کا بھی تذکرہ کیا۔ اجمل خاں صاحب نے یہی جواب دیا کہ مولانا کو اس کی تردید کے لئے بھی وقت نہیں ہے آخر میں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے کہا جو راستہ میں مل گئے تھے اور انھوں نے مجھ سے از راہ محبت کہا کہ تم میرے ساتھ ٹھہرو۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ڈائیس پر ہی راجندر پرشاد سے ذکر کیا۔ راجندر پرشاد نے اخبار مانگا تو مجھ کو آواز دے کر بلایا گیا۔ میں نے وہ اخبار ان کے حوالہ کیا۔ راجندر پرشاد نے فوراً اخبار میں اطلاع بھیج دی کہ چونکہ مولانا یہ پروگرام پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد مجھ کو مجبوراً ڈائیس پر بیٹھنا پڑا۔ مولانا آزاد کے سلسلہ میں ان کے مخالفوں کی طرف سے بے سر و پا الزامات کا اندازہ پہلے بھی تھا۔ رام گڑھ کانگریس کے اجلاس میں بھی اس کا یقین ہوا۔

رام گڑھ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مجلس موضوعات کے جلسہ میں مغرب کا وقت ہو گیا تو جلسہ کے اندر ہی مولانا حسین احمدؒ نے اذان دینی شروع کی اور مولانا آزاد نے اعلان کیا کہ اب کارروائی نماز کے بعد ہوگی۔ بعض ہندو آپس میں بولنے لگے کہ کیا یہ مسلمانوں کا جلسہ ہے۔ ایک صاحب

نے کہا کہ جب ہندو صدر ہوتا تھا تو اس کو قشقہ لگایا جاتا تھا اور اس طرح ہندو رسم ادا کی جاتی تھی مسلمان صدر ہوا تو اس نے نماز کے لئے کارروائی روک دی ہے۔ بات برابر ہے۔ کانگریس میں جو مسلمان تھے وہ اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ اور اذان و نماز کے ساتھ جلسہ کی کارروائیوں میں شریک ہوتے ۔

میں جمعیۃ علماء کلکتہ کا ناظم ہوا تو میری درخواست پر مولانا آزاد نے ایک اپیل لکھ کر دی کہ مسلمان اس جماعت میں شریک ہوں اور اس کو تقویت پہنچائیں۔ مولانا نے کہا کہ یہ ان مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے جو آزادئ ہند کے حامی ہیں اور کانگریس میں شریک ہیں ۔

جب ۱۹۴۶ء میں بہار کا مشہور فساد ہوا تو میں اس وقت بہار ہی میں تھا۔ مولانا آزاد، جواہر لال وغیرہ پٹنہ آئے تو میں پٹنہ گیا اور مولانا آزاد سے ملا۔ جہاں جہاں ناجائز گرفتاریوں کی میں نے مولانا کو خبر دی مولانا نے انوگرہ نرائن سنہا کو میرے سامنے کہا کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ مولانا اس موقع پر کم گفتگو کر رہے تھے۔ اجمل خان کو جو مولانا کے سکریٹری تھے دیکھا کہ وہ مسلمان نوجوانوں سے جو اکثر مسلم لیگی تھے کہہ رہے تھے کہ ملنے اور لڑنے دونوں کی صلاحیت ہونی چاہئیے، وہ بتا رہے تھے کہ بلوائیوں کے حملے ہوں تو مسلمان نوجوانوں کو کیا کرنا چاہئیے۔ اپنی مدافعت ہر شخص کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ اگر فسادات ہوتے رہتے ہیں تو اپنی مدافعت کے لئے تیار رہنا چاہئیے ۔

فسادات کے ختم ہونے کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا۔ مجھ کو اور قاضی احمد حسین صاحب کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مجلس عاملہ میں شرکت کی دعوت دی، اور ہم دونوں شریک ہوئے۔ وہاں یہ طے پایا کہ بہار میں حکومت کی طرف سے جو بے راہ روی ہو رہی ہے اس سے مولانا آزاد کو مطلع کیا جائے، جب مولانا آزاد کو واقعات بتائے گئے تو انھوں نے کہا کہ آپ حضرات کی رپورٹ اور سری کرشن سنہا کی رپورٹ میں اختلاف ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ میں سری کرشن سنہا کو بلاتا ہوں وہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے آپ حضرات اپنی رپورٹ پیش کیجیے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سری کرشن سنہا نے اقرار کیا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے بلوائیوں کے حملے کا ڈر لگا رہتا ہے، اس وقت تک کے لئے پولیس کی چوکیاں قریب قریب بنائی جائیں اور لوگوں سے جو آس پاس بسے ہوئے ہیں یہ ضمانت لی جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں فسادات نہیں ہونے دیں گے مولانا آزاد

نے کہا ایک بات اور، وہ یہ کہ جب تک حالات سازگار نہ ہوں ان چوکیوں کا ذمہ دار مسلمان پولیس آفیسر کو بنائیں۔ سری کرشن سنہا نے وعدہ تو کیا لیکن اس پر عمل بہت کم ہوا۔ فسادات کا سلسلہ اسی لئے ہے کہ بہت سی صحیح باتوں پر عمل نہیں کیا جاتا اور تجاویز محض کاغذی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پٹنہ یونیورسٹی نے طے کیا تھا کہ مولانا آزاد کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جائے اور یہ کہ وہ خطبہ تقسیم اسناد دیں۔ مولانا آزاد تشریف لائے تو میں ان دنوں روزنامہ "الہلال پٹنہ" کا ایڈیٹر تھا۔ مولانا کی تشریف آوری پر اداریہ لکھتے ہوئے مسلم لیگ کے لوگوں نے زمانہ پہلے میں جو دل آزار کاروائیاں کی تھیں ان کا تھوڑا ذکر کر دیا تھا۔ جب میں قاضی احمد حسین صاحب اور مولانا حکیم سعد اللہ صاحب کی معیت میں مولانا سے ملا تو میرا یہ اخبار مولانا کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب مسلم فرقہ پرستی سے ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ مسلم فرقہ پرست تو خود ہی سر چھپائے پھر رہے ہیں ان کے خلاف اب کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب خطرہ ہندو فرقہ پرستی سے ہے۔ یہ فرقہ پرستی خوفناک طور پر سر اٹھا رہی ہے، اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، اب اس کے خلاف لکھنا بولنا اور کام کرنا چاہئے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد کی حیثیت محض "شو بوائے" کی تھی۔ مولانا نے مسلمانوں کو ان کو جائز حقوق دلانے اور ظلم سے بچانے کی جو کوششیں خاموشی کے ساتھ کیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

یونیورسٹی میں مولانا کا تعارف کراتے ہوئے جب گورنر بہار نے کہا کہ مولانا نے جامعہ ازہر میں تعلیم پائی ہے تو مولانا نے فوراً تردید کی اور کہا کہ میرے پاس آج کل کی یونیورسٹیوں کی طرح کی کسی یونیورسٹی کی سند نہیں ہے۔

جب پاکستان جانے والے مسلمانوں کی جائدادوں کے بہانے ہندوستانی مسلمانوں کی جائدادیں ضبط ہونے لگیں تو میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ہدایت کے مطابق اس سلسلہ میں ریلیف کا کام کرنے لگا اور پٹنہ ریلیف کمیٹی کا سکریٹری مقرر ہوا۔ ایک صاحب جو اصلاً پاکستانی تھے لیکن انھوں نے ہندوستانی شہریت حاصل کرلی تھی حکومت کی زد میں آگئے، ان کے کاروبار پر بغیر وجہ بتائے پولیس نے قبضہ کرلیا اور ان کو کہا گیا کہ تم فوراً پاکستان چلے جاؤ۔ اس سلسلہ میں دہلی گیا اور مولانا آزاد سے ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سلسلہ میں مولانا آزاد ہی نہیں جواہر لال بھی بے بس ہیں۔ دونوں ملکوں میں انتقام کا چکر چل رہا تھا۔ جواہر لال اس قانون کو پارلیمنٹ میں LAWLESS LAW کہنے پر بھی برداشت

کر رہے تھے اور ان کا وزیراعظم ہونا کچھ بھی سودمند نہیں ہو رہا تھا۔ اگر ملک میں عوامی فضا منافرت کی ہو تو مظالم کو روکنا ایک یا دو آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

پھر مسٹر یونس پر آفت آئی۔ وہ کسٹوڈین کے قانون میں ترمیم کرانے کے لئے میری کافی مدد کر چکے تھے۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس سلسلہ میں غور و فکر کرنے کے لئے مجلس عاملہ بلائی اور مجھ کو دعوت دی تو وہ بھی میرے ساتھ جلسہ میں شرکت کے لئے اور اس معاملہ میں مشورہ دینے کے لئے دہلی گئے تھے۔ مسٹر یونس بختیار پور بہار شریف ریلوے کے مالک ہو گئے تھے، یہ بات فرقہ پرستوں کو بری لگی کہ بہار میں کوئی مسلمان ایسی معاشی خوشحالی میں ہو۔ انھوں نے سازش کی اور کہا کہ ریلوے کی حالت بہت خراب ہے، حالانکہ مسٹر یونس کو ریلوے لئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ان فرقہ پرستوں کے شور مچانے پر ڈسٹرکٹ بورڈ نے ریلوے پر قبضہ کر لیا اور جب مسٹر یونس اس کو ذمہ داری دینے پر راضی نہ ہوئے اور حساب سمجھانے سے انکار کر دیا تو ان پر ڈکیتی وغیرہ کا مقدمہ چلا دیا گیا۔ ڈاکٹر کی اس رپورٹ پر کہ وہ نقل و حرکت کے لائق نہیں ان کو گرفتار کرنے کی جگہ گھر ہی پر نظر بند کر دیا گیا اور مسلح پولیس ان کے بستر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ مسٹر یونس نے مجھ کو کاغذات دے کر کہا کہ میں دہلی جاؤں چنانچہ میں دہلی گیا۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب کے ساتھ میں مولانا آزاد اور سردار پٹیل سے ملا۔ سردار پٹیل نے لکھا کہ میں ریلوے کے معاملہ میں دخل دینا نہیں چاہتا، لیکن یونس جیسے بڑے آدمی پر چوری اور ڈکیتی کا مقدمہ چلانے سے یہ اثر پڑے گا کہ ان کو خواہ مخواہ کے لئے تنگ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ مقدمہ اٹھا لیا گیا، ریلوے کے لئے مسٹر یونس آخری دم تک مقدمہ لڑے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے نے معاوضہ لے کر ریلوے کو چھوڑ دیا۔ لیکن چند ہی ماہ میں اس ریلوے کا حال اتنا برا کر دیا گیا کہ مسافر پریشان ہو گئے۔ آخر مرکزی حکومت نے اس کو اپنی ریلوے میں ملا لیا۔

معلوم ہوا کہ مولانا آزاد نے بھی اس سلسلہ میں سردار پٹیل سے بات کی تھی۔ اسی کے بعد انھوں نے حکومت بہار کو اس سلسلہ میں لکھا تھا۔

بعض ناپسندیدہ حالات کی بنا پر جب میں جمعیۃ علما بہار سے علیحدہ ہوا اور اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اپنے قریہ سملہ چلا گیا تو وہاں ایک روز قاضی احمد حسین صاحب آئے اور انہوں نے خواہش کی کہ میں دہلی جاؤں اور مولانا آزاد سے کہوں کہ ان کو راجیہ سبھا کا ممبر بنا دیا جائے چنانچہ

میں دہلی گیا۔ اجمل خاں نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا کہ جب لڈو تقسیم ہو رہے تھے تو آپ کہاں تھے ؟ وہ سمجھے میں اپنی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے آیا ہوں۔ میں نے فوراً بتایا کہ میں اپنے کام سے نہیں آیا ہوں بلکہ قاضی احمد حسین صاحب کے لئے آیا ہوں۔ اجمل خاں نے فوراً مولانا کو اطلاع دی۔ مولانا سکریٹریٹ جانے کے لئے باہر نکل رہے تھے انھوں نے مجھ کو دیکھ کر کہا کہ مجھ کو اجمل خاں سے معلوم ہو گیا ہے اب قاضی صاحب کو میرا سلام کہہ دیں اور کہیں کہ جو اس کا موقع اور محل ہے میں اس وقت اس کا خیال رکھوں گا۔

جب صوبائی کانگریس سے قاضی صاحب کی سفارش نہیں گئی اور میں پھر مولانا سے ملا، اور اس سوال کے جواب میں کہ قاضی صاحب کا نام کیوں نہیں آیا، میں نے بتایا کہ "صوبائی کانگریس کے صدر نے کہا کہ میں ان کو نہیں جانتا ہوں" تو مولانا بولے کہ اتنے پرانے آدمی کو اگر صوبہ کانگریس کا صدر نہیں جانتا ہے تو اس کا یہ نقص ہے اس کے بعد مولانا نے مجھ کو رخصت کیا۔ شام کو کانگریس مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا اور مولانا نے اس میں قاضی احمد حسین صاحب کا نام پیش کیا اور یہ نام بلا پس و پیش منظور ہوا۔

قاضی صاحب کے خلاف کچھ لوگوں کا وفد مولانا آزاد کے پاس گیا اور کہا کہ وہ بہت بوڑھے اور مریض ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ آپ پنڈت پنت کو جانتے ہیں ؟ وہ وزیر داخلہ ہیں۔ پورے ہندوستان کا بوجھ ان کے سر پر ہے اور ان کا سر ڈولتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ مریض ہیں۔

راجیہ سبھا کے لئے مسلم لیگ کے دو سابق عہدیداران کے نام بھی ڈاکٹر محمود صاحب کی سفارش پر کانگریس کی مجلس عاملہ نے منظور کئے تھے۔ یہ جعفر امام صاحب اور مظہر امام صاحب تھے ان کے خلاف بھی وفد نے مولانا آزاد سے شکایت کی۔ مولانا آزاد نے جواب دیا "تو کیا ان سب کو ذبح کر دیا جائے ؟" مسلم لیگ نے مولانا آزاد کو ذلیل اور بے اثر کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی تھی، لیکن مولانا کے قلب وسیع میں اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔

مولانا پر شراب پینے کے الزامات بھی مخالفین نے لگائے ہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں خود ہی سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مکتوب میں لکھا ہے، لیکن میں مولانا کے دولت کدہ پر مختلف اوقات میں گیا۔ صبح کو، دوپہر کو، شام کو، ایک بار آخر رات تک بیٹھا رہا۔ میں نے کبھی بھی مولانا

کو نشہ کی حالت میں نہیں پایا۔ حالانکہ مولانا مجھ کو بہت جلد بلا لیتے تھے۔ مریض ذہن دوسروں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے، جو لوگ ذہنی طور پر صحت مند ہوتے ہیں وہ دوسروں کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ایک بار اجمل خاں نے مجھ سے کہا کہ بمبئی کے ایک تاجر نے مولانا کو شراب کی بوتل پیش کی، میں نے فوراً پوچھا کیا مولانا شراب پیتے ہیں۔ اجمل خاں نے کہا نہیں۔ مولانا نے وہ بوتل واپس کردی، اجمل خاں مولانا کے سکریٹری تھے ان سے زیادہ قابل اعتبار بات کس کی ہوسکتی ہے۔

کسی نے قاضی احمد حسین صاحب سے کہا کہ مولانا نے میرے ساتھ شراب پی ہے۔ قاضی صاحب نے کہا جھوٹ ایسا بولئے جو لوگ یقین کریں۔ مولانا کو شراب پینا ہوگی تو وہ جواہر لال وغیرہ کے ساتھ پئیں گے، آپ کے ساتھ نہیں پئیں گے۔ یہ ناگفتہ باتیں اس لئے لکھ دی گئیں کہ یہ ہم مسلمانوں کی اخلاقی حالت کی آئینہ دار ہیں۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی

سیّد صاحب "دسنہ" بہار کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد اسلام پور ضلع پٹنہ کے ایک
بزرگ شاہ ولایت علی صاحب سے بیعت تھے اور وہاں ہی رؤسا کے طبیب خاص تھے۔ ان کی قبر بھی
اسلام پور ہی میں اپنے پیر و مرشد کے نزدیک ہے اس لئے سید صاحب کا بچپن اسلام پور میں گزرا اور ان
کی ابتدائی تعلیم اسلام پور میں اور پھلواری شریف میں ہوئی۔ شاہ محی الدین صاحب امیر شریعت ثانی
ان کے اساتذہ میں تھے۔ مجھ سے سید صاحب فرماتے تھے کہ اسلام پور سے فتوحہ تک کوئی مسلمان بستی
ایسی نہیں ہے جہاں وہ پیدل نہیں گئے ہوں۔

میں معترف سید صاحب کا بہت پہلے سے تھا۔ میں نے دار المصنفین کی کتابوں
کا بالخصوص شبلی اور سید صاحب کی کتابوں کا مطالعہ خوب اچھی طرح کیا۔ ندوہ کی
تحریک کے سلسلہ میں تمام لٹریچر میرے ماموں ڈاکٹر زین العابدین کے کتب خانے میں موجود تھا میں نے
ان سب کو پڑھا تھا۔ والدہ کے دونوں ماموں حافظ فضل الحق آزاد عظیم آبادی اور شمس العلماء
حافظ محب الحق صاحب ندوہ کی تحریک میں شریک وسہیم تھے۔ شمس العلماء مولانا محمد علی مونگیری مرحوم کے
مرید بھی تھے۔ ان کی حیثیت میرے ننہال میں صدر کی تھی۔ اہم معاملات میں ان کی رائے فیصلہ کن ہوتی
تھی۔ ان سے سید صاحب کی تعریف سنتا تھا۔ پھر میری شادی اسلام پور خانقاہ میں ہوئی تو وہاں
ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے سید صاحب کا بچپن دیکھا تھا۔ ان سے سید صاحب کے بچپن کے
حالات سنتا رہا۔ معارف تو میرے مطالعہ میں برابر رہا اب چار پانچ سالوں سے نہیں مل رہا ہے۔
میں یہ تحریر ۱۹۸۲ء میں مکہ کے دوران قیام میں لکھ رہا ہوں، لیکن سید صاحب سے میری ملاقات
پہلی بار کلکتہ میں ہوئی جب مسلم لیگ کے لوگوں نے اردو کانفرنس کی تھی۔ چونکہ سید صاحب کے تعلقات
جمعیتہ العلماء کے بزرگوں سے تھے اس لئے مجھ کو ذرا تعجب ہوا، میں ان سے ملا تو انھوں نے کہا کہ مولانا
حبیب الرحمٰن شیروانی کا خط آیا تھا کہ تم کو اس اردو کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔ چونکہ ان کی رائے

میرے لئے ہمیشہ حکم کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے میں چلا آیا۔

بہرحال میں نے سید صاحب کو جمعیۃ العلماء کے خصوصی اجلاس میں مدعو کیا۔ وقت مقررہ پر ان کو لینے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری (مصنف اصح السیر) کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالروف صاحب کے یہاں سے ان کو لیا تو مولانا نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ کہاں جارہے ہیں، وہ مجھ کو پہچانتے ہی تھے اس لئے سمجھ گئے تھے لیکن سید صاحب کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے کہا کہ اردو کے معاملہ میں ہم آپ ایک جگہ ہو گئے تھے۔ اب میں اپنی جگہ جارہا ہوں آپ اپنی جگہ جائیے۔

سید صاحب نے جمعیت کے اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر کی انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہاں رہو اس کو صاف ستھرا اور ٹھیک رکھو۔ یہ حکم جس طرح اپنے مکان کے لئے ہے۔ اسی طرح اپنے محلہ کے لئے اپنے شہر کے لئے اور اپنے ملک کے لئے بھی ہے بلک کی خدمت کے زیادہ مواقع حاصل کرنے کے لئے ملک کی آزادی ضروری ہے اور جو آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ سید صاحب نے ملک کی آزادی کے مسئلہ کو دینی نقطہ نظر سے دیکھا تھا۔

دوسرے روز ہم اپنے رفقاء کے ساتھ سید صاحب سے پارک سرکس میں ملے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے اور ایک گھنٹہ تک ان کی علمی گفتگو سنتے رہے۔ سید صاحب نے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک تقریر بھی کی جس میں بتایا کہ ہندوستان کی تعمیر میں مسلمانوں نے کیا حصہ لیا ہے اور دنیا پر اسلام کے کیا احسانات ہیں۔ انھوں نے مستشرقین پر تنقید بھی کی۔ سید صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا ان کا شمار اس دور کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا ہے وہ علامہ کے لقب کے بجا طور پر مستحق ہیں

اس کے بعد سید صاحب سے میری ملاقات بھوپال میں ہوئی جب ان کو اور مفتی کفایت اللہ صاحب کو نواب بھوپال نے مذہبی قوانین میں ردوبدل کے سلسلہ میں مشورہ کے لئے بلایا تھا۔ اس وقت بھوپال کے اور علماء بھی ان کے پاس آ گئے تھے۔ ایک عالم دین نے ان دونوں صاحبان سے تحریری شکایت کی کہ وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے یہاں قیام کئے ہوئے ہیں جو مناسب نہیں ہے کیونکہ یہاں میز کرسی پر کھانا پڑتا ہے۔ برتن چاندی کا ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی اطلاع دی کہ یہاں

احمد آباد کے محلہ میں مسجد کے اس حصہ میں جو نماز کی جگہ ہے پھول وغیرہ لگائے گئے ہیں اور اس کے لئے کھاد ڈالا گیا ہے جو ناپاک ہے۔

مفتی صاحب نے جواباً کہا کہ میز کرسی پر کھانا اب صرف نصاریٰ کا شعار نہیں رہا ہے۔ تمام دنیا میں مسلمانوں کے یہاں یہ رائج ہے۔ باقی رہا برتن تو اس بارے میں مجھ کو واقفیت نہیں۔ یہ سید صاحب بتائیں گے اگر یہ چاندی کے برتن ہیں تو میں نے غلطی کی۔ سید صاحب نے کہا کہ یہ برتن چاندی کے نہیں ہیں۔ یہ جرمن سلور کے ہیں۔ صرف ان کا نام سلور ہے۔ حقیقی چاندی نہیں۔ ایک صاحب نے مفتی صاحب کے میز کرسی والے اعتراض کا جواب سن کر کہا کہ انگریزی بالوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ سید صاحب نے کہا کہ انگریزی بال ابتک مذہبی مسلمانوں میں رائج نہیں یہ تو ٹھیلے والے، تانگے والے اور قلیوں میں رائج ہیں جو غریب جانتے ہی نہیں کہ تہذیب کس کا نام ہے۔ ان کے انگریزی بال رکھ لینے سے یہ مسلمانوں کا شعار نہیں کہا جائے گا۔ ہاں مذہبی مسلمان انگریزی بال رکھنے لگیں تو کہہ سکیں گے کہ یہ مسلمانوں کا شعار بھی ہے۔

کلکتہ میں سید صاحب سے میری ملاقات جمعیت العلما کے ایک کارکن کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا اور نہ سید صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا بھوپال میں ان کو معلوم ہوا کہ میں ڈاکٹر زین العابدین ندوی کا بھانجہ ہوں، کہنے لگے یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے اتنا کافی سمجھا کہ میں جمعیت العلما کا ایک کارکن ہوں۔ کہنے لگے اس تعلق کو آدمی بھول جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کے خاندان والوں سے جو مراسم رہے ہیں ان کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کا پڑھنے کا زمانہ ایک رہا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ایسے عزم کا آدمی نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب بولتے تھے کہ پڑھنے کے بعد یہ کروں گا وہ کروں گا، یورپ جاؤں گا، امریکہ جاؤں گا تو ہم ہنستے تھے کہ ایک یتیم بچہ جو چٹائی پر بیٹھ کر پڑھ رہا ہے مولوی بننے والا ہے، یورپ، امریکہ کا خواب دیکھ رہا ہے، لیکن ہنسی غلط ثابت ہوئی۔ وہ پڑھ کر فوراً امریکہ چلے گئے۔ انسان کی شخصیت اس کے ارادوں سے بنتی ہے۔

تیسری ملاقات بھی سید صاحب سے بھوپال ہی میں ہوئی اور بار بار ملاقات ہوئی اور میرا پوری طرح تعارف ہوا۔ سید صاحب قاضی ریاست ہو کر آگئے تھے۔ میرے بہنوئی

سید عبدالصمد صاحب کا جوان کے عزیز ہوتے تھے اور بھوپال میں مقیم تھے انتقال ہوگیا تھا۔ میں ان دنوں روزنامہ الہلال پٹنہ کا ایڈیٹر تھا۔ مجھ کو تار سے انتقال کی خبر دی گئی تو میں بھوپال پہنچا۔ میرے انتظار میں جنازے کی تدفین نہیں ہوئی تھی۔ میں پہنچا تو جنازے کی نماز پڑھی گئی اور سید صاحب نے نماز پڑھائی اس وقت ان کو میری اس قرابت کا علم ہوا۔ عبدالصمد صاحب مرحوم کی وہاں دکانیں تھیں، میں نے سب کی رائے سے ان دو کانوں کی نگرانی شروع کر دی۔ ایک روز سید صاحب دکان پر پہنچے اور کہنے لگے، آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں برابر آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ فرصت نہیں ملی۔ اب انشاء اللہ حاضر ہوں گا، چنانچہ میں سید صاحب کے یہاں جانے لگا۔ ہماری بہن تو عدت میں تھیں، لیکن سید صاحب کی اہلیہ وغیرہ بہن سے ملنے آجاتی تھیں۔

پھر ترکہ کے سلسلہ میں عبدالصمد صاحب مرحوم کے ایک بھائی سے اختلاف ہوا میں نے محی الدین صاحب کو جو نظام حیدرآباد کے استاذ عبدالغنی صاحب کے لڑکے تھے اور عبدالصمد صاحب کے بہنوئی ہوتے تھے اور حیدرآباد میں معتمد تعلیمات کے عہدہ پر فائز تھے، لکھا کہ آپ اس اختلاف کو سلجھا دیجئے میں زیادہ دنوں بھوپال میں رہ بھی نہیں سکوں گا۔ چنانچہ میری درخواست پر وہ تشریف لائے۔ میرے یہاں مہمان ہوئے ان کی تحریک پر سید صاحب ثالث بنا دیئے گئے۔ سید صاحب نے یہ اندازہ کر لیا کہ میں حق پر ہوں لیکن عبدالصمد صاحب کے بھائی مخالفت میں بہت شدت اختیار کر گئے تھے۔ سید صاحب کے تعلقات ان کے دوسرے بھائی ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب اور محی الدین صاحب جن کا اوپر ذکر ہوا۔ بہت گہرے تھے انھوں نے سوچا کہ ان کی مخالفت میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ اور اس طرح ممکن ہے تعلقات خراب ہو جائیں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کا مقدمہ مضبوط ہے آپ ہائی کورٹ میں درخواست دیں اور میرے یہاں سے مقدمہ واپس لے لیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے یہاں سے مقدمہ نہیں اٹھاتا۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارے خلاف فیصلہ دے دیں۔ مجھ کو دیر ہوئی تو امارت شرعیہ کے ذمہ دار حضرات بذریعہ خط دریافت کیا کہ تم کب تک آسکو گے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ سید صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب فیصلہ کر دیں گے، آجاؤں گا۔ اسی پر مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت بہار نے سید صاحب کو لکھا کہ آپ محمد عثمانی کو جلد فرصت دیجئے کیونکہ ان کی ہم لوگوں کو ضرورت ہے۔ اس کے بعد سید صاحب نے فریقین کو بلا کر بیان لیا۔ ثبوت دیکھے اور

فیصلہ سو فیصد ہماری حمایت میں کیا، میں دنگ رہ گیا۔ میرا سید صاحب سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ میرے مخالفوں سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ اور تعلقات بھی تھے اور سنا تھا کہ ان کے ذریعے وہ حیدر آباد میں اپنے داماد کے لئے کوشاں بھی ہیں۔ لیکن ان سب کی پرواہ نہ کر کے انھوں نے فیصلہ ہماری حمایت میں دیا۔ اور برسرِ عدالت کہا کہ آپ کا حق اس سے زیادہ ہوتا ہے لیکن چونکہ خود آپ اس کو چھوڑ رہے ہیں اس لئے میں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔ سید صاحب کی اس حق پرستی کا اثر مجھ پر بہت ہوا اور ان سے عقیدت زیادہ بڑھی۔ انسان کو اپنے رشتہ داروں کے خلاف فیصلہ دینا پڑے اور وہ اس آزمائش میں پورا اترے یہ اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔

میں سید صاحب کے یہاں حاضر ہوتا رہتا تھا اور ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک روز سید صاحب نے بتایا کہ الہلال میں کئی مضامین ان کے ہیں۔ مولانا آزاد اجازت نہیں دیتے تھے کہ اسٹاف کے لوگوں کا نام ان کے مضامین کے ساتھ درج ہو۔ اس لئے ان کا نام ان مضامین پر نہیں ہیں۔ چونکہ مولانا آزاد ایک روز میری موجودگی میں میرے ایک دوست سے یہ اعتراف کر چکے تھے کہ الہلال میں سب مضامین ان کے نہیں ہیں اس لئے مجھ کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ الہلال میں سید صاحب، عبدالسلام ندوی، عبداللہ عمادی، خواجہ عبدالحی فاروقی وغیرہ کام کرتے تھے۔ سید صاحب اور عبدالسلام ندوی صاحبان تو دار المصنفین چلے گئے۔ فاروقی صاحب جامعہ چلے گئے۔ الہلال کے انتظامیہ میں ہمارے ایک بزرگ اور قطب الدین صاحب تھے۔ ہمارے ان بزرگ نے اپنی خانقاہ سنبھالی اور قطب الدین صاحب کمیونسٹ ہو گئے۔ اس زمانہ میں کمیونسٹ لٹریچر کا داخلہ ہندوستان میں ممنوع تھا۔ لیکن انھوں نے کسی طرح تمام لٹریچر منگا کر اپنا ایک بڑا کتب خانہ بنا لیا تھا اور اس کے ذریعہ وہ لوگوں کو کمیونسٹ بناتے تھے۔ بنگال کے اکثر بڑے کمیونسٹ مظفر احمد صاحب وغیرہ ان کے کتب خانہ کے ذریعہ کمیونسٹ بنے۔

سید صاحب نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ مولانا آزاد مصر گئے تھے اور یہ کہ ان کے بھائی غلام محی الدین مصر گئے تھے۔ جامعہ ازہر میں پڑھنے کی بات تو ایسی ہے کہ مولانا نے خود پٹنہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر انکار کیا تھا۔ لیکن مجھ سے وحشت صاحب کلکتوی نے جو مولانا آزاد کے ابتدائی دور کے دوستوں میں سے تھے کہا تھا کہ غلام محی الدین مولانا ہی کا نام ہے۔

اور ان کے بھائی کا نام یٰسین تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ چونکہ بعض علمار کے نزدیک غلام محی الدین نام صحیح نہیں ہے اس لئے مولانا نے اپنا یہ نام لکھنا پسند نہیں کیا۔

سید صاحب نے ایک مجلس میں یہ بھی کہا کہ اولاً وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے جب وہ عملی سیاست سے علیحدہ ہوئے تو انھوں نے ہی مولانا آزاد کا نام تجویز کیا کہ ان کو ان کی جگہ لے لیا جائے۔ مجھ کو اس بات کے قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوا۔ سید صاحب نے مولانا آزاد کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا نام تجویز کیا ہوگا۔ سید صاحب نے ایک بار موتی لال نہرو کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ دارالمصنفین آئے تھے اور فرمائش کر کے کباب بنواتے اور کھاتے تھے اور جانتے تھے کہ کباب عموماً کس گوشت کا ہوتا ہے۔

سید صاحب سے پہلے بھوپال میں جو قاضی تھے انھوں نے ایک بار ریڈیو کی خبر پر عید کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کا حکم تو نافذ ہو گیا لیکن مفتی عبدالہادی صاحب مفتی ریاست اور مولانا رضوان الدین صاحب نائب قاضی اور حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددی نے یہ اعلان پسند نہیں کیا اور اس روز ان سب نے روزہ رکھا۔ سید صاحب تشریف لائے اور ایسا موقع آیا تو انھوں نے ریڈیو کی خبر کو قبول نہیں کیا۔ اور کہا کہ ریڈیو اعلان کا ذریعہ ہے، ریڈیو کی حیثیت شہادت کی نہیں ہے۔ اور مطلوب شہادت ہے۔ سید صاحب کے اس اعلان سے بھوپال کے علمار میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، لیکن بڑے بڑے حکام میں یہ فیصلہ پسند نہیں کیا گیا۔ سید صاحب دین کے معاملہ میں امرار و حکام کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

میں پٹنہ چلا آیا۔ عبدالصمد صاحب مرحوم کی ایک بندوق تھی جو کہ میں نے سید صاحب کے پاس بطور امانت چھوڑ دی تھی اور سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ مجھ کو لائسنس مل گیا تو لے جاؤں گا۔ بھوپال کے قانون کے مطابق ایک ہزار اور اس سے اوپر کی تنخواہ پانے والے بلا لائسنس بندوق رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ لائسنس ملنے کے بعد میں اولاً آزاد کانفرنس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ گیا اور اس کے بعد بھوپال۔ لکھنؤ اسٹیشن پر ہی سید صاحب مل گئے، بہت خوشی ہوئی۔ ان کے ساتھ بھوپال تک سفر اور ان ہی کے یہاں قیام کیا۔ سید صاحب نے ایک نشست میں فرمایا کہ ان کے ماننے والے دونوں جگہ ہیں۔ پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی، اور

دونوں ہی ان سے اپنے یہاں رہنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟ میں نے عرض کیا "آپ کی عمر ایسی ہے کہ آپ کو آرام کرنا چاہئے، اس کے لئے شاید پاکستان بہتر ہو۔ اور اگر خدمت مقصود ہو تو ہم ہندوستانیوں کو آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ اس پر وہ خاموش رہے۔

سید صاحب نے کہا کہ اگر آپ کی واپسی دوسرے راستے سے ہو تو مجھ کو ایک کام ہے۔ میں نے کہا وہ کیا؟ سید صاحب نے جواب دیا "میرے داماد سید حسین صاحب اناؤ میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں میری دو بچیاں وہاں جانا چاہتی ہیں۔ اگر آپ ادھر سے جانا چاہیں تو آپ کے ساتھ کر دوں" میں راضی ہو گیا اور ان کی بچیوں کو سید حسین صاحب کے یہاں پہونچا دیا۔ یہ سید حسین صاحب الہ آباد کے رہنے والے تھے اور کمشنر کے عہدہ تک ترقی کر کے ریٹائر ہوئے اب علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ وھاں مکان بنالیا ہے۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ ہے یہ مولانا وصی اللہؒ کے خلیفہ ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب سے پٹنہ میں ملاقات ہوئی، اہل خانہ کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ خواتین میری بہن سے ملنے میرے یہاں آئیں۔ سید صاحب سے مراسم بڑھتے رہے۔

سید صاحب سے میری خط وکتابت بھی ہوئی افسوس میں ان کے خطوط محفوظ نہیں رکھ سکا۔ سید صاحب پاکستان گئے تو ایک روز مسلمان سی آئی ڈی میرے پاس آیا اور انھوں نے کہا کہ "سید صاحب کے بارے میں مجھ کو انکوائری ملی تھی، میں نے رپورٹ دی کہ سید صاحب کانگریسی تھے اور پاکستان خیر سگالی مشن پر گئے تھے، لیکن ان کے عزیزوں نے ان کو وہاں روک لیا اور اس رپورٹ پر مجھ کو سسپنڈ کر دیا گیا ہے اور مجھ سے ثبوت مانگا گیا ہے۔ میں نے ازراہ ہمدردی سید صاحب کے خطوط دے دیئے۔ اس کے بعد وہ خطوط مجھ کو نہیں مل سکے۔ دوسری بار ان ہی صاحب سے جو سی آئی ڈی تھے پھر ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ ان خطوط کی بناء پر وہ دوبارہ کام کرنے لگے ہیں اور ان کی ملازمت بحال ہو گئی ہے۔ کیسی کیسی شخصیتوں کے بارے میں سی آئی ڈی کے لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

ایک بار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مجھ سے کہا کہ سید صاحب کا اس طرح پاکستان جانا مولانا ابوالکلام آزاد کو بہت ناپسند ہوا۔ فرماتے تھے کہ جانا تھا تو کہہ کر جاتے۔ بہت لوگ گئے کس کو کون روک سکتا ہے، لیکن خیر سگالی مشن میں جانا اور وہاں رہ جانا مناسب نہیں تھا۔ میں

نے حفظ الرحمٰن صاحب سے کہا کہ وہ اپنے عزیزوں کے اصرار پر رہ گئے ورنہ ان کا ارادہ تو واپس آنے کا تھا۔

جو حضرات پٹنہ میں مولانا ریاست علی ندوی صاحب سے شکایتیں رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ سید صاحب نے گورمنٹ کے مدرسہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی کے لئے ریاست علی صاحب کی سفارش کرکے ندوی عصبیت کا ثبوت دیا، حالانکہ واقعہ کچھ اور ہی ہے۔ میں آخر بار بھوپال گیا تھا تو اس وقت ریاست علی صاحب شمس الہدیٰ کی پرنسپلی کے امیدوار تھے۔ بہار حکومت کا محکمۂ تعلیم یہ خیال قائم کر چکا تھا کہ ریاست صاحب کو پرنسپل بنایا جائے۔ ریاست صاحب کا یہ پیغام میں نے سید صاحب تک پہنچایا کہ حالات ان کے موافق ہیں اب صرف آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ سید صاحب عربی اور دینیات کے ماہر کی حیثیت سے حکومت بہار کی دعوت پر امید واروں کی جانچ کرنے کے لئے پٹنہ آنے والے تھے۔ سید صاحب نے مجھ کو جواب دیا کہ حکومت کی طرف سے کوئی تصنیف وتالیف کا ارادہ ہوتا تو میں ان کی پرزور سفارش کرتا لیکن پڑھانے کا کوئی تجربہ ان کا نہیں ہے۔ اس کے لئے ان کو مناسب نہیں سمجھتا ہوں" اس کے بعد سید صاحب نے کہا کہ اختلاف عقائد کو بیچ میں نہیں لانا چاہتے۔ مولانا ظفر الدین صاحب ذی علم بھی ہیں، پڑھانے کا تجربہ بھی رکھتے ہیں اور شمس الہدیٰ میں عارضی پرنسپل بھی ہیں انھیں کو پرنسپل بنانا چاہیئے چنانچہ سید صاحب پٹنہ تشریف لائے تو انٹرویو لینے کے بعد انھوں نے اول ترجیح مولانا ظفر الدین صاحب ہی کو دی۔ جو بریلوی مسلک کے ممتاز عالم تھے اور دوسرا نمبر مولانا ریاست علی صاحب کو دیا۔ لیکن وزارت تعلیم تو طے کر چکی تھی کہ کسی طرح ریاست علی صاحب ہی کو پرنسپل بنایا جائے۔ اس لئے اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور دوبارہ درخواستیں طلب کیں۔ سید صاحب پھر تشریف لائے امیدواروں کے انٹرویو لئے، اس دفعہ مولانا ظفر الدین صاحب کو بلایا نہیں گیا تھا، لیکن ایک نئے امیدوار مولانا مظاہر امام صاحب آگئے تھے۔ یہ شیر گھاٹی کے رہنے والے تھے۔ بہار شریف اور گیا کے مدرسوں میں پڑھا چکے تھے، کانگریسی بھی تھے۔ سید صاحب نے اول ترجیح مولانا مظاہر امام صاحب کو دی اور دوسرا نمبر مولانا ریاست علی صاحب کو دیا۔

سید صاحب سے میری ملاقات اس واقعہ کے بعد ہوئی تھی۔ انھوں نے مذکورہ بالا واقعہ سنا کر کہا تھا کہ مولوی تو اصل میں مولانا مظاہر امام صاحب ہیں، ان کی صلاحیت قدیم علوم

میں بہت اچھی ہے، لیکن وہ ہو نہیں سکیں گے، کیونکہ وہ انگریزی میں اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے اور پرنسپل کے لیے تھوڑی انگریزی جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مولانا ریاست علی صاحب پرنسپل ہو گئے۔ اس کے باوجود کہ سید صاحب نے دونوں مرتبہ ان کا نام دوسرے درجہ میں رکھا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی

میرے بعض اعزا سیاست سے تعلق رکھتے تھے اور ان علما دین سے جو سامراج دشمن سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ ان کی وساطت سے میں نے مولانا عبیداللہ سندھی کا نام سنا تھا اور انہی سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کس طرح جلاوطن ہوئے۔

نہرو رپورٹ کی حمایت و مخالفت کا زمانہ تھا جب ہمارے ایک بزرگ دوسری بار حج کرنے گئے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مکہ معظمہ میں قیام پذیر تھے۔ وہ مولانا سے ملے اور ان سے ہندوستان کی سیاست پر گفتگو ہوئی۔ مولانا نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کانگریس کو کسی حال میں نہ چھوڑیں۔ کانگریس کی طاقت کا اندازہ اتنا ہندوستان میں رہ کر نہیں ہوتا جتنا باہر رہ کر ہوتا ہے اور دوسرے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مشترکہ پلیٹ فارم پر بھی رہیں یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اس وقت پارلیمنٹ کو اس مشترکہ پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل ہوگی۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں میں خدمتی ادارے کثرت سے قائم کئے جائیں۔ خدمت کرنے سے ہی ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوگا اور یہ احساس ہوگا کہ اپنا ملک اپنے ہاتھوں میں ہو تو خدمت کے کتنے زیادہ مواقع حاصل ہوں گے۔ مولانا نے خواہش کی کہ ان کا پیغام جمعیۃ علمار کے ذمہ داروں تک پہنچا دیا جائے۔ ہمارے ان بزرگ نے جن سے مولانا فرما رہے تھے، یہ جواب دیا کہ جمعیۃ علمار کے اور ذمہ داروں سے تو ان کا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے کہ وہ یقین کریں کہ یہ پیغام واقعی آپ نے بھیجا ہے، لیکن وہ مولانا سجادؒ صاحب سے کہہ سکتے ہیں۔ کوئی تحریر پہنچانے کی بات اس لئے نہیں ہوئی کہ مولانا عبیداللہ سندھی اس وقت تک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور تحریر لے جانے میں قانونی خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے بزرگ نے حج سے واپس آنے کے بعد مولانا سندھی کا یہ پیغام مولانا سجادؒ تک پہنچا دیا۔ انھوں نے برسبیل تذکرہ یہ

واقعہ ہم سے بھی کہا۔

جب کانگریس کی وزارتیں بنیں تو مولانا عبیداللہ سندھی کو ۲۵ برسوں کی جلاوطنی کے بعد اور ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد ہندوستان آنے کی اجازت ملی وہ گئے تو افغانستان تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ کابل کی بنیاد رکھی تھی جو ہندوستان سے باہر کانگریس کی پہلی شاخ تھی۔ انگریزوں کے باغی ہونے کی حیثیت سے یہ افغانستان میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے کیونکہ ان دنوں افغانستان اور انگریزوں کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ لیکن جب امان اللہ خاں انگریزی حکومت سے قریب ہو گئے اور نادر خاں کو جنھوں نے ٹھل کے میدان میں کمیونسٹ روس کے ہتھیاروں کی مدد سے انگریزوں کو شکست دی تھی سفیر بناکر باہر بھیج دیا گیا تو مولانا د۔۔۔ ے کہ شاید امان اللہ خاں ان کو انگریزوں کے حوالہ کردیں چنانچہ وہ ایک بنگالی نوجوان شیب ناتھ بنرجی کے ساتھ پیدل روس روانہ ہوگئے۔ اور خطرناک راستوں سے گزر کر روس پہنچ گئے۔ بقول مولانا سندھی ان دنوں ایم این رائے وہاں لینن کے بعد سب سے بڑے کیمونسٹ سمجھے جاتے تھے۔ مولانا نے شیب ناتھ بنرجی کی مدد سے کیمونسٹ لٹریچر کا مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کیمونزم میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا کی جن مشکلات کا حل کیمونزم میں پیش کیا گیا ہے وہ حل اسلام میں موجود ہے بشرطیکہ اس کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تاویلات کے ساتھ سمجھا جائے۔ مولانا وہاں سے اٹلی گئے اور وہاں انھوں نے فاشزم کا مطالعہ کیا۔ اس طرح دنیا کی دو بڑی تحریکوں کا جائے وقوع پر مطالعہ کر کے ترکی آئے اور مصطفےٰ کمال کے نظریوں کو سمجھا پھر مکہ ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ ہندوستان پہنچ کر انھوں نے فوراً بیان دیا کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہوں اور یہ کہ وہ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کی تاویلات کے مطابق قرآن کی حکومت چاہتے ہیں۔

میں انہی دنوں کلکتہ میں تھا جمعیۃ علماء صوبۂ بنگال کے اجلاس کی تیاریاں ہورہی تھیں ان تیاریوں میں میں پیش پیش تھا۔ میری تحریک پر صدارت کے لئے مولانا عبیداللہ سندھی کا نام منظور کیا گیا تھا اور ان کو اس کی اطلاع بھی دے دی گئی تھی۔ بنگال کی مسلم لیگ نے طے کیا تھا کہ وہ جمعیۃ علماء کا اجلاس کسی طرح نہیں ہونے دے گی۔ بنگال میں مسلم لیگ

ہی کی حکومت تھی۔ روزانہ مسلم لیگ کے جلوس نکلتے رہتے تھے۔ ایک رات قاری رحمت اللہ صاحب لکھنوی کے مطب میں جہاں جمعیۃ کا دفتر تھا ہم بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور مشورہ کر رہے تھے کہ مولانا کا استقبال کس طرح کیا جائے اور مسلم لیگ کی مزاحمت کا مقابلہ کیونکر ہو کہ ایک لڑکا باہر سے آیا اور کہا کہ ایک بوڑھے آدمی دہلی سے آئے ہیں اور ... رہے ہیں کہ دفتر سے کسی کو بلا دو میں کھانا چھوڑ کر اٹھا اور باہر آیا۔ وہ بوڑھے آدمی عبا بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا اور انھوں نے جواب دیتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا " عبید اللہ سندھی "

میں حیرت میں پڑ گیا۔ بلا اطلاع کیسے آ گئے۔ وہ بھی دو روز پہلے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ کئی دوستوں سے ملنا تھا اس لئے پہلے آ گیا ہوں۔ میں نے مولانا کو دفتر میں پہنچایا ٹیکسی ٹھیک کی پھر ان کو لے کر طیب بھائی ظریف کی قیام گاہ پر پہنچا دیا کہ انھیں کے یہاں قیام کا نظم تھا۔ مولانا نے ٹیکسی پر مجھ سے پوچھا آپ کلکتہ کے رہنے والے ہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا کہا کہ بہار کے ایک شہر گیا کا رہنے والا ہوں۔ بولے وہاں میرے ایک دوست رہتے ہیں آپ ان کو جانتے ہیں؟ مولانا نے نام بتاتے ہوئے جواب کا انتظار کیا۔ میں نے جواب دیا وہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی ہوتے ہیں اور میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ جانا ہے انھیں سے جانا ہے۔ یہ معلوم کر کے مولانا بہت خوش ہوئے اور جب تک کلکتہ میں رہے انھوں نے برابر مجھ کو اپنے ساتھ رکھا۔ میں مولانا کے ساتھ برابر بیس روز رہا۔ اس درمیان مجھ کو اطلاع ملی کہ والد صاحب چھت سے گر گئے ہیں اور ان کو ہماری خدمت کی ضرورت ہے اس لئے مولانا سے اجازت لے کر وطن چلا گیا۔ چلتے وقت مولانا نے کہا کچھ اور ٹھہر جاتے تو میں بھی ساتھ چلتا۔

طیب بھائی ظریف کے یہاں پہنچ کر مولانا نے دریافت کیا کہ یہاں میرے ایک شاگرد شائق احمد عثمانی رہتے ہیں۔ تم جانتے ہو؟ میں نے جواب دیا پورا کلکتہ جانتا ہے اور ہم جمعیۃ علماء کے خدام روزانہ ان سے گالیاں سنتے ہیں اور آج کل جمعیۃ علماء کے خلاف مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مولانا نے سمجھا کہ میں ان کو ملنے سے منع

کر رہا ہوں۔ میں نے یہ اندازہ کر کے کہا کہ میں آپ کو منع نہیں کر رہا ہوں اگرچہ میں ان کے یہاں نہیں جاتا ہوں۔ لیکن آپ جائیں گے تو آپ کو لے چلوں گا۔

مولانا دوسرے روز میرے ساتھ شائق احمد صاحب کے یہاں چلے وہ عصر جدید اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ دیوبند کے فارغ تھے، وہاں استاد بھی رہے تھے۔ مولانا کو کہا رکشا پر چلیں۔ بولے میں تو اس کو جائز نہیں سمجھتا ہوں۔ خیر چلو۔ کیا دور ہے؟ میں نے کہا دور نہیں ہے جلد پہنچ جائیں گے۔ غرض ہم دونوں عصر جدید کے دفتر پہنچے۔ شائق صاحب موجود نہیں تھے۔ اسٹاف نے مجھ کو حیرت کے ساتھ دیکھا، بہرحال میں یہ کہہ کر مولانا کو واپس لے آیا کہ شائق صاحب آجائیں تو ان کو کہنا مولانا عبیداللہ سندھی آئے تھے۔ شائق صاحب دفتر پہنچے اور ان کو معلوم ہوا تو وہ فوراً طیب بھائی ظریف کے یہاں آئے۔ مولانا سے مصافحہ کیا اور مؤدب بیٹھ گئے، مولانا نے ان کو گلے سے لگایا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کی خیریت پوچھتے رہے۔ شائق صاحب نے دوسرے روز مولانا کو اپنے یہاں بلایا اور ان کو مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری کے پاس لے گئے، شائق صاحب ڈاڑھی مونڈتے تھے، دھوتی پہنتے تھے مولویوں کی شکل وصورت نہیں تھی۔ شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ مولانا عبدالروف صاحب کی مولویانہ وضع قطع مولانا سندھی کو متاثر کرے گی اور وہ مولانا کو سمجھا سکیں گے۔

اس موقع پر بھی میں مولانا کے ساتھ تھا۔ مولانا عبدالروف صاحب نے کہا کہ آپ ۲۵ برس کے بعد ہندوستان آئے ہیں۔ آپ نے فوراً اپنی رائے ظاہر کردی۔ حالانکہ آپ کو چاہیئے تھا کہ پہلے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرتے پھر بیان دیتے۔ لیکن آپ نے جلد بازی سے کام لیا۔ مولانا نے کہا کہ میں نے ہندوستان کے بارے میں کوئی خاص بیان نہیں دیا ہے۔ میں نے ایسی بات کہی ہے جس کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے اور وہ کانگریس کے سوا کوئی دوسرا پلیٹ فارم نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت نہیں تو آپ ان کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ میں نے دوسری بات قرآن کی حکومت کے بارے میں کہی ہے کیا کوئی مسلمان ہے جو اس کو غلط کہے۔

مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری کے یہاں سے نکلے تو مولانا نے دریافت کیا کہ عبدالرحمٰن صدیقی یہاں رہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ دور ہے۔ پوچھا تم جانتے ہو؟ میں نے جواب دیا ہاں جانتا ہوں، ایک دفعہ جا چکا ہوں۔ عبدالرحمٰن صدیقی، محمد علی جوہر مرحوم کے اخبار کامریڈ میں کام کر چکے تھے۔ کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار نکالتے تھے۔ ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر ہو گئے تھے۔ بے لگام آدمی تھے اس لئے جناح صاحب ناخوش ہو گئے تھے۔ اور ان کو بعد میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں نہیں لیا تھا۔ مولانا نے اسی وقت چلنے کی خواہش کی چنانچہ ہم اسی وقت عبدالرحمٰن صدیقی کے یہاں پہنچے۔ ان کو معلوم ہوا تو باہر آکر انھوں نے مولانا کا استقبال کیا اور بہت تعظیم کے ساتھ اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کے بعد ہم لوگ چائے پینے بیٹھ گئے۔ میزبان مولانا عبدالرحمٰن صدیقی نے پوچھا کہ مولانا اس بار ہندوستان میں آپ کا خرچ کون برداشت کر رہا ہے؟ مولانا نے کہا کہ ابھی تک تو خان بہادر حافظ ہدایت اللہ سے روپے لئے ہیں۔ صدیقی صاحب نے کہا کہ وہ تو آپ کا پرانا اسامی ہے۔ جلا وطنی سے پہلے بھی وہ آپ کو خرچ دیتا تھا۔ اس کے بعد صدیقی صاحب نے پوچھا اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ میں اپنی پارٹی بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ صدیقی صاحب نے پوچھا مقصد کیا ہوگا؟ مولانا نے جواب دیا قرآن کی حکومت قائم کرنا شاہ ولی اللہ دہلوی کے اجتہاد کے مطابق۔ صدیقی صاحب نے پوچھا شاہ ولی اللہ کی کتابیں اردو میں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا نہیں عربی میں ہیں۔ صدیقی صاحب نے کہا میں تو عربی نہیں جانتا۔ مولانا نے کہا عربی پڑھو۔ اسلام کا نام لیتے ہو، مسلمانوں کے لیڈر بنتے ہو، اور عربی نہیں جانتے۔ اس گفتگو کے بعد ہم سب صدیقی صاحب کے یہاں سے رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے صدیقی صاحب نے سندھی زبان میں طیب بھائی کو کہا جو ہمارے ساتھ تھے کہ مولانا بہت قیمتی آدمی ہیں ان کو ضائع نہ کرنا۔

اب مولانا کے یہاں ملنے والوں کی بھیڑ آنے لگی۔ سب سے پہلے مولانا عبداللہ الباقی دیناج پور سے تشریف لائے۔ یہ بنگال کے اہل حدیث جماعت کے امیر تھے۔ اور فضل الحق صاحب

کے بعد یہ جا پارٹی کے صدر ہو گئے تھے، ذی علم آدمی تھے، ان کے ساتھ بہت لوگ تھے، ہمارے دوست معز الدین احمد صاحب بھی آئے جو آج کل تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے ایڈیٹر ہیں۔ روس کے جلاوطن عالم موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے ہوئے تھے وہ بھی پہنچ گئے۔ معز الدین صاحب نے پوچھا مولانا آپ کہتے ہیں قرآن کی حکومت قائم کریں گے۔ یہ بتائیے اس میں مزدوروں کے مشکلات کا کیا حل ہے؟ مولانا نے جواب میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" کے حوالے سے بطور تمہید ایسی باتیں کیں جو کمیونزم سے ملتی جلتی تھیں۔ مولانا عبد اللہ الباقی نے فوراً تردید کی اور کہا کہ "حجۃ" میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مولانا سندھی ناراض ہو گئے تو عبد اللہ الباقی نے کہا کہ میں آپ کا مخالف نہیں ہوں، میں آپ کے پاس عقیدت کے ساتھ آیا ہوں لیکن میں نے حجۃ بار بار پڑھی ہے اور اس میں ایسی کوئی بات میں نے نہیں پائی جو آپ فرما رہے ہیں۔ بولے "حجۃ اللہ البالغۃ" کہیں ملے تو لاؤ۔ طیب بھائی ظرافت کے پاس اس کا ایک ترجمہ تھا، وہ لے آئے۔ مولانا نے کہا یہ ترجمہ تو ٹھیک نہیں ہے، لیکن کام چلے گا۔ پھر مولانا نے اس حصہ کا ترجمہ پڑھ کر سنایا جس میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ دولت سمٹ کر جب چند لوگوں کے پاس آجاتی ہے تو اس سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں انھوں نے روسا دہلی کی مثال دی۔ اگر روسا دہلی کی جگہ قیصر کا نام لکھ دیا جاتا تو کارل مارکس کی ان تنقیدوں سے یہ ملتی جلتی چیز ہوتی جو اس نے سرمایہ داروں پر کی ہیں۔

مولانا عبد اللہ الباقی فوراً معترف ہوئے اور کہا کہ کتاب کے اس حصہ پر ان کی نظر نہیں تھی۔ مولانا سندھی نے کہا کہ کتاب کے اس حصہ پر جلاوطنی سے پہلے ان کو بھی نظر نہیں تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ اس کتاب کو دیوبند میں پڑھاتے تھے۔ اور اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اصل میں وہ اس حصہ کو سرسری طور پر پڑھ کر نکل جاتے تھے جب وہ روس گئے اور انھوں نے کمیونسٹوں کا لٹریچر ترجمہ کرا کے پڑھا تو ان کو خیال آیا کہ شاہ صاحب تو اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔

معز الدین صاحب نے دوسرا سوال کیا کہ اچھا آپ کی حکومت میں اپوزیشن پارٹی کو

کیا حقوق دیئے جائیں گے۔ مولانا نے کہا کہ جو حق دنیا اپوزیشن پارٹی کو دیتی ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ مثلاً روس میں اپوزیشن پارٹی کو کافی حقوق ہیں۔ مولانا نے جواباً سوال کیا کہ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا؟ پھر بولے میں وہاں رہ چکا ہوں وہاں اپوزیشن پارٹی کو کوئی حق نہیں اور یہ موسیٰ جار اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھیے ان کو تو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

مولانا سے ملنے کچھ سکھ آگئے۔ انھوں نے اپنے گردوارہ میں مولانا کو دعوت دی۔ مولانا نے دعوت قبول کر لی اور وقت معینہ پر وہ گردوارہ گئے، میں ساتھ تھا۔ میں اس سے پہلے کبھی کسی گردوارہ میں نہیں گیا تھا اس لئے دلچسپی سے سب چیزیں دیکھ رہا تھا۔ سیڑھیوں پر دو رویہ کرپان لئے سکھ کھڑے تھے، اندر ہال میں ایک گرو مچان پر بیٹھے ہوئے تھے، انکے پاس گرنتھ صاحب رکھی تھی جس کے برابر میں تلوار رکھی تھی۔ نیچے چٹائی پر بھی تلوار پڑی تھی، سکھ آتے اور چٹائی پر پیسے پھینکتے جاتے تھے۔ میں مولانا کے ساتھ مچان کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ایک سکھ نے تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا سکھ کے بچے ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ سکھ کے ایک بچے نے لک کے لئے وہ قربانی دی ہے جسکی نظیر دوسری جگہ نہیں ملے گی یا ملے گی تو بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد مولانا کھڑے ہوئے۔ مولانا نے کہا کوئی شک نہیں میری رگوں میں سکھ خون دوڑ رہا ہے میرے ماں باپ سکھ تھے، جب میں مسلمان ہوا تو اپنی ماں کو میں نے چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ کافرہ تھی۔ پھر میرے استاد مولانا محمود الحسن نے مجھ کو بتایا کہ ماں کی خدمت کرنا فرض ہے۔ وہ کافرہ ہو تب بھی۔ اس کے بعد میں اس کو لے آیا اور اس کو اپنے پاس رکھے رہا"

مولانا نے آگے چل کر کہا کہ "میں مسلمان اس لئے ہوا کہ میرے خیال میں اسلام میرے لئے اور سکھ قوم کے لئے مفید ہے۔ میں سکھ بھائیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسلام کا مطالعہ کریں اور اگر وہ میری رائے سے متفق ہوں کہ یہ مذہب سکھ قوم کے لئے مفید ہے تو اس کو قبول کریں"۔ مولانا نے سکھوں کو دین کی دعوت دی۔ اصل چیز دعوت کا جذبہ ہے۔ اگر جذبہ نہ ہو تو انسان بہترین مواقع کے باوجود دعوتی کام نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ہم واپس آئے اور سکھوں نے بہت گرم جوشی سے مولانا کو رخصت کیا۔

ایک روز مولانا سے ملنے سبھاش چندر بوس آگئے۔ میں نے سنا تو جلدی سے باہر

آیا اور سبھاش بوس سے کہا کہ مولانا بہت جلد ناراض ہوجاتے ہیں، اس لئے ان سے کوئی بحث نہ کی جائے۔ سبھاش بوس نے کہا کہ وہ تو صرف نذرانۂ عقیدت پیش کرنے آئے ہیں۔ کسی سیاسی مقصد سے نہیں آئے۔ مولانا نے جس طرح مصیبتیں اٹھائی ہیں اگر کوئی اور ہوتا تو پاگل ہوجاتا، وہ تو صرف زود رنج ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد سبھاش بوس مولانا کے پاس پہنچے۔ پہلے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جو برہمنوں نے چھوت چھات سے بچنے کے لئے ایجاد کیا تھا اور اب وہ سلام کا ایک طریقہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد بوس نے مولانا کے پاؤں چھوئے، پھر ہار پہنایا اور آخر میں پھلوں کا ایک ٹوکرا پیش کیا۔ مولانا نے ہار پہنتے ہوئے کہا کہ ہار تو نوجوانوں کی چیز ہے مجھ سے زیادہ آپ کو زیب دے گی۔ اس کے بعد دونوں بیٹھ گئے۔

مولانا نے دریافت کیا "آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

سبھاش بوس بولے "فارورڈ بلاک کے نام سے ایک پارٹی بنا رہا ہوں"

مولانا نے کہا "میں بھی ایک پارٹی بنانے والا ہوں" اس کے بعد مولانا اس کے اغراض ومقاصد بتانے لگے۔ سبھاش بوس نے خاموشی سے سنا اور آخر میں وہ سلام کرکے واپس ہوئے۔

جمعیۃ کے اجلاس کے بعد سبھاش چندر بوس نے مولانا کے اعزاز میں اپنے یہاں بہت بڑی دعوت کی۔ میں اس میں شریک نہ تھا، وطن چلا گیا تھا۔

مولانا نے جمعیۃ علماء کے لئے اپنا خطبہ لکھا تھا اور مولانا آزاد کے سکریٹری اجمل خاں سے اس کا ترجمہ بھی کرالیا تھا، لیکن اور کسی کو دکھانے کو تیار نہ تھے۔ طباعت کے لئے بھی نہیں دے رہے تھے۔ دوسرے روز اجلاس تھا۔ شام تک انھوں نے اپنا خطبہ نہیں دیا۔ آخر میں نے عرض کیا "حضرت! کیا خطبہ نہیں چھپے گا؟" بولے "خطبہ پڑھ لینے کے بعد" میں نے کہا تب تو اخبارات میں اشاعت میں بہت دیر ہوجائے گی" مولانا نے کہا "میں پہلے نہیں دوں گا۔ اگر پہلے دیا تو تم لوگ یہ خطبہ پڑھنے نہیں دوگے" میں نے مولانا سے بار بار وعدہ کیا کہ اجلاس سے پہلے یہ خطبہ کسی کو دیکھنے نہیں دیں گے۔ بار بار وعدہ کرنے پر مولانا نے اپنا خطبہ دے دیا۔ اب ایک رات میں خطبہ کی کتابت اور طباعت بھی ایک مسئلہ تھا۔ دس بجے رات کو مولانا نے مسودہ دیا تھا۔ اس قدر جلد کوئی بھی چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ اس میں اور بھی دیر ہوگئی۔ بہرحال ایک جنت

ملے جنھوں نے رات بھر جاگ کر یہ فرض انجام دیا۔ کتابت اور چھپائی تو بہت خراب ہوئی بہرحال خطبہ چھپ گیا۔

دوسرے روز جلسہ کا وقت ہوا میں مولانا کو لے کر اجلاس کی طرف جارہا تھا کچھ لوگوں نے اشارہ سے روکا اور بتایا کہ مسلم لیگی اندر اجلاس میں گھس گئے ہیں اور شور مچارہے ہیں۔ اس لئے مولانا کو لے جانا مناسب نہیں۔ میں نے مولانا کو واپس کردیا اور خود اجلاس کی جگہ پہنچا، دیکھا کچھ بدمعاش اوپر گیلری میں گھس آئے ہیں اور شور مچارہے ہیں، نیچے اجلاس میں نہیں آسکے ہیں۔ پولیس کی ایک فورس البتہ آگئی ہے۔ پہلے تو ایس۔ پی سے میری جھڑپ ہوئی اور میں نے بلاٹکٹ پولیس کے داخلہ پر سخت اعتراض کیا، اس کے بعد آگے بڑھا۔ ہمارے دوست معزالدین صاحب ہم سے پہلے آگئے تھے۔ انھوں نے پوچھا اب کیا کیا جائے؟ میں نے جواب دیا مخالفین گیلری میں ہیں، نیچے ہم ہیں۔ دروازہ بند کردیا جائے کہ وہ نہ آسکیں اوپر پانی بھی نہیں ہے، گرمی کا زمانہ ہے چلاکر بہت جلد تھک جائیں گے۔ بس ابھی ان کو خاموش نہ ہونے دیا جائے معزالدین صاحب کو یہ رائے پسند آئی میں اور وہ باری باری سے دھیمی آواز میں لاؤڈاسپیکر پر اپیل کرتے رہے۔ ایس پی ہماری اس تدبیر کو سمجھ گیا۔

ان دنوں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں مسلم لیگ نے طے کیا تھا کہ کسی طرح بھی اجلاس نہ ہونے دے گی۔ اس لئے پولس جیسا کہ اس کے رویہ سے پتہ چلتا تھا ہدایت دے کر بھیجی گئی تھی، چنانچہ ایس پی لاوڈاسپیکر کے پاس آیا اور اس نے اعلان کیا کہ وہ اس اجلاس کو خلاف قانون قرار دیتا ہے۔

اب ہمارے سامنے سوال تھا کہ اجلاس کرنے پر اصرار کریں اور جیل جائیں اور اجلاس نہ کرنے کا اعلان کریں اور ناکامی کو قبول کریں۔ ہم نے رائے کی کہ شام کو دوسری جگہ بیٹھ کر اس معاملے کو طے کریں گے۔ چنانچہ ہم نے اعلان کیا کہ تمام کارکن حاجی اللہ بخش کے مکان پر جمع ہوجائیں۔ اب ایس پی کا اصرار تھا کہ ہم فوراً جلسہ گاہ چھوڑدیں۔ اس موقع پر مولانا حسین احمد صاحبؒ اور جمعیۃ علماء کے سب اکابر آگئے تھے۔ سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ جب تک مخالفین نہیں جاتے ہیں ہم جلسہ گاہ نہیں چھوڑسکتے۔ گرفتار کرنا ہے تو گرفتار کرو۔

ہماری ضد دیکھ کر ایس پی مسلم لیگیوں کے پاس گیا اور کہا کہ جلسہ تو ختم ہوگیا اب تم جاؤ چنانچہ وہ سب چلے گئے۔

اس کے بعد ہم حاجی اللہ بخش کے یہاں جمع ہوئے، مولانا منیر الزماں صاحب بہت مایوس تھے۔ انھوں نے کہا مسلم لیگ اجلاس نہیں ہونے دے گی، اس لئے اب دوسرے روز اجلاس کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔ میں نے کہا اجلاس ضرور ہونا چاہیئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو میری بات سن کر تقویت ہوئی اور انھوں نے کہا کہ اگر آپ کو اس آسانی سے شکست قبول کرنی تھی تو ہم سب کو بلانا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اتنے میں اشرف الدین چودھری جو بنگال کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے آ گئے۔ انھوں نے کہا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ دوسرے روز اجلاس ضرور کیا جائے۔ بہر حال یہ طے پایا کہ اجلاس ہو۔ پرانے ٹکٹ منسوخ کر دیئے جائیں۔ نئے ٹکٹ تیار کرنے اور ان کو تقسیم کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ میں نے بعض دوستوں کی مدد سے ٹکٹ تیار کیا اور اس طرح تقسیم کیا کہ ایک مسلم لیگی کو بھی جو شور مچانا چاہتا تھا ٹکٹ نہ مل سکا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو پروفیسر عبد الرحیم صاحب نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اور مولانا عبید اللہ سندھی نے خطبۂ صدارت۔

مولانا نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ:

۱۔ مسلمان گھٹنے سے نیچے تک کے نیکر پہنیں اور پہن کر نماز پڑھیں۔
۲۔ جمعیۃ کے دو شعبے ہوں، ایک عملی اور دوسرا علمی و تحقیقی۔
۳۔ ہم کو چاہیئے کہ یورپ کا مقابلہ کرنے کے لئے یورپ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

تیسرا نمبر کسی طرح قابل اعتراض نہیں تھا لیکن اجمل خاں نے اپنے ترجمہ میں "سمجھنے" کے لئے "فولو" FOLLOW کا لفظ استعمال کیا تھا، جس کے معنی سمجھنے کے بھی ہیں۔ اور اتباع اور پیروی کے بھی۔ انگریزی نسخہ انگریزی اخبارات کو دیا گیا تھا۔ اور اردو نسخہ سے پہلے ہی ہندوستان کے طول و عرض میں پہنچ گیا تھا۔ اردو اخبارات نے اس کا ترجمہ پیروی کرنا کیا تھا۔ اس طرح مذہبی حلقے میں مولانا تنقید کے نشانہ بنے۔

پہلے نمبر پر مولانا حسین احمدؒ صاحب نے اجلاس ہی میں مولانا سندھی کو ٹوکا تھا جب

کہ وہ خطبہ پڑھ چکے تھے۔

مولانا سندھی اجلاس کے بعد مولانا آزاد سے ملے اور تین روز تک مسلسل ملتے رہے پہلے روز ہم تین آدمی تھے۔ میں، ڈاکٹر منظور احمد مرحوم سابق ایم ایل اے بہار اور طیب بھائی ظریف لیکن مولانا آزاد نے خواہش کی کہ وہ تنہائی میں بات کریں گے۔ اس لئے ہم بعد میں ساتھ نہیں رہے۔

میں نے ایک روز مولانا عبید اللہ سندھی سے خواہش کی کہ تبرکاً مجھ کو قرآن کی کچھ آیتیں پڑھادی جائیں۔ غالباً اس وقت مولانا حامد عثمانی دیوبندی بھی موجود تھے۔ اور انھیں کی تحریک پر میں نے یہ خواہش کی تھی۔ مولانا نے سورہ نون پڑھائی اور کہا کہ اس میں بھی معاشیات کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ "ن" کے پچاس عدد ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے لے کر پچاس سال بعد تک کی مدت کی طرف اشارہ ہو۔ مولانا نے کہا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں سیاسیات اور معاشیات پر کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ جب نماز کے لئے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل موجود ہے تو کیسے ممکن ہے کہ سیاسیات اور معاشیات پر کچھ نہ ہو۔

مولانا نے ایک روز کہا کہ "مجھ کو اب جو تجربہ ہوا ہے اگر یہ تجربہ جلاوطنی سے پہلے حاصل ہوتا تو میں انگریزوں سے لڑائی کرنے میں جلدی نہ کرتا کیونکہ ہندوستان میں ابھی کرنے کے اتنے کام ہیں کہ ان سے پہلے نپٹ لینا ضروری تھا۔

مولانا نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان نے ہندو عہد سے لے کر اس وقت تک ترقی ہی کی ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں بھی ترقی ہوئی ہے لیکن انگریزوں نے چونکہ اس کو اپنا وطن نہیں بنایا اس لئے ہم ان کو ہندوستانی نہیں سمجھ سکے، نہ ان پر ہندوستان کو ترقی دینے کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا نمبر آتا ہے جنھوں نے اس کو اپنا وطن بنایا۔ اور ہندو عہد کے مقابلہ میں ان کا عہد زیادہ جدید ہے۔ انھوں نے ملک کو زیادہ وسیع بھی بنایا ہے اس لئے یہی اعلیٰ درجہ کے ہندوستانی ہیں۔ اور انھیں پر ملک کو ترقی دینے کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ افسوس کہ نہ مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو محسوس

کیا اور صرف آزادی کے بعد مسلم دشمن فرقہ پرستوں نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ وہ ہر تھوڑے عرصہ پر فسادات کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہوا کہ جو آزادی کی جنگ میں شریک نہیں تھے وہ بھیک کے ٹکڑوں سے خوش ہیں اور جو آزادی کے لئے لڑے وہ مال غنیمت کی تلاش میں ہیں۔ مولانا آزاد کی اس اپیل کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا کہ جدید ہندوستان کی تعمیر کے نقشے تمہارے بغیر نامکمل رہیں گے۔'

مولانا حامد عثمانی صاحب نے دریافت کیا کہ مولانا نے قرآن کی کوئی تفسیر لکھی ہے یا نہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ "لکھی تو نہیں، لیکن میں نے قرآن کا جو درس مکہ میں دیا وہ مکمل طور پر موسیٰ جار اللہ نے قلم بند کر لیا ہے اور ان کے پاس محفوظ ہے" مولانا کے انتقال کے بعد موسیٰ جار اللہ کا ایک مضمون رسالہ "جامعہ" میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ مولانا کی مکمل تفسیر ان کے پاس محفوظ ہے کوئی ادارہ اگر شائع کرنا چاہے تو وہ یہ نسخہ دے دیں گے۔

مولانا نے ایک روز کہا کہ "مولانا حسین احمد ہمارے پارٹی لیڈر ہیں ان سے ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ہم ان کے خلاف نہیں کر سکتے" انھوں نے یہ بھی کہا کہ ذہانت اور طباعی میں تو دعویٰ نہیں کرتا لیکن تقویٰ، دینداری، عبادت اور استاذ کی خدمت میں ہم میں کوئی بھی مولانا حسین احمد صاحب کا ہمسر اس وقت بھی نہیں تھا جب وہ طالب علم تھے۔

خان بہادر عبدالکریم نے بھی اپنے یہاں مولانا کی دعوت کی۔ یہ نام کے خان بہادر تھے حکومت نواز نہ تھے۔ شاید بنگال کے ماحول نے ان کو متاثر کر دیا تھا، جہاں انگریزوں کے خلاف گرم گرم ہوائیں چلتی رہتی تھیں۔ یہ بہت بوڑھے تھے جب "راجندر پرشاد ٹی کے گھوش اسکول پٹنہ کے طالب علم تھے تو یہ پورے بنگال و بہار کے انسپکٹر آف اسکول تھے۔ شاید اسی زمانہ میں ان کو خان بہادر کا خطاب ملا ہوگا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد نیشنلسٹ حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اسی کی وجہ سے بنگال میں دو مسلم لیگ ہو گئی تھی۔ ایک کی قیادت یہ کر رہے تھے اور دوسرے کی سر ناظم الدین۔ اس دوسری مسلم لیگ کو جناح صاحب نے تسلیم کیا

تھا۔ خان بہادر نے اسلام پر انگریزی میں کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو انھوں نے مجھ کو دی تھیں۔ پروفیسر عبدالرحیم انہی کے صاحبزادے تھے۔

خان بہادر کے یہاں مولانا دیر تک بیٹھے اور اسلامی نظریہ سلطنت پر دیر تک بولتے رہے۔ خان بہادر ہاں ہاں کر رہے تھے۔ مولانا کو یہ ہاں ہاں کہنا پسند نہیں آیا۔ ناراض ہوکر بولے اسلامی سلطنت میں آپ کی یہ شان و شوکت نہیں رہے گی۔ صوفاسٹ نہیں رہے گا۔ چٹائی پر بیٹھ کر خلق خدا کی خدمت کرنی پڑے گی۔

مولانا فقہ حنفی اور تصوف کے بڑے حامی تھے۔ کہتے تھے یہ ہم عجمیوں کے مزاج اور ضرورت کے مطابق ہیں۔ تصوف کے بارے میں کہتے اس سے پیدائشی مسلمان اصلی مسلمان کی طرح ہو جاتا ہے۔ فرماتے مجھ کو دیکھو، میں نو مسلم ہوں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میں نو مسلم ہوں میں ایسے مسلمان کی طرح معلوم ہوتا ہوں جو کسی مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہو، اور یہ تصوف کی برکت ہے۔"

مولانا کلکتہ سے تشریف لے گئے تو پھر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مولانا نے جامعہ ملیہ میں قیام کیا اور بیت الحکمت کی بنیاد رکھی، تو میرے بڑے بھائی شاہ علیٰ صاحب مرحوم ان دنوں جامعہ میں تھے ان سے حالات سنتا تھا۔ مولانا نے سندھ ساگر اکادمی بنائی، جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی بنائی۔ مولانا پر اور ان کے نظریوں پر جو کتابیں شائع ہوئیں وہ سب میں نے پڑھیں، ان کی مخالفت میں جو کچھ لوگوں نے لکھا اس سے میں اتفاق نہیں کر سکا۔ بس مولانا حسین احمد صاحبؒ کا محاکمہ پسند آیا جس میں مولانا کی عظمت بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ان کی جو باتیں کتاب و سنت کے مطابق معلوم ہوں ان کو لوگ قبول کریں۔

نئی نسل میرا یہ مضمون پڑھ کر جاننا چاہے گی کہ مولانا عبیداللہ سندھی کیوں جلاوطن ہوئے تھے اس لئے ان کی جلاوطنی سے پہلے کا تھوڑا سا حال لکھ دیتا ہوں۔

دیوبند کے فارغ اور وہاں کے صدر مدرس مولانا محمود الحسن عثمانی دیوبندی انگریزی اقتدار کے ہندوستان میں سخت خلاف تھے وہ انگریزوں کو مسلمانوں کا اور اسلام

کا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں میں الحاد و بے دینی انگریزوں کے سبب سے تھی۔ اور ہندوستان پر قبضہ رکھنے کے لیے وہ سارے عالم اسلام کو اپنے قلمرو میں شامل کر رہے تھے۔ مولانا کے اس خیال کا اثر مولانا کے شاگردوں پر بھی پڑا۔ مولانا کے ایک شاگرد مولانا حسین احمدؒ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تھے۔ ہندوستان میں جو شاگرد تھے۔ اور ماشاءاللہ سب کے سب علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے ان میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سب سے زیادہ سرگرم اور متحرک تھے۔

مولانا محمود الحسن کا خیال تھا کہ ہندوستان کی جو سیاسی اور جغرافیائی پوزیشن ہے اور مسلمانوں کی آبادی جسطرح ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے مسلمانوں کو چاہئیے کہ انقلاب کی ہر کوشش میں ہندوؤں کو ساتھ لیں اور کسی سیاسی جدو جہد کی ذمہ داری تنہا اپنے کندھوں پر نہ رکھیں۔ مولانا کے اس نظریے کے مطابق ان کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی نے ہندوستان میں انقلابی قومی حکومت کا نقشہ تیار کیا۔ راجہ مہندر پرتاپ کو اس حکومت کا صدر، مولانا برکت اللہ بھوپالی کو وزیر اعظم، مولانا محمود الحسن کو وزیر دفاع اور مولانا عبیداللہ سندھی و مولانا محمد میاں منصور انصاری کو وزیر داخلہ وخارجہ کے عہدے دیئے گئے

مولانا عبیداللہ سندھی چاہتے تھے کہ انقلاب کے لئے قائدین تیار کریں، اس غرض سے انھوں نے ایک مدرسہ دہلی میں کھولا تھا لیکن مولانا محمود الحسنؒ نے ان کو افغانستان بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی حکومت کی حمایت حاصل کریں، لیکن اس بارے میں ایک روایت اور بھی ہے، ہمارے ایک عزیز نے جو ان دنوں مولانا آزاد کے معتمد لوگوں میں تھے مجھ سے کہا تھا کہ انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کو دہلی میں مولانا آزاد کا یہ پیغام پہنچایا تھا کہ انکی گرفتاری کی تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ بھاگ جائیں۔ یہ بیان قرین قیاس اس لئے بھی معلوم ہوا کہ مولانا عبیداللہ سندھی دہلی سے بھاگ کر کچھ عرصہ سندھ کے دیہاتوں میں روپوش رہے۔ بہرحال مولانا افغانستان پہنچ گئے اور مولانا محمود الحسنؒ کے بنائے ہوئے نقشہ پر کام کرتے رہے اس کے بعد ڈاکٹر انصاری مرحوم نے جو بہت بڑے ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ایسی

سہولتیں رکھتے تھے کہ حکومت برطانیہ کے خفیہ عزائم کا پتہ چلالیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو کہا کہ وہ اگر ہندوستان سے جلد باہر نہیں نکل گئے تو گرفتار کرلئے جائیں گے۔ چنانچہ شیخ الہند نے حجاز کے سفر کا عزم کیا۔ ان کی روانگی کے انتظامات بھی ڈاکٹر انصاری ہی نے کئے اور جب حکومت کو اطلاع مل گئی کہ وہ بمبئی سے روانہ ہو گئے ہیں تو اس نے عدن ہدایت بھیجی کہ ان کو آگے بڑھنے نہ دیا جائے اور گرفتار کرلیا جائے، لیکن ڈاکٹر انصاری کی پیروی کی بدولت حکومت ہند کی ہدایت عدن دیر میں پہنچی اور شیخ الہند مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ انھوں نے وہاں ایک سال سے زیادہ قیام کیا۔ اور ترکی حکومت کی تائید حاصل کی۔ ڈاکٹر انصاری نے مدینہ منورہ کے قیام کے اخراجات کے لئے بڑی رقم شیخ الہند کو ان کے عزیز کی معرفت بھیجی

شیخ الہند چاہتے تھے کہ وہ مالا بالا صوبہ سرحد میں آزاد قبائل تک پہنچ جائیں اور ان کی فوج تیار کرکے ہندوستان پر حملہ کریں لیکن ان کو راستہ نہیں ملا۔ اور شریف حسین نے گرفتار کرکے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالہ کردیا۔ راجہ مہندر پرتاب اور برکت اللہ بھوپالی جاپان، جرمنی، افغانستان وغیرہ اس وقت تک گھومتے رہے اور انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے جب تک کہ امریکہ کی مدد سے انگریزوں نے ترکوں اور جرمنی کو کامل شکست نہ دے دی۔ مولانا آزاد ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں تینوں شیخ الہند کی ان کوششوں میں ان کے معاون اور ہمدرد رہتے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے افغانستان میں انٹرنیشنل کانگریس کی شاخ قائم کی تو اس وقت ڈاکٹر انصاری انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے اور انھیں کی تحریک سے گیا کانگریس میں افغانستان کی کانگریس کا الحاق منظور کیا گیا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آزاد قبائل کے دو گروہ کو شیخ الہند کی خواہش پر خان عبدالغفار خاں اور حاجی ترنگ زئی نے متحد کردیا تھا۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد

مولانا پر دو کتابیں ایک محاسن سجاد مرتبہ مولانا ابوالعالم ندوی اور دوسری حیات سجاد مرتبہ مولانا عبدالصمد رحمانی شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے مولانا کی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ امارت مرتبہ مولانا عبدالصمد رحمانی سے مزید حالات معلوم ہو سکتے ہیں یہاں ارادہ مولانا کا صرف سرسری تذکرہ کرنے کا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مولانا کو کب سے جانا۔ مولانا کے تعلقات میرے خاندان والوں سے اپنوں کی طرح تھے۔ وہ مولانا سے محبت کرتے تھے اور مولانا ان سے۔ میرا مکتب بھی مولانا نے کیا تھا۔ اس محبت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مولانا سجادؒ کو معلوم ہوا کہ راقم الحروف کے ایک بزرگ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور کوئی علاج کامیاب نہیں ہے تو اپنے بنگالی شاگردوں سے پوچھا کہ ان میں کوئی سانپ کا جھاڑ جانتا ہے۔ بنگالیوں نے کہا کہ وہ جانتے ہیں اور اگر ناک سے خون نہیں گرا ہے تو امید ہے کہ وہ اچھے ہو جائیں گے۔ مولانا ان کو لے کر دیہات آئے جہاں راقم الحروف کے یہ بزرگ مقیم تھے لیکن اس سے پہلے ان کو مردہ سمجھ کر دفن کیا جا چکا تھا۔ بنگالیوں نے پھر کہا کہ اگر ناک سے خون نہیں گرا ہے تو وہ اچھے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے قبر کھلوا کر لاش نکلوائی لیکن جب میت کو بٹھانے کی کوشش کی گئی تو ناک سے خون آ گیا۔ بنگالیوں نے کہا کہ اب ان کا انتقال ہو گیا۔

میں جب مدرسہ انوار العلوم میں داخل کیا گیا تو اس وقت تک مولانا نے انوار العلوم سے کچھ تعلق باقی رکھا تھا اور ہر ماہ کا کچھ حصہ وہ مدرسہ میں گزارتے تھے۔ وہاں مجھ کو مولانا کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ گیا کے دوران قیام میں مدرسہ کے سالانہ جلسے میں نے کبھی نہیں چھوڑے جس میں مولانا کے علاوہ مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی اور مولانا نثار احمد کانپوری کی تقریریں سنتا تھا۔ مولانا احمد سعید صاحب کی تقریروں سے مجھ کو کافی فائدہ بھی پہنچا اور میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا علماء سے میری واقفیت

اور تعلقات کا آغاز اسی عہد میں ہوگیا تھا۔

نقیب۔ اخبار بھی میرے نام برابر آتا تھا۔ اس سے بھی مولانا کا کچھ حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ والد کی مجلس میں سیاسی تبصرے ہوتے تو جمعیۃ علماء، اور بالخصوص مولانا کی پرزور حمایت کی جاتی مولانا محمد علی جوہر سے جمعیۃ والوں کا اختلاف ہوا تو میرا خاندان جمعیۃ علماء کے ساتھ تھا کیونکہ مولانا سجاد جمعیۃ علماء کے ستونوں میں ایک ستون تھے۔ قاضی احمد حسین صاحب بیمار ہوکر گیا آئے اور چند ماہ شہر میں رہے تو میں روزانہ ان کے پاس جاتا تھا۔ دیکھتا تھا کہ مولانا قاضی صاحب سے مشورہ کے لئے ہر ہفتہ آتے تھے۔ مولانا سجاد سے میرے تعلقات اس طرح بڑھتے رہے۔

مولانا بہار شریف کے ایک گاؤں پنہسہ کے رہنے والے تھے، لیکن تعلیم بہار شریف اور الہ آباد میں پائی۔ الہ آباد سے پہلے دیوبند بھی گئے تھے، لیکن بعض طلبہ کے ساتھ کچھ ناگوار واقعات کی وجہ سے قیام نہ کرسکے اور الہ آباد چلے آئے۔ ہر دور میں طلبہ کا ایک طبقہ شرارت پسند ہوتا ہے۔ الہ آباد کے مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد بہار شریف اور الہ آباد میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد گیا آئے اور میری پھوپھی کنیز فاطمہؒ نے جو سرکار عالیہ کہلاتی تھیں اور نیک کاموں میں دل کھول کر مدد کرتی تھیں ایک بڑی رقم مولانا کو گیا میں مدرسہ کھولنے کو دی اور مولانا نے ان کے داماد کے نام پر کہ ان کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی انوار العلوم کے نام سے شہر میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

مولانا نے ایک مدرسہ کھول دیا کیونکہ شہر میں اعلیٰ دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ لیکن مولانا آزاد کے الہلال کی تحریریں پڑھ پڑھ کر مولانا میں بے چینی بڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ علمائے دین کو منظم کیا جائے، پھر ان کی مدد سے کسی عالم دین کے ماتحت مسلمانانِ ہند کو۔ مسلمانوں کا اتحاد شریعت کا حکم ہے اور اتحاد کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ترکی خلافت پر برطانیہ اور امریکہ اور روس و یونان و اٹلی کے متحدہ یلغار سے مسلمانان ہند میں بے چینی تھی۔ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں نے اس بے چینی کو اور بڑھا دیا تھا مولانا سجادؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مشیر حسین قدوائی نے لندن سے خط لکھا تھا کہ مسلمانان ہند خلافت کمیٹی کے نام سے ایک کل ہند مجلس بنالیں اور پھر ان کی طرف سے حکومت برطانیہ کو مخاطب

کریں تو شاید کوئی اثر ہو۔ اس بنا پر مولانا سجادؒ اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے مل کر خلافت کمیٹی قائم کرنے کی کوشش کی اور جب خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آگیا اور مولانا محمد علی جوہر نے اس کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی تو مولانا سجاد اس کے فعال رکن رہے لیکن مولانا کو تو جمعیۃ علمار کے قیام کی فکر تھی۔

مولانا محمد علی مونگیری وغیرہ نے کانپور کے اجلاس کے بعد ندوۃ العلمار کے نام سے انجمن قائم کی تھی۔ اس کی طرف سے دار العلوم کے نام سے مدرسہ کا قیام بھی عمل میں آیا تھا جو علامہ شبلی کی نظامت میں تھا۔ بنگال میں مولانا منیر الزماں اسلام آبادی نے انجمن علمار کے نام سے ادارہ قائم کیا تھا جو صوبائی سطح پر تھا۔ اول الذکر ادارہ علمی قسم کا تھا اور ثانی الذکر تبلیغی مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔ مولانا کا مقصد اولاً سیاسی تھا اور اس کے علاوہ اور بھی مسلمانوں کے جو مسائل ہوں ان کے لئے مولانا نے پورے ہندوستان میں قابل ذکر علمار سے اس سلسلہ میں ملاقات کی۔ اور انکو جمعیۃ علمار کے قیام پر آمادہ کرنا چاہا۔ ایک علمی انجمن اور دوسری تبلیغی انجمن پہلے وجود میں آچکی تھی مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے ان کی پرزور حمایت کی اور لوگوں کو اس کے لئے دعوت دی۔ لیکن بہت سے علمار کو یہ قابل عمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مولانا سجادؒ نے بہار کے علمار کو جمع کر کے جمعیۃ علمار بہار قائم کی۔ اس کے بعد مولانا ثنا اللہ امرتسری نے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بھی شاگرد تھے لیکن جماعت اہل حدیث کے لیڈر رہتے چند علمار کو اپنے یہاں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مدعو کیا دعوت نامہ پر مولانا سجادؒ نے اپنا نام دینے کی اجازت دی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہوسکے لیکن انھوں نے اپنے شاگرد اور معتمد مولانا عبد الحکیم ناظم مدرسہ انوار العلوم کو اپنی نمائندگی کے لئے اس جلسہ میں بھیج دیا تھا۔

چنانچہ جمعیۃ علمار ہند کا قیام یہاں عمل میں آیا۔ اور مفتی کفایت اللہؒ صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم مقرر ہوئے۔ اس وقت سے مرتے دم تک مولانا سجادؒ اس کے فعال رکن اور اہم ستونوں میں ایک ستون رہے۔ آخر عمر میں جب مولانا احمد سعید صاحب نظامت سے علیحدہ ہوئے تو یہ اس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور تذکرہ کے نام سے جمعیۃ علمار کی تاریخ اور اس کی ضرورت پر ایک رسالہ لکھا جس میں علمار کی اس جد وجہد کو شاہ ولی اللہؒ کی جد وجہد کی ایک کڑی قرار دیا۔ اب مولانا کا دوسرا قدم امارت شرعیہ کے لئے اٹھا۔ مولانا نے جمعیۃ علمار ہند کی

طرح کل ہند امارت شرعیہ کے قیام کی کوشش کی اور جس طرح ان کو جمعیۃ علمار بہار قائم کرنی پڑی۔
اسی طرح ان کو پہلے امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کا نظام قائم کرنا پڑا۔ گویا مولانا ابوالمحاسن سجاد جمعیۃ علمار
اور امارت شرعیہ دونوں کے بانی ہیں، یعنی ان ہی کی فکر کی بنیاد پر دونوں جماعتوں کا ظہور ہوا۔ مولانا کا
بنیادی مقصد دین کے تحت مسلمانوں کو منظم کرنا تھا۔ ویسے مفتی کفایت اللہ صاحب مولانا عبدالباری فرنگی محلی
اور مولانا ثنار اللہ امرتسری وغیرہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے جمعیۃ علمار ہند قائم کی۔
مولانا نے اپنے مکتوب میں جو تاریخ امارت شرعیہ عبدالصمد رحمانی میں منقول ہے لکھا ہے کہ جمعیۃ علمار بہار قائم
ہو جانے کے بعد جمعیۃ علمار ہند کے قیام کیلئے راہیں ہموار ہوئیں اسی طرح امارت شرعیہ بہار کے قیام کے بعد انشار اللہ
امارت شرعیہ ہندیہ کے لئے راہیں ہموار ہو نگی۔ امارت ابھی کل ہند پیمانے پر قائم نہیں ہو سکی
ہے۔ لیکن مختلف ریاستوں میں اس کی ضرورت اور اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔

مولانا آزاد مسلمانوں کی ایک انقلابی جماعت بنانا چاہتے تھے اس کے لئے لوگوں کی تلاش
کا کام مولانا نے چند اصحاب کے ذمہ کیا تھا۔ انہی میں قاضی احمد حسین صاحب بھی تھے۔ قاضی صاحب کی
گفتگو مولانا سجاد صاحب سے ہوئی۔ مولانا نے کہا کہ مسلمانوں کی تنظیم امارت شرعیہ کے نام سے کی
جائے اور اس کے ذریعہ سے انقلاب لایا جائے قاضی صاحب نے یہ بات مولانا آزاد تک پہنچا دی جن
کو یہ اسکیم مناسب معلوم ہوئی۔ چنانچہ جب کل ہند امارت شرعیہ نہ بن سکی تو بہار کے علمار اور زعمار
کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا۔ اور مولانا شاہ بدرالدینؒ امیر شریعت اور مولانا سجادؒ
نائب امیر شریعت مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ بہار میں امارت شرعیہ مسلمانوں کا ایک مضبوط ادارہ بن گیا۔
اس کی مقبولیت میں سب سے بڑا ہاتھ امیر شریعت اول اور ان کے بڑے صاحبزادے مولانا شاہ
محی الدینؒ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا تھا۔ مولانا کے حسن تدبیر جوش عمل اخلاص وللّٰہیت نے
بہار میں امارت کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ جب بعض جماعتوں نے اس کے اثر کو چیلنج کیا تو ان جماعتوں
کی شکست ہوئی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

علمار کے علاوہ مولانا کے دو زبردست رفیق تھے۔ ایک شیخ عدالت حسین بگھی چمپارنی جو
ہندوستان میں قدیم ترین کسان لیڈر تھے۔ اور جنھوں نے گاندھی جی کے مشورے سے اپنے علاقے
میں انگریزوں کے اثرات مٹا دیئے۔ دوسرے قاضی احمد حسین جنکا حال اس کتاب میں موجود ہے۔
مولانا نے نقیب ار کے نام سے بہار کے مسلمانوں کو منظم کیا گاؤں گاؤں میں اس کی تنظیم

پھیل گئی، مبلغین گھومنے لگے، مدارس قائم ہونے لگے۔ شمالی ہند میں ارتداد کا فتنہ اٹھا تو یہ فتنہ امارت ہی کے ذریعہ بہار میں ختم ہوا۔ بیت المال سے غربار اور مساکین کی مدد کی گئی، مسلمانوں کے باہمی مقدمات کے فیصلے امارت کے دارالقضار سے ہونے لگے۔ دارالقضا پہلے جمعیۃ علمار کے ماتحت تھا۔ اس کے روح رواں مولانا شاہ محی الدینؒ اور مولانا قاضی نورالحسن صاحب تھے، جو آخر عمر تک اس کے قاضی رہے۔ اور جن کی بدولت فریقین اس اعتماد سے آتے تھے کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ عدل وقسط کے ساتھ کیا جائے گا۔ امارت کے قیام کے بعد جمعیۃ نے امارت کی طرف اس ادارہ کو منتقل کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو زکوٰۃ وعشر نکالنا چاہیئے اس کی بیداری بھی بہار کے مسلمانوں میں امارت ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ عاملوں نے گھوم گھوم کر مسلمانوں کو مسائل بتائے۔ دارالاشاعت کی طرف سے مختلف قسم کے دینی رسائل اور کتابیں بھی شائع ہوئیں، فسادات میں امارت نے مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور مدد کی۔

جب ۱۹۳۵ء کا دستور نافذ ہوا اور کچھ کچھ عوامی بنیادوں پر انتخابات ہونے لگے یعنی حق رائے دہی بالغان کی بنیاد پر تو نہیں ہوا جس کا مطالبہ کانگریس کر رہی تھی اور جس کی مخالفت جناح صاحب کر رہے تھے لیکن پھر بھی حق رائے دہی ملک کے کافی بڑے حصہ کو مل گیا تھا، تو مولانا سجادؒ نے مولانا عثمان غنیؒ اور بعض دوسرے رفقار کار کے مشورے سے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی اس وقت بہار میں دو پارٹیاں اور سرگرم تھیں جو علمار دین کی قیادت کی منکر تھیں۔ ایک شفیع داودی صاحب کی جماعت۔ شفیع داودی صاحب بھی مولانا سجادؒ کی طرح صوبہ کے سب سے زیادہ فعال رکن تھے۔ دوسرے مسٹر عزیز مرحوم وزیر تعلیم بہار جو اپنا اچھا اثر رکھتے تھے۔ انتخاب مخلوط نہ تھا، مسلمان صرف مسلمان امیدوار کو ووٹ دے سکتے تھے۔ انتخاب ہوا تو صرف مسٹر عزیز کامیاب ہوئے ان کی پارٹی کامیاب نہ ہوسکی۔ اور شفیع داودی صاحب تو خود ہی ہار گئے اب بہار اسمبلی میں صرف دو پارٹیاں تھیں۔ ایک کانگریس دوسرے انڈی پنڈنٹ پارٹی۔ آزادی کے جدوجہد میں کل ہند کانگریس کے لیڈر راجندر پرشاد اور انڈیپنڈنٹ پارٹی کے صدر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد شریک تھے۔ دونوں کل ہند شخصیت کے مالک تھے، دونوں فعال اور مخلص تھے اس لئے امید تھی کہ دونوں پارٹیاں مل کر کام کریں گی، لیکن کانگریس نے یہ اعلان

کردیا کہ وہ کسی دوسری پارٹی کے تعاون اور حمایت سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ مولانا کو اور ان کے بعض ساتھیوں کو کانگریس کا یہ غرور پسند نہیں آیا جب کانگریس نے بہار میں وزارت قبول کرنے سے انکار کیا اور گورنر نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کو وزارت قبول کرنے کی دعوت دی تو مولانا کے رفقا نے سوچا کہ ان کی جماعت کو کانگریس سے آزاد ہو کر ملک اور مسلمانوں کے فائدے کے لئے کوئی قدم اٹھانا چاہیئے چنانچہ انڈی پنڈنٹ پارٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں ایک جماعت اس کی خواہشمند تھی کہ وزارت قبول نہ کی جائے کیونکہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہ وزارت قائم نہیں رہے گی۔ گورنر زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں مجلس قانون ساز کا جلسہ طلب کرنے پر دستور کی رو سے مجبور رہے اور جیسے ہی یہ جلسہ ہوگا کانگریس پارٹی عدم اعتماد کی تجویز پیش کر کے اور منظور کر کے اس وزارت کو ختم کر دے گی۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ چھ ماہ کے لئے کیوں نہ ہو وزارت قبول کر لی جائے اور مجلس قانون ساز کے بغیر عوام کو جو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے وہ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ دوسری جماعت غالب آئی اور مسٹر یونس بیرسٹر کو جو اس وقت بہار کے سب سے بڑے بیرسٹر تھے پارٹی کی طرف سے وزارت قائم کرنے کی اجازت دی گئی اور وزارت بن گئی چھ ماہ کے عرصہ میں مولانا سجاد کے مشورہ سے کسانوں کے مطالبات کی حمایت میں حکومت کی طرف سے سرکلر جاری کیا گیا اردو میں درخواستیں قبول کرنے کی ہدایت کی گئی اور بھی کئی مفید کام ہوئے۔ یہاں تک کہ کانگریس نے وزارت قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور مسٹر یونس مستعفی ہو گئے اور اس کے بعد پارٹی کا کانگریس حکومت سے زرعی ٹیکس کے سلسلہ اختلاف ہوا مولانا سجادؒ نے اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے کا مطالبہ کیا یہانتک کہ وقف علی الاولاد کو بھی۔ مولانا نے کہا کہ اگر ان کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو وہ سول نافرمانی کریں گے۔ بالآخر مولانا آزاد پٹنہ تشریف لائے اور انھوں نے مولانا سجادؒ کے حق میں فیصلہ دیا، اور اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

مولانا کا خیال تھا کہ آزادی کی تحریک میں سب مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں۔ لیکن قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی علیحدہ جماعت بنے تاکہ مسلمانوں کے مسائل کی وکالت صحیح طور پر ہو سکے۔ مولانا قیادت مذہبی لوگوں کی رکھنا چاہتے تھے اسی لئے انھوں نے بہار میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی حالانکہ اس وقت مولانا حسین احمدؒ اور جمعیۃ کے دوسرے حضرات یو پی میں

مسلم لیگ پارٹی کے حامی تھے۔ مولانا حسین احمد اور اکابر جمعیۃ کے موقف کے علی الرغم مولانا سجاد
بہار میں مسلم لیگ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس کے بعد مسلم لیگ کا زور ہوا اور یہ صورت ممکن نہیں رہی کہ حریت پسند مسلمان اور انگریزی
سرکار کے حامی مسلمان ایک پلیٹ فارم پر رہیں، چنانچہ مولانا حسین احمدؒ نے مسلم لیگ سے استعفاء
دیا اور انگریزی سرکار کے بعض حامی مسلمانوں نے جو مولانا سجادؒ کے اثر سے مرعوب ہو کر ان
کے ساتھ ہو گئے تھے، انڈی پنڈنٹ پارٹی سے مستعفی ہو گئے۔

ابھی یہ دور چل رہا تھا کہ کانگریسی وزیروں نے اس بنا پر وزارتوں سے استعفےٰ دیا کہ وہ
دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت کے خلاف تھے۔ جمعیۃ علماء ہند نے غیر مشروط طور پر
کانگریس کی شرکت کا فیصلہ کیا۔ مولانا سجادؒ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم بنے اور پھر تھوڑے عرصے کے بعد
ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا تفسیر و حدیث، فقہ و علم کلام اور سیاسیات و اقتصادیات پر گہری نظر رکھتے تھے
ہندوستان کے قوانین کی ایک ایک دفعہ مولانا کو یاد تھی۔ مجھ سے پٹنہ کے بعض وکلاء نے کہا جن
میں مسٹر یونس بھی تھے کہ مولانا انگریزی ایک حرف نہیں جانتے تھے لیکن سیاست اور صوبائی اور
مرکزی حکومت کے قوانین کو جس قدر سمجھتے تھے وہ ہم (وکلاء) نہیں سمجھتے تھے، مسٹر یونس نے تو مجھ سے یہ
بھی کہا کہ ان کے پاس بعض موکلوں کے مقدمات ایسے تھے کہ بظاہر قانون ان کے خلاف تھا
کوئی دفعہ پیروی کے لئے حمایت میں نہیں مل رہی تھی۔ مولانا سے ذکر آیا تو دفعات کی ایسی تاویل
پیش کی کہ ہائی کورٹ میں مقدمہ اس تاویل کو پیش کر کے جیت لیا گیا۔

مولانا نے مسٹر جناح کو جو خطوط لکھے اور جو امارت شرعیہ سے کتابی شکل میں "دو سیاسی
دستاویز" اور "اسلامی حقوق اور مسلم لیگ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے مولانا
کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح مولانا کی کتاب "حکومت الٰہی" بھی قابل
ذکر ہے جس میں مولانا نے بتایا ہے کہ مروجہ جمہوری طریقہ انتخاب سے جمہوریت کا حقیقی مقصد
حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا پہلے آدمی ہیں جنہوں نے جمہوری طریقہ انتخاب کی خامیوں کو اس قدر
شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے برسوں بعد یہی بات جے پرکاش نرائن نے لکھی اور

راورکیلا اورجمشید پور کے مہیب فسادات کے بعد ڈاکٹر محمود صاحب نے اس طرف اشارہ کیا اور لکھا کہ طریق انتخاب میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ مولانا اصل میں اسلامی نظریہ سلطنت پر کوئی کتاب لکھ رہے تھے جس کا یہ صرف مقدمہ تھا لیکن وہ یہ کتاب نہیں لکھ سکے اور یہ مقدمہ انکے انتقال کے بعد "حکومت الٰہی" کے نام سے شائع ہوا۔ پھر ندوۃ المصنفین کی طرف سے جسکو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی سرپرستی حاصل تھی۔ مولانا حامد الانصاری غازی کی ضخیم کتاب "اسلام کا نظریۂ سلطنت" شائع ہوئی۔ سیاسی اور میدانی کاموں نے اسکا موقع نہیں دیا کہ مولانا کی علمی صلاحیتیں تصنیفات کی شکل میں ظاہر ہوں۔

مولانا کا انتقال ہوا تو دہلی کے تعزیتی جلسہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کی جمعیۃ علماء کی خدمات دراصل مولانا سجاد کی خدمات ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ علماء میں وہی ایک مرد کامل اور عضو عامل تھا وہ بھی نہ رہا۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے کہا کہ ان کی ایک خوبی ایسی تھی جو کسی عالم میں نہیں تھی وہ یہ کہ ہندوستان کے کسی قانون ساز ادارہ میں کوئی ایسا مسودہ قانون پیش ہوتا جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہوتا تو اسکی وہ خبر رکھتے تھے اور فوراً اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور محرک مسودہ قانون کو مسلم ارکان اسمبلی کو اور علمائے ہند کے نام خطوط لکھتے تھے۔

محمد احمد کاظمی مرحوم وکیل الہ آباد نے جب مرکزی پرسنل لا میں شرعی بل پیش کیا تو اس کے اندر شرعاً جو خامی تھی اس کی طرف مولانا نے ہی توجہ دلائی اور جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس بلا کر دوسرے نقطۂ نظر کے علماء کی تائید حاصل کی اور اس مسودہ ترمیم کی اصلاح کی گئی لیکن مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی کے عین اجلاس میں قانون وراثت کے اندر یہ ترمیم پیش کردی کہ مرنے والا اگر وصیت کرجائے تو اس کی جائداد شریعت کے مطابق تقسیم ہوگی۔ ورنہ رواج کے مطابق یعنی شریعت کا قانون وراثت اصل نہیں بلکہ میت کی خواہش اصل ہے یا رواج۔ اور ان کی ترمیم منظور ہوگئی، تو مولانا نے مسٹر جناح کو یہ خط لکھا جس میں اس کی وضاحت کی گئی کہ مسلمان کو بہرحال شریعت کا پابند ہونا چاہیئے۔ افسوس مولانا کے خط کا اثر نہ ہوا اور جناح صاحب نے حکم شریعت کو منظور نہیں کیا۔ جب مسٹر جناح کی لڑکی

نے غیر مسلم سے شادی کرلی اور ارتداد کا راستہ اختیار کیا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کی لڑکی کو ترکہ مل گیا جو شریعت اسلامی کے مطابق نہیں مل سکتا تھا تب اندازہ ہوا کہ جناب صاحب نے کیوں ایسی ترمیم کرائی۔

مولانا پرانی وضع کے سادہ موٹے کپڑے میں رہتے تھے، عمامہ باندھتے تھے۔ بہار میں جب زلزلہ آیا تو جائے وقوع پر پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے ملبہ اٹھاتے اور ٹوکرا سر پہ لے جاکر پھینکتے تھے اور اس میں اس قدر منہمک تھے کہ ان کا اکلوتا لڑکا مرض الموت میں مبتلا ہوا لیکن اس کے مرنے سے پہلے اس کے پاس نہیں پہنچ سکے۔ مولانا کی سادگی اور بےنفسی مثالی تھی، علماء کے طبقہ میں کم لوگ اس معاملہ میں ان کے درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔

مولانا علماء میں تفریق کے قائل نہیں تھے، ہر مکتب فکر کے عالم دین سے ملتے، اس کی عزت کرتے اور اس کا تعاون حاصل کرتے اور اس کو اپنی کارگزاری سناتے اور اپنے کاموں سے روشناس کراتے، اس لئے ہر طبقہ علماء میں وہ پسند کئے جاتے تھے۔

مجھ سے مولانا عبدالخبیر امیر جماعت اہل حدیث بہار نے کہا کہ "میں پٹنہ سے باہر کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے جاتا ہوں تو اپنی ہی جماعت کے لوگوں کے جنازے میں لیکن میں نے مولانا سجادؒ کے انتقال کی خبر سنی تو فوراً پھلواری شریف گیا تاکہ جنازے میں شرکت کروں، لیکن ان کا جنازہ اس قدر جلد دفن کیا گیا کہ اس کا شرف حاصل نہیں ہوا۔"

اسی طرح بریلوی عالم مولانا ظفرالدین صاحب سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ کہتے تھے کہ مولانا سجادؒ اس طرح ملتے تھے اور بغیر الجھے اور بغیر لڑائی کئے ہوئے محبت سے اس طرح اپنا مدعا سمجھاتے تھے کہ اختلاف کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہار میں ہر مسلک کا عالم ان کا مداح اور ان کا حامی تھا۔ اختلافات سے بلند ہونا فکر و نظر کی بلندی اور قلب کی وسعت کی علامت ہے۔ مولانا شہروں سے زیادہ دیہاتوں پر توجہ دیتے تھے کیونکہ ملک کی پچھتر فیصدی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شہروں میں کثرت سے جلسے ہوتے رہتے ہیں، علماء اور زعماء کی تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ دیہاتوں کے دشوار گزار راستوں کو طے کرنے کی کم ہی لوگ ہمت کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ دیہاتوں میں جو اثر ہو جاتا ہے وہ دیرپا ہوتا ہے۔ مولانا کی طاقت کا راز بھی یہی تھا جس سے مولانا اپنے حریفوں کو شکست دے سکے۔ مولانا اپنی صحت کی پرواہ نہ

کر کے کثرت سے دیہاتوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ کھانا بھی بہت معمولی کھاتے تھے۔ چائے اور پان تمباکو کے عادی تھے ویسے تو موت کا وقت مقرر ہے لیکن بظاہر انہی اسباب کی بنا پر ان کی عمر نے وفا کی۔ مولانا کا انتقال ہوا تو مولانا کا سامان ایک بستر اور ایک جوڑا کپڑا تھا، ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے جس میں انتقال ہوا یہی اس مرد مجاہد کی زندگی کا کل اثاثہ تھا۔ مولانا بڑے عالم دین تھے، مولانا بڑے سیاسی لیڈر تھے، مولانا جماعتوں کے بانی تھے لیکن مولانا کی زندگی اس قدر سادہ تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ افسوس آزادی سے بہت پہلے مولانا سجادؒ کا انتقال ہو گیا ورنہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی حل نہ نکالتے تو بہار کا مسئلہ ضرور حل کر لیتے۔ نہ صرف مولانا حفظ الرحمٰن بلکہ تمام علماء مولانا کی صلاحیتوں کے بے حد معترف تھے۔

میں کلکتہ میں تھا اور مولانا کلکتہ تشریف لاتے تو ضرور مجھ سے ملنے آتے جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ معمولی آدمی کو بھی کتنی اہمیت دیتے تھے۔ وہ مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ صاحب اصح السیر کے یہاں قیام فرماتے تھے۔ انہی نے مجھ کو ہدایت کی تھی کہ میں داناپوری صاحب سے ملتا رہوں۔ جب اس ملاقات سے مولانا آزادؒ کی امامت کے مسئلے میں اور خاکسار تحریک کے سلسلہ میں فائدہ پہنچا اور داناپوریؒ نے مولانا آزادؒ کی حمایت میں اور خاکسار تحریک کی مخالفت میں فتوے دیئے تو مولانا سجادؒ نے کہا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ ملتے رہنے سے فائدہ ہوتا ہے، اور آدمی جس سے ملتا ہے اس کو اپنے سے قریب کر سکتا ہے۔

مولانا آخری دفعہ کلکتہ تشریف لائے تو میں اپنی شادی کے سلسلہ میں بہار گیا ہوا تھا۔ مولانا حسب معمول ہمارے دفتر تشریف لائے۔ ان دنوں میں "روزنامہ استقلال" کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے دفتر والوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اپنی شادی کے لئے جا رہا ہوں۔ لیکن مولانا کو دفتر امارت شرعیہ میں اس بات کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے دفتر والوں نے مولانا سے کہا کہ عثمانی صاحب نہیں ہیں۔ مولانا نے فوراً جواب دیا کہ "مجھ کو معلوم ہے آج ان کی بارات ہے میں تو آپ حضرات سے ملنے آیا ہوں" میری غیر موجودگی میں بھی مولانا نے ملنے کے لئے آنے کا معمول ختم نہیں کیا۔

اس کے بعد مولانا سے جون پور میں جمعیۃ کے اجلاس میں ملاقات ہوئی۔ پھر پٹنہ میں ملاقات ہوئی

اور یہ آخری ملاقات تھی۔ میں اپنے سسرال جارہا تھا مولانا نے کہا کہ اسلام پور کے سجادہ نشین شاہ ابوالبرکات صاحب کو میرا سلام کہنا۔ چنانچہ میں نے سلام پہنچادیا مولانا کو معلوم تھا کہ وہ مسلم لیگ سے متاثر ہو گئے ہیں لیکن مولانا کو اس سے غرض ہی کیا تھی ان کے یہاں تو مسلمان ہونا اور مذہبی ہونا کافی تھا۔ وہ جانتے تھے تعلقات رکھنے سے اصلاح ہوسکتی ہے۔ پھر یہ فکری اختلافات تو اضافی چیزیں ہیں اصل چیز ہے انسان کا خدا سے تعلق اور اسی چیز کا نام دین ہے

ایک بار اپنے ایک دوست کے ساتھ مولانا سے ملا تھا۔ وہ ایم اے میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا کہ انگریزی پڑھئے تو سائنس لیجیے جس میں مسلمان پیچھے ہیں ادب اور فلسفہ کے میدان میں مسلمان پیچھے نہیں ہیں۔ مولانا دراصل اسلام اور سائنس کے ربط کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ایک طرف اسلام سے واقف ہوں اور دوسری طرف جدید سائنس پر بھی ان کی نظر ہو۔ مولانا کے عہد میں کم علماء ہوں گے جن کے اندر یہ حقیقت پسندی ہوگی۔

مولانا صوفی بھی تھے اور نقش بندی سلسلہ کی اجازت رکھتے تھے۔ صاحب دل تھے لیکن بیعت نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل میں زیادہ مشغول رہتے تھے مشیخیت اور سجادگی کو انھوں نے پیشہ نہیں بنایا۔

پڑھانے کے زمانہ میں مولانا طلبہ کو کہتے "سمجھا کہ نہیں" یہ لفظ ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا جب انھیں اس کا احساس ہوگیا تو اس لفظ کے استعمال سے بچنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ "سمجھا" تو چھوٹ گیا لیکن "نہیں" کا لفظ زبان پر رہ گیا۔ لوگ مزاحاً کہتے کہ مولانا سجادؒ اس لئے گرفتار نہیں ہوتے ہیں کہ وہ ہر بات میں "نہیں" کہہ دیتے ہیں مثلاً "انگریزوں کو قتل کرو نہیں"

مولانا کہتے کہ اپنے کو گرفتاری کے لئے پیش کر دینا کوئی عمدہ بات نہیں ہے۔ حکومت کے خلاف کام کئے جاؤ، ڈرو نہیں۔ اگر گرفتار کرلیا جائے تو کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور جیل جانے سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کو نکالنے کے جذبہ سے مولانا بھی اپنے ہم عصروں کی طرح سرشار تھے۔

مولانا نے انتخابات کے موقع پر حکومت برطانیہ کے خلاف ہر جگہ سخت تقریریں کیں، اور ۔ومت کو مذہب دشمن قرار دیا۔ جب ان کی پارٹی کامیاب ہوئی تو مسٹر عزیز نے مقدمہ دائر کردیا۔

کہ انھوں نے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر کامیابی حاصل کی ہے۔ مسٹر عزیز کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔
لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ مولانا عدالت میں اس سے انکار نہیں کریں گے۔ اس لئے مسٹر لونس وغیرہ نے
بہت مشکل سے مولانا کو اس پر راضی کیا کہ وہ عدالت میں حاضر نہ ہوں۔ چنانچہ جب تک عدالت میں
مقدمہ کی کاروائی جاری رہی، مولانا پٹنہ سے باہر رہے۔ یہاں تک کہ ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے مسٹر عزیز
کا مقدمہ خارج ہوگیا، ورنہ مولانا اگر عدالت میں حاضر ہوتے تو سچ بولتے؛ اگرچہ مخالف کے پاس ثبوت
نہ تھا۔

ملک کے بعض علماء صرف مولانا کی وجہ سے جمعیۃ العلماء کے حامی تھے مثلاً مولانا امین احسن
اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید احمد عروج قادری، مولانا کے انتقال کے بعد انھوں
نے نیا پلیٹ فارم تلاش کیا اور مولانا مودودی صاحب کی قائم کی ہوئی جماعت اسلامی میں شریک
ہوگئے۔ مولانا مسعود عالم صاحب کا انتقال ہوگیا اور مولانا امین احسن اصلاحی اور بعض دوسرے
علماء، جیسے مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا جعفر میاں پھلواروی ندوی جماعت اسلامی
سے علیحدہ ہوگئے۔ مولانا عروج احمد قادری جماعت اسلامی کے رکن اور "زندگی" کے ایڈیٹر ہیں۔

لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک پر پابندی لگی اور اور مسلمانوں نے سول نافرمانی شروع کی تو
مولانا وہاں تشریف لے گئے اور مسلمانوں کی حمایت کی اور سول نافرمانی کی کامیابی تک رہنمائی کی۔

مولانا نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے جلسہ میں جو خطبہ دیا وہ مولانا کے سیاسی شعور اور دین
سے محبت کا بہترین مظہر ہے۔ مولانا میں خطابت نہیں تھی لیکن دلیل کی قوت اس قدر زبردست
تھی کہ انکار مشکل ہوتا تھا۔ انسان اگر با شعور ہو تو اس کے نزدیک اصل قوت دلیل کی ہوتی ہے ___
انسان اگر بے شعور ہو تو بے معنی خطابت اور شاعری بھی دلیل کے قائم مقام بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ کے یہاں مولانا کی موجودگی میں ایک صاحب تشریف
لائے جو کسی رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے کانگریس میں شرکت مشروط
کی ہے یا غیر مشروط۔ مولانا نے جواب دیا کہ مشروط۔ شرط یہ ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی بات ہوگی تو نہیں
مانیں گے اور اس کی مخالفت کریں گے۔ انھوں نے پوچھا کہ شرط تحریری ہے یا تقریری۔ مولانا نے کہا
تحریری نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا حکم ہے کہ" معمولی کام جیسے نکاح ہو تو بھی لکھ لو"

مولانا نے جواباً کہا کہ آپ کے خیال میں جن لوگوں کا نکاح ہوتا ہے اور لکھا نہیں جاتا ان کا نکاح منعقد نہیں ہوتا؟ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ ہنس پڑے۔ اور یہ صاحب خاموش ہو گئے۔ اصل میں بہار میں نکاح کی رجسٹری نہیں ہوتی۔ خاندان کا کوئی بڑا آدمی یا کوئی عالم دین فریقین سے زبانی اقرار لے لیتا ہے اور بس۔

مولانا اس بات کو بہت اہمیت سے کہتے تھے کہ جزیرۃ العرب میں نصاریٰ کو رہنے نہ دیا جائے تاکہ وہ مرکز اسلام میں کوئی سازش نہیں کر سکیں۔ "انوار العلوم گیا" کا سالانہ جلسہ ہوتا تو اس میں یہ کتبے لگواتے" اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب" (حدیث) لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض (قرآن کریم) ولن ترضی عنک الیھود والنصاریٰ حتی تتبع ملتھم (قرآن کریم) ہمارے نزدیک دوسری غیر مسلم قومیں اپنے اپنے ملک میں مسلمانوں سے دشمنی کرتی ہیں، لیکن نصاریٰ کی حکومتیں تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ ایک صاحب نے مولانا کے سامنے وہ آیت پڑھی جس میں نصاریٰ کو یہود اور مشرکین سے بہتر بتایا گیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ تمام نصاریٰ کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں سنتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس آج نصاریٰ میں کسی کی آنکھوں سے قرآن کی آیتیں سن کر آنسو جاری نہیں ہوتے، بلکہ یورپ میں انھوں نے اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان گنت کتابیں لکھی ہیں جن میں جھوٹے اتہامات لگائے گئے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ جلالین میں تفسیر مظہری میں اور بعض دوسری تفسیروں میں یہ وضاحت ہے کہ نصاریٰ کی یہ تعریف جو قرآن میں ہے، نجاشی اور اس کے لوگوں کے لئے ہے جو قرآن کی آیات سن کر متاثر ہوئے اور جنھوں نے اسلام کی تصدیق کی۔ وہاں پر یہود سے مراد یہود مدینہ اور مشرک سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ کہ ان دونوں کے مقابلہ میں نجاشی نے اسلام کی حمایت کی۔ نصاریٰ کے مودت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ" یہ تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک ان کا دین اختیار نہ کر لو" مولانا نے کہا کہ آج جو مسلمانوں میں بے دینی پھیل رہی ہے وہ انھیں نصاریٰ کی حکومتوں کی بدولت ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں سیکولر طرز کی تعلیم گاہیں قائم کیں جن میں مذہبی تعلیم نہیں ہوتی تھی۔ سرکاری ملازمتیں اسی طرز کے اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کے فارغین کو ملتی تھیں۔ علمائے دین نے ان سرکاری تعلیمی اداروں کے متوازی دینی تعلیم گاہیں قائم کیں۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے انگریزی زبان اور سائنس و ٹکنالوجی کو ان تعلیم گاہوں میں نہیں رکھا۔ یہ تعلیم گاہیں عام مسلمانوں کے چندوں سے چلتی رہیں۔ جن سے مسلمانوں کو دینی تعلیم کا شوق ہوتا وہ ان آزاد دینی مدارس میں تعلیم پاتے جن سے نکل کر ان کے لیے اپنے معاشی مسائل کا حل کرنا مشکل ہو جاتا اور جن کو مذہبی تعلیم کا شوق ہوتا وہ ان سیکولر اسکولوں میں داخل ہوتے جن سے نکل کر ملازمتوں کے ذریعہ وہ اپنے معاشی مسائل حل کر لیتے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا رواج ان اسکولوں میں بھی بہت کم تھا۔ بہت سے مسلمان اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم بھی نہ دیتے اور ان کو اسکولوں میں داخل کر دیتے۔ میں نے ہائی اسکول کے ایسے مسلمان طلبہ کو دیکھا جو یہ بتا نہ سکے کہ قرآن کس کی کتاب ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے پیغمبر ہیں یا نہیں؟ جب مولانا سجادؒ کو ایسے واقعات معلوم ہوئے تو انھوں نے سوچا کہ اسکولوں میں لازمی ابتدائی تعلیم کا نظم ہونا چاہیئے۔ کانگریس وزارتیں قائم ہوئیں تو گاندھی جی نے ڈاکٹر ذاکر صاحب کی صدارت میں ابتدائی تعلیم کی اسکیم تیار کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی۔ اس نے جو رپورٹ دی اس کو وردھا اسکیم کہتے ہیں۔ اس موقع پر مولانا سجادؒ نے مسلمانوں کے لیے لازمی بنیادی تعلیم کی آواز بلند کی۔ خود ڈاکٹر ذاکر صاحب کو اس پر انشراح نہ ہوا۔ لوگ یہ کہتے تھے کہ مذہبی اختلافات کی موجودگی میں بنیادی مذہبی تعلیم کا نصاب تیار کرنا مشکل ہے۔ ذاکر صاحب سرے سے اس کے خلاف تھے کہ مذہبی تعلیم حکومت کے ہاتھوں میں ہو۔ بلکہ وہ تو سب ہی طرح کی تعلیم کو حکومت کے اثر سے آزاد رکھنے کے حامی تھے۔ مولانا سجادؒ کہتے تھے کہ وہ ایسا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں جس سے مسلمانوں کے کسی فرقہ کو اختلاف نہیں ہوگا۔ باقی رہا مذہبی تعلیم کا حکومت کے ہاتھوں میں ہونا تو وہ بھی اس کو پسند نہیں کرتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ مسلمانوں پر دنیا داری اس درجہ غالب ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی مذہبی تعلیم دیئے بغیر اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے ہتھیار

نہیں رکھا اور انھوں نے سب سے پہلے اپنی جماعت جمعیۃ علمار ہند کی مجلس عاملہ سے یہ مطالبہ منظور کرایا۔ اس کے بعد یہ مطالبہ گاندھی جی کے سامنے رکھا گیا، گاندھی جی کو اس سے اختلاف نہ تھا کہ مسلمان چاہتے ہیں تو ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا نظم حکومت کرے۔ لیکن شاید ان کے سامنے مشکل یہ تھی کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوؤں کی طرف سے بھی ایسا مطالبہ ہوگا اور اگر ان کا مطالبہ بھی منظور کیا گیا تو ملک میں توہمات کا زور ہو جائے گا۔

ان دنوں مسلم لیگ کا زور بڑھ رہا تھا۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کچھ مطالبہ نہ کر کے ان علاقوں کے لئے علیٰحدہ حکومت کا مطالبہ کیا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس مطالبہ میں مولانا سجادؒ کا مطالبہ کھو گیا یہاں تک کہ مولانا کی زندگی نے وفا نہ کی۔ جمعیتہ کی نئی قیادت نے اس پر زور نہیں دیا، لیکن بہار میں قاضی احمد حسین صاحب نے یہ آواز اٹھائی اور بالآخر مولانا آزاد کے یقین دلانے پر کہ اس کے موقع اور محل پر وہ خود اس کی تحریک کریں گے قاضی صاحب خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہوا، مولانا آزاد وزیر تعلیم ہوئے۔ آل انڈیا ایجوکیشنل ایڈوائزری بورڈ کا جلسہ ہوا مولانا آزاد نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کم پڑھے لکھے استاد بچوں کو ابتدائی مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور مذہبی نفرت اور تعصب پیدا کرتے ہیں اس لئے ابتدائی مذہبی تعلیم کا نظم حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیئے۔ لیکن مولانا کی یہ آواز تنہا رہی۔ رادھا کرشنن، ذاکر صاحب، جواہر لال اور گاندھی جی کسی نے بھی اس کی حمایت نہیں کی۔ اس کے بعد نئے سوالات پیدا ہو گئے، مسلمانوں کے جان و مال ہی کی حفاظت کا بڑا سوال تھا۔ اس لئے پھر یہ آواز نہیں اٹھی۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مولانا آزاد کے مشورے سے یہ تحریک چلائی کہ مسلمان اپنے طور پر ابتدائی مذہبی تعلیم کا کل ہند نظم کریں۔

یوپی میں امارت شرعیہ کے قیام کی کوششیں آزادی سے پہلے ہوئیں لیکن علمار دین کے اختلاف باہمی کا مرکز یوپی کی ریاست رہی اس لئے مذہبی تعلیم کی اسکیم کامیاب نہ ہو سکی آزادی کے بعد جمعیۃ علمار اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ امارت شرعیہ قائم کرے۔ مسلمان جمعیۃ کے

گرد جمع ہو رہے تھے۔ لیکن سردار پٹیل اور آر ایس ایس والے یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ مسلمان انقلاب کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بلکہ انہونی باتوں کو مہیب شکل میں پیش کرتے تھے اور ان کا ہوّا کھڑا کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ وغیرہ خائف ہوئے کہ امیر شریعت فی الہند کا انتخاب ہوا تو اس کا مطلب بھی یہی لیا جائے گا۔ اس لئے امارت کا قیام تو کیا عمل میں آتا جمعیۃ نے سیاست سے علیحدگی کا اعلان کیا اور جمعیۃ کے مقاصد سے محاکم شرعیہ کے قیام کی دفعہ نکال دی گئی۔

ایک دفعہ شہید سہروردیؒ نے مولانا سجادؒ سے کہا کہ آپ لوگ ہندوستان کے بارے میں اتنا سوچتے ہیں، کبھی کبھی مسلمانوں کے بارے میں بھی سوچئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ آپ کو جب وکالت سے فرصت ملتی ہے جب مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور ہمارا تو اوڑھنا بچھونا یہی ہے لیکن ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمان جس طرح منتشر ہیں ہندو مسلم منافرت پیدا کر کے مسلمانوں کا بھلا نہیں کیا جاسکتا۔

مفتی کفایت اللہؒ

جب سے میں نے جمعیۃ العلماء کا نام سنا مفتی کفایت اللہؒ کا نام سنا اور ان کے بارے میں تعریفی کلمات مولانا سجادؒ اور مولانا آزادؒ سے بھی سنے تھے۔ مولانا سجاد اور مفتی صاحب تو رفیق ہی تھے، مولانا آزاد نے جس طرح ان کی تعریف فرمائی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مفتی صاحب کو بہت زیادہ ذمہ دار اور دانشمند سمجھتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے قائل اور معترف تھے۔ الجمعیۃ میں مفتی صاحب کے بیانات اور فتاوے پڑھتا رہتا تھا۔ دہلی جاتا تو اندازہ ہوتا کہ دلی والے ان کو کس قدر مانتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مفتی صاحب جامع مسجد دہلی سے اپنی قیام گاہ کی طرف چلتے تو لوگ دونوں طرف سے مفتی صاحب کی طرف بڑھتے جاتے اور مصافحہ کرتے جاتے یہ زمانہ مسلم لیگ کے زور وشور سے پہلے کا ہے۔ مفتی صاحب کو جامع مسجد سے اپنی قیام گاہ کی طرف سواری سے نہیں جاتے دیکھا تھا۔ مفتی صاحب بہت کم تقریر کرتے تھے۔ زیادہ طویل تقریر بھی نہیں کرتے تھے، لیکن جو بولتے تھے اس میں خطابت بھی ہوتی تھی اور دلیل بھی۔ اور ترتیب بھی جو تازہ ترین طریقہ فن خطابت کا ہے مفتی صاحب کی تقریر اس پر پوری اترتی تھی۔ راقم الحروف کے ماموں ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی ۱۹۳۰ء میں بارہ برس کے بعد امریکہ سے آئے تھے تو وہ مفتی صاحب سے ملے تھے اور بہت متاثر ہوئے تھے اور یہ انھیں پر موقوف نہ تھا۔ جدید وقدیم دونوں طرح کے تعلیم یافتہ اور اہل دانش جو بھی مفتی صاحب سے ملے متاثر ہوتے تھے جو شخصیت علم، ذہانت اور اخلاص کا پیکر بن جاتی ہے، تو اس کی مثال پھول کی ہوتی ہے، جو اپنی حسن افروزی اور عطر بیزی سے ہر طبقہ کو متاثر کرتا ہے۔

کانگریس نے جب جب انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی شروع کی مفتی صاحب نے اس کی تائید کی اور خود بھی جمعیۃ کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ جب قصہ خوانی بازار پشاور میں خدائی خدمت گاروں پر گولیاں چلیں اور ان کو طرح طرح سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا

خان عبدالغفار خان وغیرہ گرفتار کر لئے گئے، سنسر لگا دیا گیا، پشاور آنے جانے پر پابندیاں لگ گئیں تو وٹھل بھائی پٹیل نے جو مرکزی اسمبلی کے صدر تھے اور کانگریس کے لیڈر ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی۔ مفتی صاحب بھی اس کے ایک رکن تھے۔ اس کمیٹی کو پشاور میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی اور اس نے پنجاب میں رہ کر شہادتیں قلم بند کیں۔ جب رپورٹ شائع ہوئی تو حکومت ہند نے اس کو ضبط کر لیا۔ مفتی صاحب ایک طرف علم دین کی مسند پر فائز تھے، دوسری طرف سیاست کے میدان میں بھی مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔

نمک ستیہ گرہ کے زمانہ میں جب کانگریس خلاف قانون قرار دے دی گئی تو مفتی صاحب کو اس خلاف قانون کل ہند کانگریس مجلس عاملہ کا رکن بنایا گیا اور مفتی صاحب اس جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ اس گرفتاری کے خلاف ہم لوگوں میں بڑا جوش تھا۔

جب مسلم لیگ کا زور ہوا اور اس کی حمایت میں کچھ لوگوں نے اصطلاح "سواد اعظم" کی دلیل پیش کی اور یہ کہا کہ حدیث میں ہے کہ سواد اعظم باطل پر جمع نہ ہوگا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ سواد اعظم سے اسلام سے ناواقف، جاہل اور غافل مسلمان مراد نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے وہ مسلمان مراد ہیں جو دین سے واقف اور اس پر عامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب نے صحیح فرمایا ورنہ "سواد اعظم" کے کردار اور ذہن کو دیکھا جائے تو خدا کا دین اجنبی دین ہو چکا ہے۔

مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فارغ علماء میں سب سے زیادہ قابل اعتماد صاحب تقویٰ تھے۔ پورے ہندوستان میں ان کے فتووں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ایک بار ہماری بہن کا مقدمہ سید سلیمان ندوی صاحب کی عدالت بھوپال میں پیش تھا، دین مہر کا مسئلہ تھا فریق کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا فتویٰ پیش کیا گیا کہ شوہر اپنی بیوی کو جو کچھ دیتا ہے پہلے وہ دین مہر میں محسوب ہوگا اس کے بعد عطیہ میں خواہ شوہر اس کی وضاحت نہ کرے۔ سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ منگائیے۔ چنانچہ میں نے ان کا فتویٰ منگایا۔ مفتی صاحب نے لکھا کہ میاں بیوی کے تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ شوہر بہت چیزیں بیوی کو دیتا ہے اور ان کو دین مہر میں محسوب نہیں کرتا، اسکی یہ نیت نہیں ہوتی۔ اس لئے جب تک شوہر وضاحت نہیں کرے کہ وہ یہ چیز دین مہر کی ادائیگی کے لئے دیتا ہے، جب تک اسے

دین مہر میں شمار نہیں کریں گے۔ چنانچہ سید صاحب نے مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کے مطابق اپنا فیصلہ دیا۔ مولانا عبدالہادی مفتی ریاست بھوپال اور مولانا رضوان الدین نائب قاضی ریاست بھوپال نے بھی مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کی تائید کی تھی۔

جب مدرسہ شمس الہدیٰ میں قومی ترانہ گانے کا جھگڑا شروع ہوا تو مفتی صاحب نے فتویٰ دیا کہ مذہبی مجالس میں قومی ترانہ گانا صحیح نہیں ہے سیکولر اسٹیٹ کا یہ ترانہ سیکولر جلسوں اور حکومت کے تقریبات میں گانا چاہیئے۔

قاہرہ میں فلسطین کانفرنس ہوئی تو مفتی صاحب اس میں تشریف لے گئے تھے وہاں تصویر کھنچوانے کا مسئلہ آیا تو مفتی صاحب نے تصویر کھنچوانے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ تصویر کھنچوانا جائز نہیں ہے الّا یہ کہ کوئی مجبوری پیش آئے۔ شاید مفتی صاحب مکہ کی اس موتمر میں بھی شریک تھے جو ملک عبدالعزیز نے حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد بلائی تھی اور جس میں مولانا محمد علی جوہر وغیرہ شریک تھے۔

مفتی صاحب کو مولانا الیاسؒ کی تحریک سے بھی دلچسپی تھی اور وہ اس میں حصہ لیتے تھے اسی تبلیغی تحریک کے سلسلہ میں ایک بار مفتی صاحب بھوپال بھی تشریف لے گئے تھے اور وہاں اجتماع میں اپنی تقریر میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے اسلام لانے کا قصہ تفصیل سے بتایا تھا اور یہ کہہ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے باوجود کہ تم مسافر ہو۔ کوئی تمہارا یہاں مددگار نہیں ہے۔ کفار مکہ تم کو یہاں بہت زیادہ تکلیف دیں گے۔ اس لئے ابھی اسلام کا اعلان یہاں مت کرو۔ یہ لطیف نکتہ بتایا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم نہ تھا، کیونکہ اسلام لانے کے بعد حکم کی اطاعت واجب تھی۔ یہ آپ کی طرف سے ایک رعایت اور رخصت تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رخصت کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ عزیمت کا راستہ اختیار کیا۔ عزیمت کا راستہ اختیار کرنا افضل ہے اور وجہ اجر و ثواب ہے۔ رعایت سے فائدہ اٹھانا باعث اجر نہیں ہے، لیکن گناہ بھی نہیں ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب خود بڑے عالم دین تھے لیکن اس کے باوجود وہ مولانا الیاس صاحبؒ کے تحریکی اور تبلیغی کام میں شریک ہوئے کیونکہ یہ عوام الناس کے دینی فائدے کی تحریک تھی۔

جب مولانا اشرف علیؒ نے دیوبند کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا تو مفتی صاحب ہی

دیوبند کی مجلس شوریٰ کے صدر ہوئے اور وہ آخر عمر تک اس کے صدر رہے۔

مفتی صاحب کو آخر عمر میں دوران سر کی شکایت ہو گئی تھی، لیکن اس میں اپنے فرائض منصبی برابر انجام دیتے رہے۔ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ میں بھی برابر شریک ہوتے تھے۔

مفتی صاحب امارت شرعیہ بہار کے زبردست حامی تھے اور سیاسی و مذہبی مسائل میں اس کی تائید فرماتے تھے۔ ان کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ زکوٰۃ کی رقوم امیر کے پاس جمع کرنی چاہئیے۔ مسلمانوں کا امیر ہو اور وہ طلب کرے تو خود سے مستحق کو زکوٰۃ دے دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کے کتنے زبردست مؤید اور قائل تھے۔

مفتی صاحب ایک بار نواب بھوپال کی دعوت پر اسلامی قانون میں مشورہ کے لئے سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھوپال گئے تھے۔ اس موقع پر بعض علماء نے مفتی صاحب پر اعتراض کیا کہ وہ سرکاری مہمان ہیں جہاں میز کرسی پر کھانا کھایا جاتا ہے اور چاندی کے برتن کھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ محلہ احمد آباد (جہاں والی ریاست کے لوگ آباد ہیں) کی مسجد میں چمن لگانے کے لئے کھاد ڈالی گئی ہے، جو ناپاک ہے اور اس حصہ میں ڈالی گئی ہے جہاں نماز ہوتی ہے۔ مفتی صاحب کو کہا گیا کہ آپ پر فرض ہے کہ ریاستی حکومت کو توجہ دلائیں۔

مفتی صاحب نے پہلی بات کا تو یہ جواب دیا کہ میز کرسی پر کھانا اب صرف نصاریٰ کا شعار نہیں رہا، دنیا میں ہر جگہ علماء اور دین دار حضرات بھی میز کرسی پر کھاتے ہیں۔ اس لئے اس کو اب ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ اس بات سے مولانا کی وسیع المشربی اور وسعت فکر و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرے اعتراض کے بارے میں مفتی صاحب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ "اگر وہ چاندی کے برتن ہیں تو میں نے غلطی کی، لیکن اس بارے میں سید صاحب صحیح بتا سکتے ہیں۔ سید صاحب نے کہا کہ یہ چاندی کے برتن نہیں ہیں۔ یہ جرمن سلور کے برتن ہیں جو چاندی کے نہیں ہوتے۔

تیسرے معاملے کے بارے میں مفتی صاحب نے جائے وقوع دیکھنا چاہا اور دیکھنے کے بعد کہا کہ ٹھیک ہے، یہ ریاستی حکومت کی غلطی ہے میں اس پر گفتگو کروں گا۔

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ تب تو انگریزی بال بھی ناجائز نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ ابھی مسلمانوں کے دیندار طبقہ میں اس کا رواج نہیں ہوا ہے۔ جن کو نصاریٰ کی تہذیب اچھی لگتی ہے، وہ جان بوجھ کر انگریزی بال رکھتے ہیں کہ یہ نصاریٰ کا شعار ہے

بھوپال میں ریاست کے چیف میڈیکل افسر کے یہاں بھی دونوں حضرات کی دعوت تھی دعوت کے موقع پر چیف میڈیکل افسر نے دریافت کیا کہ کیا حضور صلعم نے کہا ہے کہ کوئی مرض متعدی نہیں ہے؟ مفتی صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ میڈیکل افسر نے کہا کہ طبی نقطۂ نظر سے تو کئی مرض متعدی ہیں، انھوں نے اس کے ثبوت دیئے لیکن مفتی صاحب نے ان دلائل پر ایسی تنقید کی کہ چیف میڈیکل افسر بول اٹھے کہ متعدی ہونے کا طبی نظریہ غلط ہے۔ عالم دین ہونے کے باوجود مولانا جدید طبقہ کو مطمئن کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

علامہ شبلی کے خلاف ایک فتویٰ پر مفتی صاحب سے دستخط کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ لیکن مفتی صاحب نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ شبلی کا وہ عقیدہ نہیں ہے، جو استفتاء میں لکھا گیا۔ ایک صاحب فتویٰ اور عالم دین کو فتویٰ کے معاملہ میں جو احتیاط برتنی چاہیئے مفتی کفایت اللہ صاحب کے یہاں اس کی مثال ملتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ

میں دہلی میں تھا اور بڑے بھائی شاہ عیسٰی صاحب مرحوم دیوبند کے طالب علم تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے متعدد ممتاز اساتذہ کو دیوبند سے نکال دیا تھا۔ ان نکالے جانے والوں میں مولانا انور شاہ صاحب، خود مہتمم صاحب کے بھائی مولانا شبیر احمد صاحب اور بھتیجے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور ایک اور استاذ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی تھے۔ بھائی صاحب مرحوم ان حضرات کے حامی تھے اور ان کا اخراج پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے میرا بھی یہی خیال تھا۔ بہت چھوٹا تھا اس لئے اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ اس موقع پر میں نے پہلی بار مولانا حسین احمد مدنی کا نام سنا جن کو مہتمم صاحب نے انور شاہ صاحب کی جگہ پر درس کے لئے دیوبند بلا لیا تھا۔

میں نے اس سے پہلے مولانا حسین احمدؒ کا نام یوں نہیں سنا یا سنا تو کیوں حافظہ میں محفوظ نہ رہا اس کی وجہ معلوم نہیں، حالانکہ ہمارے یہاں علما اور زعما کے تذکرے جو سیاسیات میں تھے برابر ہوتے رہتے تھے۔ مولانا اس سے پہلے ملک میں معروف ہو چکے تھے۔ ریشمی رومال والی سازش میں شریک تھے گو کہ آخر میں شریک ہوئے ترکی خلافت سے تابرطانیہ کے خلاف بغاوت کرنے کی حمایت میں فرمان حاصل کرنے کی غرض سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن حجاز تشریف لے گئے تھے تو یہ ان کے ترجمان تھے کیونکہ ان کو ترکی و فارسی اور جدید عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس پاداش میں ان کو اپنے استاد کے ساتھ مالٹا میں قید و بند کی سزا بھی بھگتنی پڑی تھی۔ رہائی کے بعد ہندوستان آئے تو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کی صدارت بھی کی تھی۔ مولانا آزاد کے قائم کردہ مدرسہ بمقام کلکتہ میں اپنے استاد کی ہدایت پر مدرس کے فرائض بھی انجام دیئے تھے، مشہور مقدمہ کراچی میں محمد علی جوہر کے ساتھ یہ بھی ماخوذ رہ چکے تھے۔

بہرحال اس واقعہ کے بعد مولانا حسین احمدؒ کا اثر دیوبند میں تیزی سے بڑھا۔ لڑکے ان

پر جان دینے لگے۔ اساتذہ معترف ہوئے اور ارباب اہتمام مرعوب۔ مولانا اس شرط پر دیوبند آئے تھے کہ ان کو سیاسی سرگرمیوں سے روکا نہیں جائے گا۔ چنانچہ وہ دل کھول کر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے اور ان کے اثر سے دیوبند کے طلبہ میں بھی سیاسی ذوق اور برطانیہ دشمنی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا دیوبند کے ہی نہیں بلکہ ملک کے اور جمعیۃ علماء کے ایک ممتاز رہنما کی حیثیت سے ابھرے اور مسلم لیگ کا زور ہوا تو مولانا واحد نیشنلسٹ رہنما تھے جنھوں نے ہوا کے رخ کے خلاف پورے ہندوستان میں دورہ کرکے مسلم لیگ کا مقابلہ کیا اور پاکستان بننے کی مخالفت کی۔ انسان کو اپنی رائے اور بصیرت پر بھروسہ ہو تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ مخالفین کی تعداد کتنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کو کشف ہو گیا تھا کہ پاکستان بنتے ہی مسلمانان ہند پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کی طرف سے پاکستان کا مطالبہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ منقسم ہندوستان میں مسلمان اکثریت کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ مولانا قضائے الٰہی کو روک نہیں سکتے تھے، لیکن اپنی بصیرت اور دینی فہم کی بناء پر پاکستان کی تحریک کے خلاف مسلسل کوششوں میں مصروف رہے۔ مولانا جیسے سادہ آدمی کی طرف سے پاکستان کی شدید مخالفت اور پاکستان بننے کے بعد اس کے نتائج دیکھ کر معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ مولانا کے قلب میں ہونے والے واقعات کا پرتو پڑا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اپنی توہین اور مخالفت کی بھی پرواہ نہیں کی۔

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ میں ابتداءً مولانا شریک ہو گئے تھے، وجہ یہ تھی کہ ان دنوں مسٹر جناح مرکزی اسمبلی میں حکومت ہند کے خلاف تقریریں کرنے لگے تھے اور کانگریس پارٹی کا ساتھ دیتے تھے لیکن جب مولانا نے دیکھا کہ مسٹر جناح نے اپنی مسلم لیگ میں سروں اور خان بہادروں کو جمع کر لیا ہے جو تاج برطانیہ کے وفادار تھے تو مولانا نے آثار اچھے نہیں دیکھے اور وہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔

مسلم لیگ کا زور ہوا تو جمعیۃ علماء کو زیادہ فعال عہدہ داروں کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ صدر اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا سجاد کی عمر نے وفا نہ کی ان کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مولانا حفظ الرحمٰن

صاحب ناظم اعلیٰ ہوئے۔ مولانا مدنی کے زمانہ صدارت میں مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب دونوں حضرات تازندگی جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔

بہار کا فساد ہوا تو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ میں مولانا مدنی نے فرمایا کہ فساد زدہ علاقے کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ اپنی اپنی بستیوں کو نہ چھوڑیں۔ میں حاضر تھا، بولا کہ مسلمان ان بستیوں کو چھوڑ چکے ہیں جن پر حملے ہوئے یا جو خطرے میں تھے۔ جب تک ہم ان بستیوں میں نہ جائیں اور ان کا خوف دور نہ کریں وہ کیسے آسکتے ہیں۔ مولانا مدنی نے فوراً مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان بستیوں میں دورہ کے لئے میرا پروگرام بنائیے۔ لیکن مسلم لیگ کا زور تھا۔ مسلمانوں میں غصہ تھا۔ مسلم دشمن درندے مسلمانوں کو ختم کرنے کی غرض سے گھوم رہے تھے۔ پولیس کا عملہ ذمہ دار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ پہلے ہم آجائیں جب آپ کا پروگرام بنائیں گے۔ بہرحال اس سے مولانا مدنی کی جرأت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا مدنی ان لوگوں میں تھے جو خوف اور مصیبت کے مواقع پر آگے رہتے اور جب نوازش واکرام کا وقت آیا تو میدان سے ہٹ گئے۔

اجودھیا کی مسجد مسلمانوں کے لئے بند کردی گئی تو اس کا بھی مولانا مدنی پر بہت اثر ہوا۔ مولانا محمد میاں نے مجھ سے فرمایا کہ ان کا اصرار تھا کہ جمعیۃ کی طرف سے سول نافرمانی کی جائے لیکن ان کے رفقاء نے کہا کہ ہم تو جیل میں ٹھیک رہیں گے لیکن عام مسلمانوں میں اس وقت مقابلہ کی طاقت بالکل نہیں ہے۔ وہ پریشان پھر رہے ہیں اس لئے یا تو عام مسلمان شریک نہیں ہوں گے یا شریک ہوئے تو ان کو بہت زیادہ اذیت دی جائے گی، جس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دوستوں کی رائے نہ پاکر مولانا مدنی خاموش ہوگئے لیکن اسکی تکلیف ان کو آخر وقت تک رہی۔

فسادات کو روکنے میں کانگریس جس طرح ناکام رہی اس کا مولانا مدنی کو بہت غصہ تھا اور انھوں نے کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اور صدر جمہوریہ نے ان کو اعزاز بخشا تو انھوں نے اس کو واپس کردیا تھا۔ مولانا کی کانگریس سے وابستگی مسلمانوں کے مفاد کے لئے تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کانگریس مسلمانوں کے لئے نفع بخش نہیں تو اس

سے دست بردار ہو گئے اور سرکاری اعزاز بھی قبول کرنا گوارہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر اقبال سے مولانا کا اختلاف بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام جوش اسلامی کا آئینہ دار تھا۔ ان کو پڑھ کر بڑا جوش پیدا ہوتا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں میں اچھی مقبولیت حاصل تھی، لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا عمل انکے اشعار یا گفتار کے مطابق نہ تھا۔ وضع قطع انگریزی تھی اور جو لوگ انگریزوں سے قریب تھے وہی ان سے بھی قریب تھے۔ چنانچہ ان کو سر کا خطاب ملا انھوں نے اپنے استاد کو شمس العلما، کا خطاب دلوایا۔ اس ماحول میں وہ حریت پسندوں کا ساتھ کیسے دے سکتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ تھیں جن میں سروں اور خان بہادروں کی کمی نہیں تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی مسلم لیگ کے سخت خلاف تھے۔ اس لئے اگر وہ ڈاکٹر اقبال کے قلم سے مطعون ہوئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوئی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے کسی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ "آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں" ظاہر ہے کہ مولانا نے ایک واقعہ بیان کیا تھا، کیا ہونا چاہیئے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا لیکن اقبال نے ایک رباعی ان کی توہین میں لکھ دی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے قوم کا لفظ بدل کر ملت کا لفظ لکھا اور ان کی نسبت کہا کہ ؎

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است

مولانا حسین احمدؒ نے جواب میں لکھا کہ انھوں نے ملت کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ قوم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ملت کے معنیٰ شریعت اور دین کے ہیں۔ اور قوم کے معنیٰ گروہ کے ہیں اس پر ڈاکٹر اقبال نے دوسرا بیان دیا ۔ انھوں نے کہا کہ جدید عربی میں ملت کا لفظ قوم کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی نے اس وقت لکھا تھا کہ مولانا حسین احمد جدید و قدیم دونوں عربی جانتے ہیں، لیکن اقبال تو دو میں کوئی عربی بھی نہیں جانتے۔ بہرحال سید سلیمان ندویؒ نے جو مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبال دونوں کے دوست تھے۔ معارف میں لکھا کہ ،، ملت جدید عربی میں قوم کے لئے مستعمل اگر ہوا بھی ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عربی میں ملت قوم کے لئے نہیں استعمال ہوا ہے "۔

آخر میں مولانا حسین احمدؒ نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھ دیا جو ان کے کمال علم کا آئینہ دار ہے اور جس میں تاریخ و سیاست، فقہ عربی ادب و حدیث سے اقبال کے فلسفہ کی تردید کی گئی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ افسوسناک رباعی بغیر کسی نوٹ کے اقبال کے مجموعۂ کلام میں شائع کر دی گئی ہے اسی لئے اس تفصیل کی ضرورت پڑی، ورنہ دونوں اللہ کے پیارے ہو چکے ہیں۔ دونوں سے اللہ نے دین کی خدمت لی تھی اور دو میں کوئی معصوم نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

مولانا کو سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دیوبند کیلئے مالی امداد حاصل کرنے کی بھی فکر رہتی تھی۔ جونپور میں جمعیۃ علماء کا اجلاس ہوا تو مولانا نے بہار کے شرکار جلسہ سے ملنے کی خواہش کی، میں بھی موجود تھا۔ ہم سب جمع ہو گئے، مولانا نے ہم سے اپیل کی کہ دیوبند مدرسہ کی مالی امداد کے لئے ہم اپنے یہاں کوشش کریں۔

مولانا آسام میں رمضان کا زمانہ گزارتے تھے جہاں دیوبند کی مدرسی سے پہلے ان کا قیام تھا اور جہاں ان کے ماننے والے کثرت سے تھے۔ مولانا آسام جاتے تو کلکتہ میں ایک دو روز قیام کرتے اور اسی طرف سے واپس بھی ہوتے۔ میں کلکتہ گیا تو جن بڑے لوگوں کی زیارت کا مجھ کو پہلی بار موقع ملا ان میں ایک مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے۔ جب مسلم لیگ کا زور ہوا تو مسلم لیگی حضرات بھی ان پر اعتراض کرنے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ مولانا انکا جواب محبت، نرمی اور دلیل کے ساتھ دیتے تھے۔

ایک بار مولانا کے ایک بنگالی مرید کے یہاں تقریب شادی تھی۔ ان کی خواہش پر مولانا نے ایک بنگالی شاگرد کو جو دیوبند سے فوراً ہی فارغ ہوئے تھے اپنے ساتھ لے آئے تھے، تاکہ اس سے اپنے ان مرید کی بچی کا عقد کر دیں۔ مولانا کے بنگالی مرید نے جو حکیم بھی تھے اور جن سے میرا ملنا جلنا پہلے سے تھا مجھ کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا تھا اور میں نے اس میں شرکت کی تھی، اس قدر سادہ اور بے تکلف شادی میں میں اپنی زندگی میں پہلی بار شریک ہوا تھا۔ ہم چند آدمی تھے۔ مولانا نے نکاح پڑھایا۔ دین مہر فاطمی تھا، کھجوریں تقسیم ہوئیں اس کے بعد ہم سب نے ناشتہ کیا اور لڑکا اندر بلایا گیا۔ نہ کوئی رسم ہوئی، نہ گانا بجانا ہوا، نہ لڑکے کے جسم پر کوئی

پر تکلف کپڑا تھا۔ مولانا حسین احمدؒ نے اپنے پاس سے ایک عبا ان کو پہنا دیا تھا۔ اس کے بعد ہم سب واپس آ گئے۔ پھر اس کے بہت زمانہ کے بعد اسی طرح کی شادی مولانا عثمان غنی صاحب سابق مفتی و ناظم امارت شرعیہ کے لڑکے نعمان سلمہٗ کی ہوئی جس میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ مسلمان شادیوں میں غیر ضروری طور پر خرچ کرتے ہیں، حالانکہ نکاح ایک دینی کام ہے اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں سادگی کے ساتھ انجام پاتا تھا۔

دوسرا قابل تذکرہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میں جمعیۃ علماء کلکتہ کا ناظم تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند نے جنگ کے خلاف ایک تجویز منظور کی تھی، لیکن اسے ہندوستان کے کسی پریس نے نہیں شائع کیا تھا۔ مولانا عبد الحلیم صدیقی نے مجھ کو لکھا کہ اگر کلکتہ میں یہ تجویز چھپ سکے تو اس کا نسخہ بھیج دیا جائے۔ میں نے وہ نسخہ منگوالیا اور اس کے کئی ہزار نسخے چھپوائے، لیکن اس پر پریس کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ اب انکے دہلی پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ انھیں دنوں مولانا حسین احمدؒ آسام سے تشریف لائے۔ میں مولانا سے ملا اور کہا کہ جمعیۃ کے پتہ کی جگہ کسی دوسرے معتمد آدمی کا دہلی کے پتہ بتا دیجئے کہ ان اشتہارات کو بھیج دیا جائے۔ مولانا نے کہا کہ "مجھ کو دے دیجئے"، میں نے کہا کہ اشتہارات ملنے میں دو تین روز کی دیر ہے۔ اس پر مولانا نے ایک صاحب کا پتہ بتا دیا اور میں نے اس پتہ پر ڈاک سے اشتہارات بھیج دیئے۔

اس موقع سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ "میں مولانا حسین احمد صاحبؒ سے مرید ہونا چاہتا ہوں، لیکن وہ راضی نہیں ہیں۔ آپ سفارش کر دیں" میں نے کہا کہ "میرے مولانا سے ایسے تعلقات نہیں ہیں کہ میرے کہنے سے آپ کو مرید کر دیں گے، جبکہ وہ انکار بھی کر چکے ہیں۔" اس پر وہ حضرت کہنے لگے "میں نے دیکھ لیا ہے کہ مولانا کس طرح آپ سے علیحدہ باتیں کر رہے تھے، کسی بہت قریبی آدمی سے ہی اس طرح کی گفتگو ہو سکتی ہے۔" میں ان کو وجہ تو بتا نہیں سکتا تھا اس لئے میں نے مزاحاً کہا کہ میرے کہنے سے اگر آپ کو مولانا مرید کر دیں تو آپ کتنی مٹھائی کھلائیں گے۔ انھوں نے جواب دیا جتنا آپ کھا سکیں۔

چنانچہ میں ان کو لے کر مولانا کے پاس آیا۔ مولانا متعجب ہوئے کہ میں پھر اس قدر

جلد کیوں آگیا۔ بولے کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت آپ ان کو مرید کرلیں۔ کہنے لگے تمہارا کیا فائدہ۔ میں نے عرض کیا انھوں نے مٹھائی کھلانے کا وعدہ کیا ہے۔ مولانا ہنسے، اور اس کے بعد ان کو مرید کرلیا۔ اصل میں سرائے میر میں مولانا اشرف علیؒ کے ایک خلیفہ مولانا عبدالغنی صاحب کے مدرسہ میں یہ صاحب کام کرتے تھے۔ شیخ کو خیال ہوا کہ مرید کرنے کے بعد ممکن ہے ان کو تکلیف ہو جائے۔ اس لئے انکار کرتے تھے۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو مرید کرلیا۔

مولانا حسین احمدؒ کا متواضع ہونا تو مشہور ہی ہے۔ کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ وہ مولانا سے ملنے دیوبند گئے۔ تھکے ہوئے تھے اس لئے جلد سو گئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی پاؤں دبا رہا ہے، آنکھیں کھول دیں تو دیکھا کہ مولانا حسین احمدؒ ہیں۔ اٹھ بیٹھے اور کہا حضرت یہ کیا؟ فرمانے لگے آپ تھکے ہوئے تھے اس لئے خیال آیا کہ پاؤں دبادوں۔ مولانا کی تواضع اور بے نفسی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح میں ایک بار جمعیۃ علماء ہند دہلی کے دفتر گیا۔ معلوم ہوا کہ شیخ برابر کے کمرے میں ہیں۔ میں ان سے مصافحہ کرنے کی غرض سے فوراً ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ مولانا مصافحہ کرکے دو زانو میرے پاس بیٹھ گئے۔ اس ادب سے میں شرمندہ ہو گیا۔ اتنے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آگئے، انھوں نے کہا جاؤ تم اپنا کام کرو۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی نکلے اور کہنے لگے یہ تو ایسا کرتے ہی ہیں۔ تم مصافحہ کرکے چلے آتے۔

"چھپرا" میں جمعیۃ علماء صوبۂ بہار کا اجلاس تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب صدر اجلاس تشریف لائے تو شیخ پہلے سے موجود تھے۔ فوراً کھڑے ہو گئے، اور اپنی جگہ چھوڑ کر کہنے لگے، آپ یہاں بیٹھئے، آپ صدر اجلاس ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب یہ کہہ کر "صدر ہر جا کہ نشیند صدر است" دوسری جگہ بیٹھ گئے اور امتیازی جگہ شیخ کے لئے چھوڑ دی۔

مولانا سیاسی سرگرمیوں، درسی مشغولیتوں اور بیعت و ارشاد کے کاموں کے

باوجود بہت شب بیدار تھے۔ عبادات میں بڑے مستعد۔ مولانا کے کمرے سے دات بھر چلنے کی پیالیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ممتاز مسلمانوں میں میں نے اس قدر محنتی کسی کو نہیں پایا۔ ہندوؤں میں بھی گاندھی جی اور جواہر لال کے سوا کوئی ان کی محنت، مستعدی اور جفاکشی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

آزادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بہت مقبولیت عطا کی۔ ملک کے طول و عرض میں لاکھوں مسلمان ان سے مرید ہو گئے لیکن اس سے مولانا کے عجز و انکسار میں فرق نہیں آیا۔ مولانا کا تواضع وہ فطری تواضع تھا جو خدا سے تعلق اور اپنی بے حقیقتی کے استحضار سے پیدا ہوتا ہے۔

جب جمعیۃ علماء بہار نے زکوٰۃ کی رقمیں وصول کرنا شروع کیں تو مولانا شاہ قمر الدین امیر شریعت ثالث کی شکایت پر میں نے شیخ کو خط لکھا۔ شیخ نے فوراً ایک بیان اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیا کہ اسے مقامی اخبارات میں شائع کرا دیا جائے۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ جمعیۃ علماء کے کارکن زکوٰۃ کی رقمیں جمعیۃ کے لئے وصول نہ کریں، بلکہ وہ لوگوں سے کہیں کہ امارت شرعیہ کو زکوٰۃ ادا کریں۔ یہ بیان "نقیب" میں مولانا عثمان غنیؒ نے بھی شائع کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امارت شرعیہ کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

آزادی سے پہلے مولانا کی تقریروں میں جو میں نے سنی تھیں انگریزوں کے حوالوں سے یہ بتایا جاتا تھا کہ ہندوستان ان کے عہد میں معاشی طور پر کتنا پست ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کے پاس انگریزوں کے اقوال کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ اور وہ اقوال مولانا کو حفظ بھی تھے۔ آزادی کے بعد مولانا اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو صبر و ضبط اور اطاعت الٰہی اور خدمت خلق کی نصیحتیں فرماتے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے مجھ سے کہا تھا کہ ذہانت اور طباعی میں تو دعویٰ نہیں کرتا لیکن تقویٰ، خلوص اور عبادت الٰہی اور استاد کی خدمت اور مجاہدانہ زندگی میں مولانا پڑھنے کے زمانے میں بھی اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ کوئی ان کا مقابل نہیں تھا اور یہ کہ وہ ان کو شیخ الہند کا جانشین اور اپنا امیر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کلکتہ کے خطبے میں کہا تھا کہ اگر مولانا حسین احمدؒ

ان کی ہندوستان کی واپسی پسند نہیں کرتے تو وہ ہندوستان نہ آتے ۔

جمعیۃ علماء کے اجلاس سہارنپور کے بعد راقم الحروف کو دیوبند حاضر ہونے کا موقع ملا میں نے دیکھا کہ شیخ کا دسترخوان کافی وسیع ہے جو ان کی فیاضی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چٹائیوں کے گول گول دسترخوان جو غالباً مکہ سے لائے گئے تھے بچھے ہوئے تھے۔ اور لوگ حلقہ بنا کر کھانا تناول کر رہے تھے۔ مولانا کا دسترخوان وسیع تھا ان کی فیاضی اور مہمان نوازی ان کے اعلیٰ اسلامی اخلاق کا آئینہ دار تھی۔ مولانا متقی اور خداترس بھی تھے، کریم النفس اور مہماں نواز بھی۔ متواضع اور منکسر مزاج بھی، عالم دین بھی اور متحرک سیاسی لیڈر بھی۔ اتنی خوبیاں اب ایک شخص میں کیسے ملیں گی۔

مولانا احمد سعید مرحوم دہلوی

مولانا ان اہم شخصیتوں میں سے ہیں جن سے بہت سے دوسروں کی طرح میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تو طے نہیں کیا، لیکن ان کے مواعظ کثرت سے سنے اور ان کی کتابیں بھی پڑھیں۔ مولانا نے ۷۵ برس کی عمر میں ۵۹ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا کے اسلاف عرب سے آکر دہلی میں رہ رہے تھے۔ مولانا نے جمعیۃ علمائے ہند کی تاسیس میں حصہ لیا اور ۴۰ء تک اس کے ناظم رہے اور اس کو ایسے اہم مقام پر پہنچایا کہ مسلم لیگ کا طوفان بھی اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ وہ جنگ آزادی کے پیشواؤں میں تھے۔ ہندوستان کے علماء نے دینی ضرورت سمجھ کر آزادی کی جنگ میں شرکت کی تھی، ان کی قربانیاں بھی اس میدان میں کسی سے کم نہ تھیں۔

مولانا ابتدا علم دین کے حصول کے بعد آریوں سے مناظرہ کرتے رہے، اس کے بعد سیاسی میدان میں آئے، خلافت تحریک میں حصہ لیا، شدھی سنگٹھن کا مقابلہ کیا۔ فتنۂ ارتداد کے استیصال میں شاردا ایکٹ کی مخالفت میں نہرو رپورٹ کے ہنگاموں میں ہر جگہ قائدانہ حصہ لیا۔

مولانا کے مواعظ عجیب و غریب قسم کے ہوتے تھے، کسی وعظ میں کوئی موضوع نہیں چھوٹتا تھا۔ تفسیر بھی، حدیث بھی، فقہ بھی، منطق و فلسفہ و کلام بھی، تاریخ بھی، سیاست بھی، معاشیات بھی، ادب و شاعری بھی، لطائف و ظرائف بھی، سماجی مطالعہ بھی اور بیان بھی؛ اس طرح کرتے کہ لوگ بے حس و حرکت سنتے۔ بقول عطاء اللہ شاہ بخاری ایسا معلوم ہوتا جیسے وحی اتر رہی ہے۔

مولانا نے جمعیۃ کی نظامت چھوڑی تو اس کے نائب صدر ہوئے، اور مولانا حسین احمد کے بعد جمعیۃ علماء کے صدر ہوئے۔ دہلی میں فساد پھوٹ پڑا۔ تو مولانا حفظ الرحمٰن

صاحب کے ساتھ فسادکو روکنے اور مسلمانوں کو بچانے میں دن رات ایک کر دیا، اس وقت مسلم لیگ کے رہنما ہندوستان سے فرار ہو رہے تھے یا زلہ ربائی اور کاسہ لیسی کا طریقہ اختیار کر رہے تھے۔ مولانا نے حکومت سے کوئی عہدہ نہیں لیا اور لکھنؤ کانگریس میں کہا کہ "میں ہندوستان چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ جیوں گا اور یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مروں گا۔ ہاں، جب سب مسلمان چلے جائیں گے تو میں آخری آدمی ہندوستان سے جاؤں گا۔"

مولانا سجادؒ سے بے حد قریبی دوستانہ تعلقات تھے اور ان کے انتقال پر مولانا احمد سعید صاحب نے اپنے شدید صدمہ اور غم کا اظہار کیا۔ مولانا سجادؒ کی حمایت اور تقویت کے لئے صوبہ بہار کے تقریباً ہر علاقہ میں پہنچے، اور اپنی پرجوش تقریروں سے مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ امارت شرعیہ کا ساتھ دیں۔ مولانا سجادؒ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی، تو اس کے اجلاس کی صدارت مولانا احمد سعید صاحب نے کی۔

مولانا نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان کی کتابیں "جنت کی کنجی" اور "دوزخ کا کھٹکا" کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ترجمہ اور اس کا مفصل حاشیہ بھی لکھا۔ اگر مولانا یہ سب کتابیں نہ لکھتے، تو ان کے مواعظ ہی کتابی شکل میں ان کی سنہری یادگار ہوتے، جو آج بھی جاندار ہیں اور ہمیشہ جان دار رہیں گے۔ ایک جگہ آپ نے مسلم لیگیوں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی تھی، اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر درج ذیل ہے

"یوسف علیہ السلام کا سابقہ جس بادشاہ سے پڑا تھا، وہ کافر تھا آپ نے اس کافر بادشاہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ تو پہلے حکومت سے دست بردار ہو جا، تب میں آنے والے قحط کی روک تھام کروں گا، بلکہ جب آپ نے قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی تو بادشاہ نے کہا، یوسف! یہ ساری تدبیریں کون کرے گا، کون اتنا ہوشیار اور دیانت دار ہے، تو اس کے جواب میں حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ خدمت میرے سپرد

کر دیجیے ، میں اس کی دیکھ بھال کر لوں گا میں اس کا پورا علم رکھتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا نظام اسلامی طرز کا نہ بھی ہو اور کوئی مسلمان دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ اس حکومت میں شریک ہو کر میں بندگان الٰہی کی صحیح خدمت انجام دے سکتا ہوں اگر میں نے اس حکومت سے عدم تعاون کیا تو اس سے فائدہ کی جگہ بڑا نقصان ہوگا، تو ایسی صورت میں غیر اسلامی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا صرف مباح ہوگا، بلکہ ایک نبی کی سنت پر عمل ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس تعاون کے درست اور نادرست ہونے کا دارومدار خلوص نیت پر ہوگا، اور ایسی صورت میں ہوگا کہ اس تعاون سے مسلمانوں اور اسلام کو نقصانات پہنچے گا اندیشہ نہ ہو۔ اگر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو تعاون جائز نہیں ہوگا۔

جس طرح کافر کے ہر فعل کو کفر نہیں کہہ سکتے، اسی طرح کافر حکومت کے ہر فعل کو غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے۔ آخر اس آیت کا مطلب کیا ہوگا

"تعاونوا علی البرّ والتقویٰ" (نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو) کیا ایک غیر مسلم نیکی کا کام نہیں کر سکتا، کیا کوئی غیر مسلم آگ بجھانے کے لئے تمہیں آواز دے گا تو اس کی امداد کرنے کے لئے تم کھڑے نہیں ہو جاؤ گے؟ آگ لگنے دو گے خواہ سارا محلہ پھنک جائے؟"

"ارے بھائی اسلام تو عالمگیر صداقت ہے۔ ہر صورت حال کے لئے اس میں ہدایت موجود ہے، خالص اسلامی اقتدار کی کوشش سے کون روکتا ہے۔ یہ آرزو کس کے دل میں نہیں ہے کہ زمین کے ہر کونے میں اسلامی اقتدار قائم ہو، لیکن اس جمہوری دور میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کی شکل زور زبردستی اور جہاد تو نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی کسی

ھند میں ہوا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اسلام کی صداقت کا جو سکہ عوام
کے دلوں پر قائم کرو، ہم اسلام کی برکتوں کے قائل ہوں، اسلامی قانون
کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھنے لگیں اور خود مسلمان بھی اسلامی
قانون کو نافذ کرنے کے قائل ہوں جو معمولی بات نہیں ہے۔

ایسی صورت میں بھائی تم نے بھی غور کیا کہ اگر اسلامی قانون نافذ
کرنے پر ملک میں رائے شماری کرائی جائے تو غیر مسلموں کو جانے دو،
خود مسلمان کتنے ہوں گے، جو اسلامی قانون کے حق میں ووٹ دیں گے۔
اگر جوش میں آکر ووٹ دے بھی دیئے تو کتنے دن اس نظام کو
چلنے دیں گے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کی انفرادی زندگی ٹھیک کرو
اور ایک دو مسلم ملک میں اسلامی قانون نافذ کرکے ساری دنیا کو اس
خیر و برکت کا مشاہدہ کراؤ، تب ہندوستان جیسے ملک میں ایسے
نعرے لگاؤ۔"

مولانا کی یہ تقریریں اگر مسلمان غور سے سنتے تو ان کی حالت بدل جاتی، لیکن
افسوس انھوں نے توجہ نہیں کی۔ مولانا سے میری ملاقاتیں گیا، کلکتہ، اور دہلی میں رہیں،
میں نے ان میں سمجھنے اور سمجھانے دونوں کی صلاحیتیں پائیں، لیکن جنھوں نے کانوں میں
انگلیاں ڈالیں اور اپنی آنکھیں بند کرلیں وہ نہ بجلی کا کڑکا سن سکتے تھے نہ سورج
کی روشنی دیکھ سکتے تھے، بہرحال مولانا نے اور ان کے رفقاء نے اپنا فرض ادا کردیا
اور وہ عنداللہ ان شاء اللہ ماجور ہوں گے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جدوجہد آزادیٔ وطن اور اقامت دین کے لئے رہی مجلس احرار اسلام اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے انگریزوں سے معرکہ آرا رہے، اور اس وجہ سے زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ جب جیل سے نکلتے تو ان کی شعلہ بیانی کی بدولت قصرِ حکومت میں زلزلہ آ جاتا۔ وہ ملک کے طول و عرض میں سفر کر کے اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے اور پھر حکومت کے لئے ۔۔ کے سوا چارہ نہ رہتا کہ انھیں بند کر دے۔ اس طرح یہ فقرہ ان کے مناسب حال ہے کہ ان کی آدھی زندگی جیل میں گزری اور باقی زندگی ریل میں۔

مولانا نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کی، بلکہ کشمیر کے پژمردہ مسلمانوں کو اٹھانے میں بھی انھوں نے زبردست حصہ لیا۔ جس وقت شیخ عبداللہ اندرونِ کشمیر میں مہاراجہ کی زبردست طاقت سے لڑ رہے تھے، اس وقت پنجاب اور دیگر صوبوں سے مولانا نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ ہزاروں رضاکار جمع کر کے کشمیر بھیجا، تاکہ راجہ کی طاقت سے ٹکر لی جائے۔ مہاراجہ نے مجبور ہو کر حکومت ہند سے مدد طلب کی، حکومتِ ھند نے مدد تو کی اور اپنی فوج کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھیج دی، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کمیشن مقرر کر دیا جسے ایجی ٹیشن کے اسباب پر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ ریاست کے عوام کی حکومت میں کوئی آواز نہیں ہے اور برطانوی ہند میں رفتہ رفتہ اصطلاحات نافذ ہو رہی ہیں، ان کے اثر سے کشمیر کے عوام بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے یہاں بھی اس طرح کی اصلاحات ہوں، چنانچہ برطانوی حکومت کے دباؤ سے کشمیر میں اصطلاحات کی بنیاد پڑ گئی۔ اسی طرح شاہ صاحب نے اپنی پُرزور کوششوں سے پاکستان

میں قادیانیوں کا زور بھی توڑ دیا۔ گرچہ اب بھی پاکستان میں قادیانی مضبوط ہیں لیکن پہلے کے مقابلہ میں ان کے اثرات کم ہیں۔ اس از برآرائی زبان و قلم میں مولانا اور ان کے رفقار دار ورسن کی منزل کے قریب پہنچ گئے تھے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں مولانا کی شخصیت معروف اور مسلم تھی، وہ جہاں بھی پہنچ جاتے ان کے مخالفین بھی ان کی تقریر سننے آجاتے، وہ گھنٹوں بھی بولتے رہتے تو لوگ مسحور ہو کر سنتے رہتے، فیاضِ ازل نے گفتگو اور تقریر کی غیر معمولی قدرت سے انھیں نوازا تھا۔ مولانا ایک اجتماع میں پنجاب کے امیر شریعت منتخب ہوئے تھے، لیکن ان کی ہنگامی زندگی نے ان کو موقع نہیں دیا کہ اپنی امارت کو منظم کریں۔ یہ ایک تقدیری بات تھی ورنہ امارت شرعیہ ہندوستان گیر پیمانہ پر بن چکی ہوتی۔

مولانا تھے تو پنجاب کے، لیکن ان کی نانہال پٹنہ سٹی میں تھی، انھوں نے اپنے لڑکپن کا حصہ اور عنفوان شباب تک کا زمانہ گیا میں گزارا کیونکہ ان کے والد جامع مسجد گیا میں امام تھے پٹنہ میں ان کے رشتہ دار اور گیا میں ان کے جاننے والے موجود تھے۔

مولانا کا حافظہ غضب کا تھا۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا کہ وہ گیا آئے، جامع مسجد پہنچ کر وہ تحیۃ المسجد پڑھنے لگے، سامنے ایک آدمی آ کے کھڑا ہوا جو بہت معمولی شکل وصورت اور معمولی لباس میں تھا مولانا نے سلام پھیر کر اس سے معانقہ کیا اور کہا کہ آپ کو چالیس برس کے بعد دیکھا ہے، جب کہ ان کا لڑکپن تھا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کا تعلق ہندوستان سے نہیں رہا، لیکن ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں خان عبدالغفار خان، مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح مولانا کے نام کو بھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔

مولانا کو میں نے گیا میں قریب سے دیکھا تھا، ان کی جرأت اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں ان کی مجاہدانہ زندگی اور غیر مصالحانہ روش مجھ سے کہتی تھی کہ تو بھی نہ ڈر اور بے خطر اس آتش نمرود میں کود جا۔ مولانا نے جس طرح ساری زندگی جہاد آزادی میں گذاری اور مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں بس

کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی ہے۔ وہ آزادی کی لڑائی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار
بھی اور تنہا لشکر جرار بھی۔ ان کے نفس گرم کی تاثیر نے ہزاروں اشخاص کے دلوں
میں آزادی کا جوش بھر دیا۔ اس دور کو دیکھنے والی نسل بھی اب تیزی کے ساتھ ختم
ہوتی جا رہی ہے، رہے نام اللہ کا۔

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیمیافتہ تھے۔ چہرے پر گھنی بڑی داڑھی تھی۔ اساتذہ کا درجہ رکھتے تھے، صنف غزل کے ستون تھے۔ اردو ادب میں ان کا اونچا مقام تھا اردوئے معلّی اور مستقبل وغیرہ رسالے نکالتے تھے۔ سیاسیات میں بھی مقام معمولی نہیں تھا۔ اخلاص میں بھی ان کے برابر کے کم لوگ تھے۔ لیکن ان میں انفرادیت بہت تھی۔ اس لئے کسی جماعت کے ساتھ نہیں چل سکے۔ کئی بار جیل گئے۔ جیل میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں سے انکار کرم یکسر
اے صاحب میخانہ کچھ لطف و عنایت بھی

انہوں نے کانگریس میں اس وقت مکمل آزادی کی تجویز پیش کی جبکہ گاندھی جی اور جواہر لال بھی یہ نہیں سوچتے تھے۔ اس وقت حسرت موہانی کی یہ تجویز منظور نہیں ہوئی اور گاندھی جی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا کہ ان سے زیادہ سیاسی موقف کے لئے لڑنے والا ہم نے کسی سیاسی لیڈر کو نہیں دیکھا۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں جواہر لال کی صدارت میں کانگریس

نے مکمل آزادی کی تجویز منظور کی لیکن اس سے پہلے حسرت کانگریس کو چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے متعدد پارٹیوں میں شرکت کی۔ اپنی پارٹی بھی بنائی لیکن چل نہ سکی۔

ایم این رائے بنگال کی تشدد پسند جگانتر پارٹی کے رکن تھے۔ کمسن تھے۔ ۱۶ برس کی عمر تھی کہ پارٹی کی طرف سے جرمنی بھیجے گئے جس سے انگریزوں کی لڑائی چل رہی تھی۔ غرض یہ تھی کہ اسلحے حاصل کر کے ہندوستان لائیں اور ان کی مدد سے یہاں بغاوت کی جائے۔ اسلحے حاصل بھی ہوئے اور جہاز پر آرہے تھے کہ انگریزوں کو پتہ چل گیا اس لئے ہندوستان سے قریب ہی کسی جگہ کپتان نے اس جہاز کو غرق کر دیا تھا کہ پکڑے نہ جائیں۔ اب ایم این رائے سمندر میں تھے۔ بہر حال وہ کسی طرح روس پہنچ گئے اور ذہنی غسل (BRAIN WASHING) کے ذریعہ ان کو کمیونسٹ بنا لیا گیا۔ انہوں نے جگانتر پارٹی کے لیڈروں کو لکھا کہ روس مدد کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ پارٹی کمیونسٹ ہو جائے۔ لیکن پارٹی والوں نے اس شرط کو قبول نہیں کیا۔ مجبوراً ایم این رائے خفیہ طور پر روس سے ہندوستان آئے اور کانپور میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ مولا حسرت موہانی اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ مولانا عبداللہ سندھی نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ روس میں تھے تو لینن کے بعد سب سے بڑے کمیونسٹ ایم این رائے سمجھے جاتے تھے۔ پھر انقلاب آیا۔ عالمی کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی بھی ملک کی نیشنلسٹ جماعت سے تعاون نہیں کرے گی۔ ایم این رائے کسی وجہ سے اس جلسہ میں نہیں تھے۔ ان کو معلوم ہوا تو اس تجویز کی مخالفت میں انہوں نے بیان دے دیا۔ اس کی وجہ سے وہ معتوب ہو گئے ہندوستان میں جو کمیونسٹ مذہب کے شدید مخالف تھے اور اس لئے وہ حسرت موہانی کو پسند نہیں کرتے تھے ان کو موقع ملا کیونکہ حسرت صاحب ایم این رائے کے بنائے ہوئے تھے انہوں نے روس کی مدد سے اس کمیونسٹ پارٹی کو توڑ کر دوسری کمیونسٹ پارٹی بنائی اس کے لیڈر مظفر احمد وغیرہ تھے۔ پھر بہت عرصہ کے بعد عالمی کمیونسٹ پارٹی نے اپنا فیصلہ بدلا۔ لیکن ایم این رائے ہمیشہ کے لئے معتوب ہو گئے۔ حسرت صاحب بھی کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ رکن نہیں رہے لیکن وہ آخر زندگی تک اپنے کو کمیونسٹ کہتے رہے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان یا تو کمیونسٹ ہو گا یا کمیونلسٹ۔ وہ نیشنلسٹ نہیں ہو گا۔ بہر حال حسرت صاحب کمیونسٹ

بھی رہے کیونلسٹ بھی رہے۔ صوفی بھی رہے شاعر بھی رہے اور غزل گو شاعر۔ آخر میں حسرت صاحب مسلم لیگ میں شریک ہوئے اور انہی کی کوششوں سے مسلم لیگ نے مکمل آزادی کی تجویز منظور کی۔ اگرچہ جناح صاحب کی مداخلت سے بجائے COMPLETE کے لفظ کے FULL تجویز میں رکھا گیا۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان نہیں گئے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ دستور ساز اسمبلی کے رکن ہوئے تھے لیکن مسلم لیگیوں نے تو ہتھیار رکھ دیا تھا۔ کچھ بڑے بڑے مسلم لیگی پاکستان بھی بھاگ گئے لیکن انہوں نے ہتھیار نہیں رکھا۔ دستور کی ہر دفعہ میں ہر "کوما" اور ہر "فل اسٹاپ" پر انہوں نے ترمیمیں پیش کیں اور جب ان کی ترمیموں کے بغیر دستور مکمل طور پر منظور ہو گیا، ارکان مجلس دستور ساز نے اپنے اپنے دستخط کئے تو انہوں نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ دستور رجعت پسندانہ ہے۔ پھر بھی جب راجیندر پرشاد نے ارکان دستور ساز کا فرداً فرداً تعارف کرایا تو حسرت صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور کانگریس پر زور دیا تھا کہ وہ مکمل آزادی کی تجویز منظور کرے۔

حسرت موہانی فقیروں کی طرح رہتے تھے۔ جب دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے کوئی بار دہلی کی ایک خالی مسجد میں انہوں نے قیام کیا۔ جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لئے وہ جامع مسجد جاتے وہاں سے کباب اور روٹیاں لے کر آتے۔ کباب تو اسی روز کھا جاتے کہ خراب نہ ہوں۔ روٹیاں سوکھ جاتیں۔ روزانہ ان کو پانی میں بھگو کر کھاتے۔ ان کے ارد گرد کتابوں اور اوراق کا ڈھیر ہوتا جن کو پڑھنے میں مشغول رہتے۔ دستور ساز اسمبلی کے مخالف ممبروں میں شاید ان سے زیادہ کسی نے مطالعہ پر اتنا وقت صرف نہیں کیا۔ مسلم لیگیوں میں تو وہ واحد آدمی تھے جو پوری طرح تیار ہو کر دستور ساز اسمبلی جاتے تھے۔ حکومت سے جو روپے ملتے تھے ان کا مصرف ان کے نزدیک یہ تھا کہ وہ ہر سال حج کو جائیں۔ جب تک ممبر رہے حج کرتے رہے۔ مطالعہ میں مصروف رہنے کی وجہ سے کپڑے بدلنے کی طرف توجہ نہ ہوتی تھی۔ اسلئے لوگ ان کے میلے ہونے کی شکایت کرتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کے انہماک اور استغراق کا عالم نمونہ ہے ان لوگوں کے لئے جو کسی مشن کے لئے کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔

حسرت صاحب کو میں نے زمانۂ طالب علمی سے جانتا تھا۔ میرے ایک بزرگ اور عزیز فضل الرحمٰن بلالی آبگلوی ان کے بہت معتقد تھے۔ وہ تقریباً روزانہ میرے یہاں آتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ حسرت صاحب کے حالات مجھ کو سناتے رہتے تھے۔ گو مجھ کو حسرت صاحب کی سیاسی کروٹیں پسند نہیں تھیں لیکن ان کا خلوص، ان کی جرأت، ان کی دور اندیشی، ان کی سادگی، ان کی قربانی، ان کی مذھبیت کا میں معترف ہو گیا تھا۔ خلوص اور جفاکشی اور استغنا کی مثالیں ایسی کم ملیں گی۔

میں نے حسرت صاحب کو کلکتہ میں قریب سے دیکھا۔ جب وہ اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ ان سے ملا بھی۔ ان سے باتیں بھی ہوئیں۔ وہ ہندوؤں کی نیشنلزم کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اپنی فرقہ پرستی کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی بات جواہر لال نے پنڈت مالویہ کا جواب دیتے ہوئے ایک زمانہ میں کہی تھی۔ مسلم لیگیوں کے بارے میں بھی حسرت صاحب کی اچھی رائے نہیں تھی۔ کہتے تھے کہ ان میں سب کچھ ہے اخلاص نہیں ہے۔ انہوں نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ آزادی کے بعد یہ ہندوؤں کی اسی طرح خوشامد کریں گے جیسے آج ان میں اکثر انگریزوں کی خوشامد کرتے ہیں۔

حسرت صاحب اردو غزل کے بڑے حامی تھے۔ اردو کانفرنس کی مجلس استقبالیہ میں جمیل مظہری صاحب نے غزل گوئی کی مخالفت کی تو حسرت صاحب برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے ان کا پرزور جواب دیا۔

انہوں نے سنا کہ فضل حق آزاد راقم الحروف کی والدہ کے ماموں تھے تو کہنے لگے آزاد اچھے شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں فنی غلطیاں نہیں ہوتی تھیں لیکن شعریت اور تغزل شاد عظیم آبادی کے کلام میں زیادہ ہے۔ گرچہ ان کے اشعار میں فنی غلطیاں ملتی ہیں انہوں نے بتایا کہ اردوئے معلیٰ میں دونوں شاعروں کا موازنہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بات لکھی بھی ہے۔

حسرت صاحب سے حسن ظن پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک خیال آیا اور وہ یہ کہ کوئی

جماعت معیارِ حق نہیں اور نہ کوئی جماعت ایسی خراب ہے کہ اس کے اندر کوئی اچھی بات نہ ہو اور اس سے استفادہ نہ کیا جائے۔ جماعتیں انسانوں کا مجموعہ ہیں اور انسانوں میں اچھی بری دونوں صفتیں موجود ہیں۔ اچھی طبعی ہیں اور بری اس کی اپنی اختیار کی ہوئی۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین۔ اس لئے عقل منشاء ہے جوہر فرد اور ہر جماعت کی خوبیوں کی قدر کرے اور ہر مکان کے گندے نالے سے اپنا دامن بچائے۔

دستور ساز اسمبلی میں حسرت صاحب نے مطالبہ کیا تھا کہ یوپی اور بہار کو دو زبان والے (BI LINGUAL) علاقے قرار دیئے جائیں۔ حسرت صاحب کی یہ بات تعصب کی اس آندھی میں جو اس وقت چل رہی تھی قبول نہیں کی گئی۔ لیکن لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ یہ دونوں صوبے اسی سمت جا رہے ہیں۔ اردو بہار میں دوسری سرکاری زبان قرار دی جا چکی ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جو شخصیتیں ہندوستان کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکیں ان میں ایک ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ مرحوم نے ہندوستان کے ڈاکٹروں میں سب سے اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ والیان ریاست، بڑے بڑے افسر، ہندو، مسلمان اور انگریز سب ان سے علاج کراتے تھے۔ اور وہ سب چھوٹے بڑے امیر غریب سے منکسرانہ ملتے۔ دوستوں پر تو جان دیتے تھے۔

یہ ضلع غازی پور کے ایک گاؤں یوسف پور کے قاضیوں کے مشہور و معروف زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حاجی عبدالرحمٰن تھا۔ آئی ایس ایس تک یوپی میں پڑھتے رہے پھر حیدر آباد چلے گئے اور مدراس یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری لی۔ پھر نظام حیدر آباد نے ان کو وظیفہ دے کر مزید تعلیم کے لئے لندن بھیجا۔ وہاں سے ۱۹۰۵ء میں اولاً ام بی ایس ایچ پی اور بعد میں ایف آر سی ایس اور ال آر سی کی ڈگریاں لیں۔ پھر ایڈنبرگ یونیورسٹی سے ام ڈی کی ڈگری۔ اس کے بعد لندن کے بڑے اسپتال میں ہاؤس سرجن مقرر ہوئے۔ پھر ریزیڈنٹ میڈیکل افسر بنے۔ ۱۹۰۹ء میں عورتوں اور بچوں کے لال اسپتال میں سول سرجن بنے۔

ڈاکٹر صاحب صرف ڈاکٹر نہ تھے۔ بہت بڑے سیاسی لیڈر بھی تھے۔ انقلابی لیڈر چاہتے تھے کہ کل کی جگہ آج ہی آزادی کا سورج طلوع ہو جائے۔ مسلم لیگ، کانگریس، خلافت کمیٹی ہر جگہ ان کی نمایاں حیثیت تھی۔ وہ کانگریس کی جان تھے۔ ان کی زندگی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے اکثر انہی کے مکان پر ہوتے تھے۔ اور مہمان نوازی کا فرض خوب خوب

ادا کرتے تھے۔ گاندھی جی افریقہ سے آئے اور انہوں نے ترکی خلافت کے سلسلہ میں بے چینی پائی تو مسلمان لیڈروں میں وہ سب سے پہلے ڈاکٹر انصاری سے ملے۔ جس طرح گاندھی جی کسی کو دوست بنا کر بہت مشکل سے اس کو چھوڑتے تھے اسی طرح ڈاکٹر انصاری بھی دوستی کو نباہنے والے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری اور گاندھی جی میں جو تعلقات ہوئے وہ آخر دم تک قائم رہے اور جب ڈاکٹر انصاری کا انتقال ہوا تو انہوں نے بیان دیا کہ "آج میرا باپ مر گیا"۔ سر سپرو نے کہا کہ ڈاکٹر انصاری میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی شرافت تھی۔ یہی الفاظ مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ کے اس تعزیتی جلسے میں کہے جسے اس ناچیز نے اپنے دوست معز الدین صاحب حال ایڈیٹر تہذیب الاخلاق علی گڑھ اور اپنے عزیز سید محبوب اشرفی کی مدد سے منعقد کیا تھا۔

کانگریس میں دو موقعوں پر ڈاکٹر انصاری نے اپنا لوہا منوایا۔ ایک کمیونل ایوارڈ کے موقعہ پر مسلمانوں کے حقوق کے سلسلہ میں ہندو مسلمان لیڈر آپس میں اتفاق نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے انگلستان کے وزیر اعظم میکڈانلڈ نے اپنا فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ کو کمیونل ایوارڈ کہتے ہیں۔ ہندو لیڈروں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری نے بیان دیا کہ حکومت برطانیہ کی ہندوستانی فیڈریشن کی اسکیم کو تو کانگریس قبول نہیں کرے گی لیکن کمیونل ایوارڈ کو وہ تسلیم کرتی ہے۔ پنڈت مالویہ نے اس بیان پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ ڈاکٹر انصاری کو پوری کانگریس کی طرف سے بولنے کا حق نہیں ہے۔ پنڈت مالویہ کے اس بیان پر ڈاکٹر انصاری نے کانگریس سے استعفےٰ دے دیا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کانگریس پنڈت مالویہ کو زیادہ وزن دیتی ہے جن کا تصور فرقہ وارانہ تھا یا ڈاکٹر انصاری کو جو متحدہ ہندوستان کے حامی تھے۔ جن کی نظروں میں ہندو مسلمان ایک تھے۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور گاندھی جی سمیت پوری ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ دیا کہ کانگریس کمیونل ایوارڈ کو تسلیم کرتی ہے اور ڈاکٹر انصاری سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ خلوص، محبت، بے لوث خدمت اور ایثار کے ذریعہ آج بھی ایک مسلمان ہندوؤں کے درمیان مقبول اور معزز بن سکتا ہے اور اسی میں بیشمار ان مسائل کا حل پوشیدہ ہے جنہیں مسلمانوں کی جماعتیں حل کرتے تھک گئی ہیں۔

دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہو رہا تھا۔ اور ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کے تحت صوبائی اسمبلیوں کا بھی۔ گاندھی جی انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے کہا کہ سڑکوں، گلیوں، میدانوں میں ہی ہم حکومت سے جنگ نہیں کریں گے بلکہ حکومت کے ایوانوں میں بھی کریں گے۔ مجالس قانون ساز میں قانونی لڑائی ہوگی اور مجالس قانون ساز کے باہر ظالمانہ اور غلط قوانین کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ چنانچہ گاندھی جی نے اپنی مخالفت میں نرمی اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ کانگریس نے ڈاکٹر انصاری کی حمایت میں فیصلہ دیا۔ کانگریس نے ان سے درخواست کی کہ وہ دہلی حلقہ سے مرکزی اسمبلی کے لئے کھڑے ہوں لیکن وہ اتنے بڑے تھے کہ حکومت کے ایوانوں میں سما نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے آصف علی کو اپنی جگہ کھڑا کیا۔ انتخاب کے بعد کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی منتخب ہوئے اور آصف علی حیف وہپ۔ یہ بھی ڈاکٹر صاحب کے ایثار اور بلند ظرفی کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔

ڈاکٹر انصاری مسلمانوں کے معاملات سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کے ڈاکٹروں کا ایک وفد لے کر ترکی گئے تھے اور وہاں مجاہد ترک زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام بڑی محنت سے انجام دیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کا تعلق ملک اور ملت دونوں کے ساتھ یکساں تھا۔

حکومت برطانیہ کی دعوت پر ایک وفد کے ساتھ لندن بھی گئے۔ لائڈ جارج یہ جاننا چاہتے تھے کہ فلسطین و عراق چھین کر مسلمانوں کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ اور ڈاکٹر انصاری یہ جاننا چاہتے تھے کہ حکومت برطانیہ کے پاس مسلمانوں کی مخالفت اور دشمنی کے لئے کیا کیا حیلے ہیں اور بے ضمیر مسلمانوں کو وہ کہاں تک استعمال کرتی ہے۔

کانگریس، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ ہی نہیں جن کی وہ صدارت کر چکے تھے بلکہ جو جماعت بھی آزادئ ہند کے لئے سرگرم ہوتی اس کی حمایت اور مدد ڈاکٹر انصاری اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ علمائے دیوبند میں مولانا محمود الحسنؒ کی جماعت نے ریشمی رومال والی سازش کی تو اس جماعت کے ساتھ ان کی پوری ہمدردی تھی۔ حکیم اجمل خاں نے طب یونانی کے فروغ

کے لئے طبیہ کالج دہلی کے نام سے ایک آزاد عظیم الشان ادارہ قائم کیا تو اس سے انہوں نے دلچسپی لی۔ مولانا محمد علی جوہر نے مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے آزاد یونیورسٹی بنائی اور مولانا محمود الحسنؒ کے ہاتھوں اس کی تاسیس کی رسم ادا ہوئی تو اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ حکیم اجمل خاں کے بعد اس کے چانسلر مقرر ہوئے۔ جب برطانوی حکومت کی سازش کامیاب ہوئی اور مسلمان رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہو کر رجعت پسندوں کے جھنڈے تلے جمع ہوئے تو انہوں نے مخالفین برطانیہ مسلم لیڈروں کو مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نام سے لکھنؤ میں جمع کیا اور ان کو للکارا کہ وہ رجعت پسندوں کا مقابلہ کریں۔

جب مولانا آزاد نے الہلال نکالا تو اس کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کرتے رہے اور جو مریض بھی آتا اس سے کہتے کہ الہلال پڑھو۔ ایک ڈاکٹر کسی مشن اور تحریک سے وابستہ ہو تو وہ اپنے کام کو بھی تحریک کے فروغ کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ یہی بات ایک استاذ اور مدرس کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اصل چیز ہے اندرونی جذبہ اس کے بعد راستے خود ہی کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ جلاوطن ہوئے تو ان سے بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے تعلقات کو قائم رکھا کیونکہ وہ بھی آزادی کے مقصد میں ان کے شریک تھے۔

نواب عبد اللہ خاں بھوپال بھائیوں میں چھوٹے تھے۔ لیکن ان کی ماں کا خیال تھا کہ وہ اپنے بھائیوں میں زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ خواہشمند نہیں کہ کسی طرح انگریزی حکومت حمید اللہ خاں کو ولی عہد بنانے کی اجازت دے دے۔ ڈاکٹر انصاری نے اس کے لئے لندن کا سفر کیا اور حمید اللہ خاں کے لئے منظوری لے کر آئے۔ جب حمید اللہ خاں نے اس احسان کا بدلہ ڈاکٹر انصاری کو دینا چاہا تو ان سے فرمائش کی کہ وہ بھوپال آجائیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ بھوپال کو دوسرا مختار احمد انصاری دیں گے چنانچہ بہار کے ڈاکٹر عبد الرحمٰن جو ترکی کے طبی وفد میں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ گئے تھے اور دہلی میں ہی مطب کرتے تھے، بھوپال بھیجے گئے اور وہ ریاست کے چیف میڈیکل افسر بنائے گئے۔ ڈاکٹر انصاری سے میری واقفیت ان کے واسطہ سے ہوئی۔

ڈاکٹر عبد الرحمٰن کے بھائی عبد الصمد مرحوم راقم الحروف کے بہنوئی تھے۔ اور دہلی میں ان

کا دواخانہ تھا جہاں ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے نسخے آتے تھے۔ گیا کے اجلاس کانگریس سے کچھ ہی قبل میری بہن کی شادی ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر انصاری گیا کانگریس میں شرکت کی غرض سے آئے تو والد نے اسی تعلق کی بنا پر ان کی دعوت کی تھی۔ اس دعوت میں اور لیڈر بھی شریک تھے۔ اس کے بعد میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے دہلی گیا۔ دہلی میں والدہ اور بہن کی دعوت بیگم انصاری کی طرف سے ہوئی۔ چونکہ میں بہت چھوٹا تھا اس لئے اس زنانہ دعوت میں شریک تھا۔ پھر ہم تین بھائی جامعہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اتفاق سے مجھ کو اور منجھلے بھائی کو کالی کھانسی ہوگئی۔ بڑے بھائی ہم کو لے کر ڈاکٹر انصاری کے یہاں گئے۔ ڈاکٹر انصاری کے یہاں پہلے فیس جمع کر دی جاتی تھی اس کے بعد ٹکٹ ملتے تھے۔ اسی ٹکٹ کے حساب میں کرسیوں پر مریض بیٹھتے تھے۔ اور باری باری سے ڈاکٹر صاحب کے پاس اندر بلائے جاتے تھے۔ چنانچہ میں بھی فیس جمع کر کے ٹکٹ لے کر منتظر بیٹھ گیا۔ جب باری آئی تو اندر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پہچان لیا اور کہا کہ آئیے شاہ صاحب۔ جب میں نسخہ لے کر واپس ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے آدمی نے فیس واپس کی اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو جامعہ میں کئی بار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ ہماری بہن (جن کا ذکر شاہ یعقوب صاحب مجددی کے حالات کے ضمن میں آگیا ہے) کے علاج کے لئے بھی کبھی کبھی آجاتے تھے۔ جو ان دنوں دہلی میں رہتی تھیں۔ اسی طرح گھر بھی ان سے ملاقات ہوتی۔ ایک بار بہن کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ عبدالصمد صاحب موجود نہ تھے۔ میں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو خبر کیا۔ وہ فوراً آگئے۔ واپس جانے لگے تو میں نے ان کا بیگ اٹھا لیا کہ ان کی موٹر تک پہنچا دوں۔ لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بیگ لے لیا۔ اور کہا "میرے ہاتھ ہیں۔"

پھر میں جامعہ چھوڑ کر "گیا" پڑھنے گیا۔ پھر کلکتہ چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔

ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے سکریٹری نے ایک واقعہ لکھا تھا جس سے ان کی شرافت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کا کہ وہ ذاتی معاملہ میں کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نواب بھوپال اور نواب رامپور کے درمیان ملاقات کی تجویز تھی۔ جب اطلاع ملی کہ نواب

بھوپال دہلی آرہے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ نواب رامپور کو تار دے دو کہ نواب بھوپال کل دہلی آرہے ہیں۔ انھوں نے تار دیا کہ "NAWAB BHOPAL REACHING TOMORROW" نواب بھوپال کل پہنچ رہے ہیں۔ رامپور میں یہ سمجھا گیا کہ نواب بھوپال رامپور پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے استقبال کی تیاریاں ہوئیں۔ اِدھر نواب بھوپال دہلی آئے اور واپس چلے گئے۔ رامپور سے دریافت کیا گیا کہ نواب صاحب کیوں نہیں آئے۔ سکریٹری نے کہا آئے تو تھے، انتظار کر کے چلے گئے۔ جب سکریٹری صاحب کو ان کی غلطی بتائی گئی کہ آپ نے دہلی کا لفظ نہیں لکھا تھا نواب صاحب کا رامپور میں انتظار کیا گیا تو بہت پشیمان ہوئے اور خائف، کہ ڈاکٹر صاحب بہت ناراض ہوں گے لیکن جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے قہقہہ لگایا اور خاموش ہو گئے۔ یہ غلطی ان کے سکریٹری نے جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔

ایک اور صاحب نے ایک واقعہ لکھا تھا۔ وہ جیل میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے ساتھ تھے اور مغموم رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے پوچھتے تھے کہ کیوں مغموم ہو لیکن وہ نہیں بتاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک روز ان سے پوچھا کہ تم اپنی خوشی سے جیل آئے ہو یا کسی نے زبردستی بھیج دیا ہے؟ اگر خوشی سے جیل آئے ہو تو بہادروں کی طرح خوش خوش رہو۔ اگر تمہیں یہ تکلیف اچھی نہیں لگتی تو آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اللہ کو منظور ہوگا تو ہندوستان تمہارے بغیر آزاد ہو جائیگا اس پر انھوں نے بتایا کہ جس وقت وہ گرفتار ہوئے ہیں گھر پر کھانے کو ایک دانہ نہیں تھا۔ بچے بھوک سے مر رہے تھے۔ اس وقت تک جلسہ جلوس اور نعروں کے درمیان گھر والوں کی تکلیف بھول رہا تھا۔ اب جب بیٹھا ہوں تو ان کی تکلیف کا خیال ستاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ دو ہفتے کے بعد ان صاحب کے پاس ان کی بیوی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ان کے پاس پانچ سو روپے منی آڈر سے آئے ہیں۔ بھیجنے والے نے لکھا ہے کہ یہ رقم ڈاکٹر انصاری صاحب کی ہدایت پر بھیج رہا ہوں۔ آپ اس کو اپنی ضرورت پر خرچ کریں۔

ان کے سفر لندن کے دو واقعات قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھے ہیں، جو ان کے ساتھ تھے۔ ان سے بھی ان کی شرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "مارسیلز پہنچ کر ٹامس کک کے نمائندے نے ہمیں بتایا کہ اس رات کو پیرس جانے والی ٹرین میں شب خوابی کے لئے ڈبے

خالی نہیں ہیں اس لئے رات بھر کا سفر بیٹھ کر کرنا پڑے گا۔ میری رائے تھی کہ اسی حالت میں ایک شب مارسیلز میں گذار دیں اور صبح کو دن کی گاڑی سے روانہ ہوں۔ یہ بحث ہو رہی تھی کہ نمائندہ پھر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شب خوابی کے ڈبہ میں دو بستر مل سکتے ہیں۔ وہ کسی راجہ صاحب کے لئے محفوظ تھے جنہوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے۔ یہ سن کر سیٹھ چھوٹانی نے کہا کہ فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔ انہوں نے اسی وقت دفتر میں اپنے آدمی کو بھیج کر دونوں بستر اپنے اور اپنے ملازم کے لئے محفوظ کرا لئے۔ سیٹھ کی یہ ادا مجھ کو بہت ناگوار لگی۔ بہت غصہ کی حالت میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ ہرگز نہ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے اس قسم کی باتوں کے لئے تیار رہ کر کام کرنا ہے۔ سیٹھ کو اگر اپنے آرام کا اس قدر خیال ہے تو نہ بھولو کہ وہ سیٹھ ہے اس سے زیادہ کی توقع اس سے نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے کہا یہ آپ کی توہین ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا توہین ایک اضافی اصطلاح ہے۔ سیٹھ بے چارے میری کیا توہین کر سکتے ہیں۔ میں خود ہی اپنی توہین کروں گا اگر اس ذرا سی بات کو وجہ شکایت بناؤں۔ چنانچہ اس رات میں اور ڈاکٹر صاحب ایک بھرے ڈبہ میں بیٹھے ہوئے اور جاگتے ہوئے پیرس آئے۔" قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ پچیس برس تک میرا ان کا ساتھ رہا لیکن ان کو ذاتی معاملہ میں غصہ کرتے نہیں دیکھا۔

قاضی صاحب نے دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے:-

"لندن میں ترکی وفد کو لنچ دینے کا میں انتظام کر رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب اور مسٹر حسین قدوائی آ گئے۔ قدوائی نے نشستوں کی ترتیب اس طرح بدلنی چاہی کہ ڈاکٹر صاحب کی نشست صدر صاحب سے دور ہو جاتی تھی۔ چنانچہ میں خفا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قدوائی صاحب کو ہٹا دیا اور مجھ سے کہا کہ نشستوں کی تقدیم و تاخیر سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کے لئے تم نے قدوائی سے جھگڑا کیا۔" آج قوم کے غم میں مرنے والے لیڈر اور علمائے کرام اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ ان میں یہ انا ہے یا نہیں اور وہ ڈاکٹر صاحب سے سبق لیں

ڈاکٹر انصاری انقلابیوں سے جتنا قریب تھے اور ان کی جس طرح مدد کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو ہندوستان سے حجاز جانے کا مشورہ دیا۔ دوران سفر میں انگریزوں کی گرفت سے بچایا اور جب وہ مدینہ منورہ میں قیام

فرار ہے تھے ان کے اخراجات کے لئے روپے بھیجے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی کانگریس کا الحاق
آل انڈیا کانگریس کے ساتھ منظور کرایا۔

شیخ عبداللہ

کشمیر کو پنجاب کی حکومت نے ایک برہمن زادے کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنی عمر کے آخر زمانہ میں کہا تھا کہ کشمیر کشمیریوں کا تھا دوسروں کو بیچنے کا اختیار نہ تھا اس لئے بیع و شراء دونوں ناجائز ہوئے تھے۔ یعنی راجہ کا کشمیر میں کوئی حق نہیں ہے۔

کشمیر کے ان ناجائز مالکوں نے کشمیر کو کس حال میں رکھا تھا؟ راجہ کے ہم قبیلہ جنت میں تھے اور غریب رعایا وہاں کی کثیر آبادی جہنم کا تجربہ کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ زندگی کس طرح گذاری جاتی ہے۔ خوبصورت لیکن ننگے، جاہل، میلے، گندے بیمار کشمیری اپنی مزدوری کا پورا معاوضہ بھی نہیں پاتے تھے۔ معمولی عزت سے بھی محروم تھے۔ بہو بیٹیوں کی بھی کوئی عزت نہ تھی ہندوستان کی کسی ریاست کی اتنی خراب حالت نہ تھی جتنی کہ کشمیر کی تھی۔

شیخ عبداللہ نے لاہور میں تعلیم پائی لیکن سرکار برطانیہ کی نوکری کرنے یا راجہ کی خوشامد میں زندگی گذارنے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ کشمیر کے غریبوں، لاچاروں، مجبوروں کو زندگی کا حق دلانے کے لئے قید و بند مصائب و آلام کو دعوت دینے کا عزم کیا۔ اصل میں وقت آ گیا تھا کہ زمین میں جو کمزور بنا دیئے گئے ہیں ان کو زمین کا حاکم اور وارث بنا دیا جائے۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین (قرآن کریم)

شیخ عبداللہ کو کچھ ساتھی مل گئے۔ انہوں نے پنجاب کے بعض لوگوں کی دعائیں لے کر کشمیر کی طرف رخ کیا۔ وہاں راجہ اور اس کے ڈوگرا سپاہی بھیڑیے بنے ہوئے تھے۔ اور جن

لوگوں کے لئے شیخ عبداللہ کچھ کرنا چاہتے تھے وہ پست مرعوب اور خوفزدہ تھے۔ بہرحال چند آدمیوں کے ساتھ شیخ عبداللہ آگے بڑھے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ کشمیری عوام کے ساتھ بھی انسانوں کا سا سلوک ہونا چاہیئے۔

ڈوگرا حکومت اسی طرح شیخ عبداللہ سے خفا ہوئی جس طرح فرعون حضرت موسیٰؑ سے خفا تھا۔ اس نے شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال دیا۔ کشمیری کیا مجال تھی کہ زبان ہلا سکتے۔ کشمیری دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ "اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو۔ اپنی قوت سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہمالیہ سے ٹکرائیں گے تو ہمالیہ کا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ ہمارے سر البتہ پاش پاش ہو جائینگے

خدا مجلس احرار اسلام والوں کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے پنجاب میں کشمیریوں کی حمایت کا اعلان کیا۔ یہ واقعہ ۳۱-۱۹۳۰ء کا ہے۔ رضاکار بھرتی ہوئے اور کشمیر کی سمت چلے پہلے تو ڈوگرا فوجیوں نے ان کو گرفتار کیا لیکن جب دیکھا سلسلہ بند نہیں ہو رہا ہے تو انگریزی فوج کی مدد لی۔ اب احراریوں کی انگریزی فوج سے ٹکر تھی۔ شہر شہر رضاکار بھرتی ہونے لگے۔ وہ کشمیر کی سمت جاتے اور گرفتار ہوتے۔ میں نے شیخ عبداللہ کا نام پہلی بار اس موقعہ پر سنا تھا۔

میں گیا میں تھا۔ ہمارے بزرگ اور رشتہ کے بھائی حکیم فضل الرحمٰن بلال آبگلوی کی تحریک سے گیا میں مجلس احرار بنی۔ ہم سب اس کا کام کر رہے تھے۔ اور رضاکار بھرتی کر رہے تھے۔ ایک جتھہ ہم نے مجلس احرار کو بھیجا بھی تھا جو راستہ میں گرفتار کر لیا گیا۔

چونکہ ٹکر براہ راست انگریزی حکومت اور احرار سے ہوگئی تھی۔ اس لئے مجلس احرار کا سرکلر آیا کہ ہر جگہ انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی شروع کی جائے۔ مجلس احرار توڑی جائے اور تحریک کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کر دیئے جائیں۔ قاضی محمد حسین صاحب مجلس احرار گیا کے ڈکٹیٹر ہوئے اور انہوں نے جلسۂ عام کا اعلان کیا۔ کانگریس کی تحریک سول نافرمانی چل رہی تھی۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ جلسہ کا اعلان ہوا تو ضلع مجسٹریٹ نے قاضی محمد حسین صاحب کو بلا کر سمجھایا کہ جلسہ نہ کریں اس سے کانگریس کو فائدہ ہوگا۔ قاضی صاحب نہ مانتے اس لئے ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ جلسہ گاہ پر پولیس نے قبضہ کر لیا۔ اور پہرہ بٹھا دیا۔ اس لئے ہم نے دوسری جگہ جلسہ کیا۔ قاضی صاحب کو مبارکباد دی۔

حکومت ہند نے دیکھا کہ کشمیر کے لئے ایجی ٹیشن جاری ہے تو اس نے ایک کمیشن اس غرض سے بنائی کہ ایجی ٹیشن کے اسباب و علل معلوم کئے جائیں۔ کمیشن نے رپورٹ دی کی ریاست میں غیر نمائندہ حکومت ہے۔ پبلک کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ حکومت تک اپنی شکایت پہنچا سکے اس لئے کوئی ادارہ ہونا چاہئے جس میں ایک یا دو نمائندہ عوام کا بھی ہو چنانچہ ریاست میں اسمبلی بن گئی اور اس میں عوام کا منتخب نمائندہ بھی آگیا۔ پبلک کی سمجھ میں آیا کہ لڑنے سے کچھ نہ کچھ موافق نتیجہ نکلتا ہے تو وہ شیخ عبداللہ کے ساتھ ہونے لگی۔

شیخ عبداللہ نے مسلم کانفرنس قائم کر کے جدوجہد کو آگے بڑھانا شروع کیا اور اب وہ کچھ زیادہ ہمت کے ساتھ راجہ کے خلاف بولنے لگے۔

کانگریس میں یہ بات چل رہی تھی کہ اس کا حلقہ عمل برطانوی ہند تک محدود نہ رہے بلکہ راجاؤں اور نوابوں کے علاقوں میں بھی کہ ان کو اس وقت ریاست کہتے تھے، آزادی کی تحریک چلائی جائے گاندھی جی سردار پٹیل وغیرہ اس کے ساتھ نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے والیانِ ریاست تحریک آزادی کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے اور لڑائی ہندوستانیوں میں ہو جائے گی لیکن جواہر لال کو اصرار تھا کہ والیانِ ریاست کے خلاف عوام کو ابھی نہیں کھڑا کیا گیا تو آگے چل کر یہ والیانِ ریاست ہندوستان کے اتحاد کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔

شیخ عبداللہ جواہر لال سے ملے اور ان سے کشمیری عوام کی حمایت کی درخواست کی۔ جواہر لال نے حمایت کا وعدہ کیا بشرطیکہ مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس کر دیں۔ شیخ نے اس شرط کو قبول کر لیا کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مقصد مظلوموں کی حمایت کرنا تھا اور وہ حاصل ہو جاتا تھا اس لئے مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس کر دیا گیا۔

جب ڈاکٹر پٹابی سیتارمیا نے جو آزادی کے بعد کانگریس کے صدر بھی ہوئے، ریاستی عوام کو بیدار کرنے کی غرض سے آل انڈیا نیشنل پیپلز کانفرنس بنائی تو اس کے صدر جواہر لال ہوئے اور نائب صدر شیخ عبداللہ ہوئے۔

میری شیخ عبداللہ سے پہلی ملاقات رام گڑھ کانگریس میں ہوئی جہاں وہ کشمیر میں عوام کے لئے کانگریسی لیڈروں کی حمایت حاصل کرنے آئے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی میں بھوپال منتقل ہو گیا

اور وہاں بھوپال ریاستی پیپلز کانفرنس (جسے پرجامنڈل کہتے تھے اور اب وہاں کی کانگریس ہے) کی مجلس عاملہ کا رکن ہوگیا۔ اس طرح میں بھی اس ریاستی کا تحریک میں شریک ہوگیا جس کے ایک لیڈر شیخ عبداللہ تھے۔

کشمیر میں شیخ عبداللہ کی مقبولیت اور کشمیر سے باہر ان کی شہرت تیزی سے بڑھی۔ وہ شیر کشمیر کہلانے لگے اور یہ لقب ان کے لئے ان کی جرأت کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب ثابت ہوا۔ جواہر لال نے خود جاگران کے اثر و رسوخ کو دیکھا۔ اب شیخ عبداللہ نے راجہ سے "کشمیر چھوڑو" کا مطالبہ شروع کیا۔ اور نتیجہ کے طور پر وہ اپنے ساتھیوں سمیت جیل چلے گئے۔ جواہر لال ان کی حمایت کے لئے کشمیر گئے تو ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ان دنوں برطانوی حکومت کانگریس سے بات چیت کر رہی تھی اور جواہر لال کو اختیار سونپنے کی بات ہو رہی تھی۔ اس لئے وائسرائے نے مداخلت کی اور جواہر لال رہا کر دیئے گئے۔ آخر ہندوستان آزاد ہوا اور جواہر لال وزیر اعظم ہو گئے۔ بھوپال اور تمام ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں شامل ہوگئیں سوائے حیدر آباد دکن کی ریاست کے جس پر فوجی کارروائی کر کے قبضہ کیا گیا۔ اور کشمیر کے جس کی ہندوستان میں شمولیت کی تفصیل نیچے درج ہے۔

انگریز جب جا رہے تھے تو انہوں نے ریاستوں کے بارے میں کچھ طے نہیں کیا تھا صرف یہ کہا تھا کہ والیان ریاست کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ چاہیں آزاد رہیں چاہیں ہندوستان میں رہیں چاہیں پاکستان میں۔ جناح صاحب نے بھی مسلم لیگ کی طرف سے یہی کہا لیکن کانگریس نے یہ مطالبہ کیا کہ ان ریاستوں کو لازماً ہندوستان میں رہنا ہوگا سوائے ان ریاستوں کے جن کے عوام یہ فیصلہ کر دیں کہ وہ پاکستان میں رہیں گے۔ ان دنوں نواب بھوپال والیان ریاست کے چیمبر کے صدر تھے۔ انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ والیانِ ریاست مل کر ایک علیحدہ متحدہ ہندوستان بنائیں لیکن ان کی یہ تجویز کامیاب نہیں ہوئی۔ کشمیر کے راجہ پریشان تھے کہ کیا کریں۔ ہندوستان میں آتے ہیں تو جواہر لال عوامی حکومت بنوا دیں گے اور ان کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔ پاکستان جاتے ہیں تو فوری طور پر تو کوئی خطرہ نہیں لیکن بعد میں ان کا اثر ختم ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان مسلمان ملک ہے اور کشمیر کے عوام بھی مسلمان ہیں۔

جناح صاحب نے بیان دیا تھا کہ جمہوریت برصغیر کے لئے مناسب نہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ

والیان ریاست کو اپنی قسمت کے فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ اس لیے راجہ ان کو اپنے سے قریب سمجھتا تھا۔ اس نے لیاقت علی کو خط لکھا کہ رسل و رسائل ہم آپ کے حوالہ کرتے ہیں شمولیت کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اس طرح وہ پاکستان اور ہندوستان سے سودا کرنا چاہتے تھے۔ فرقہ پرست ڈوگروں نے دیکھا کہ راجہ خواہ مخواہ خائف ہے۔ کشمیری عوام میں ہمت تو ہے نہیں، ان کو قتل کر کے مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے۔ چنانچہ کشمیری عوام کا قتل عام شروع ہوا۔ یہ خبر پاکستان میں پہنچی تو وہاں کے فوجیوں اور آزاد قبائل والوں نے حملہ شروع کر دیا۔ مجبوراً راجہ ہندوستان سے مدد کا طالب ہوا اور ہندوستان میں کشمیر کی شمولیت کی پیش کش کی جواہر لال نے اس شرط پر شمولیت منظور کی کہ شیخ عبداللہ کو رہا کیا جائے، ان کو وزیر اعظم بنایا جائے اور جب حالات معمول پر آجائیں تو استصواب رائے کرایا جائے کہ کشمیر ہندوستان میں رہے یا پاکستان میں۔ راجہ کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اس لئے اس نے ان شرطوں کو قبول کر لیا۔

شیخ عبداللہ رہا کر دیئے گئے، وزیر اعظم بھی ہو گئے لیکن جن اسباب کی بنا پر راجہ کا جھکاؤ پاکستان کی طرف تھا انہی اسباب کی بنا پر شیخ عبداللہ کشمیر کی پاکستان میں شمولیت کے قائل تھے۔ وہ مسٹر جناح سے اس معاملہ میں وضاحت چاہتے تھے اور ان سے ملنا چاہتے تھے لیکن جناح نے ملنے سے انکار کر دیا۔ جواہر لال نے حکومت پاکستان کو لکھا کہ کشمیر اس شرط پر ہندوستان میں شامل ہوا ہے کہ حالات سدھرنے پر کے بعد وہاں استصواب رائے کرایا جائے گا اس لئے پاکستان اپنی فوج واپس ہٹا لے۔ پاکستان نے لکھا کہ تمہارا وعدہ قابل اعتبار نہیں۔ آخر جواہر لال نے امم متحدہ کی سلامتی کانسل میں معاملہ کو پیش کیا۔ سر ظفر اللہ خاں پاکستان کی وکالت کرنے گئے جن کو جناح صاحب نے بہترین پاکستانی قرار دیا تھا اور جن کو وزیر خارجہ کے عہدہ پر مامور کیا تھا۔ لیکن انہوں نے عجیب رویہ اختیار کیا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ کشمیر کا محکمہ رسل رسایل پاکستان کی ذمہ داری سے ہے کشمیر میں بدامنی ہے۔ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے اس لئے پاکستان کو فوج بھیجنے کی ضرورت پڑی لیکن انہوں نے سرے سے انکار ہی کر دیا کہ پاکستان کی فوج کشمیر میں ہے۔ نرسنگ راؤ نے ہندوستان کی طرف سے یہ تجویز رکھی کہ امم متحدہ کی طرف سے مشاہد بھیجا جائے اور وہ رپورٹ دے کہ کشمیر میں پاکستان کی فوج ہے یا نہیں۔ چنانچہ امم متحدہ کی طرف سے مشاہد آئے اور انہوں نے رپورٹ دی کہ

کہ کشمیر میں فوج ہے۔ اس طرح ظفر اللہ خاں کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ اور ان کی بیکار کی لمبی تقریر
کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سلامتی کانسل نے ہدایت کی کہ پاکستان اپنی فوج ہٹالے اس کے بعد
استصواب رائے ہو۔ لیکن پاکستان نے ہندوستان سے کہا کہ ہندوستان کی فوج ہٹے گی تب پاکستان
کی بھی ہٹے گی اور ہندوستان نے کہا کہ سلامتی کانسل کی تجویز کے مطابق صرف پاکستان کی فوج ہٹنی
چاہئے جبتک استصواب رائے نہ ہو۔ کشمیر کی حفاظت کی ذمہ داری ہندوستان پر ہے۔ اس
جھگڑے میں کافی وقت صرف ہوگیا اور پاکستان میں روز حکومت بدلنے لگی۔ کوئی وزیر اعظم یہ امید
نہیں رکھتا تھا کہ وہ دوسرے روز وزیر اعظم رہے گا۔ اس لئے کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑتا رہا۔
یہاں تک کہ ایوب خاں نے حکومت سنبھالی اور ہندوستان سے مطالبہ کیا کہ کشمیر میں استصواب
رائے ہو لیکن ہندوستان نے یہ کہہ کر استصواب رائے سے انکار کر دیا کہ کافی عرصہ گذر چکا ہے لوگ
مخصوص نظام کے عادی ہو گئے ہیں اس نئے استصواب رائے مناسب نہیں۔

شیخ عبداللہ وزیر اعظم ہوئے اور جناح صاحب نے ملنے سے انکار کیا تو وہ پاکستان کو چھوڑ
کر کشمیر کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ انہوں نے دیکھا جیسا کہ ان کے بیان سے ظاہر ہوا
کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے ممکن ہے کشمیر کے مسلمانوں کے معاملہ میں
بھی وہی صورت پیش آجائے اس لئے وہ کشمیری عوام کے لئے خصوصی اختیارات کے خواہشمند ہوئے
انہوں نے اپنی دستور ساز اسمبلی بنائی۔ کشمیر ہائی کورٹ کو آخری عدالت قرار دیا۔ اس کے خلاف
اپیل سپریم کورٹ میں ممنوع قرار دی گئی۔ راجہ کو ہٹا دیا گیا لیکن سردار پٹیل کی مداخلت سے راجہ
کے بیٹے کرن سنگھ کو صدر ریاست بنا دیا گیا۔ ممکن ہے اس عہدہ سے فائدہ اٹھا کر کرن سنگھ
نے مرکزی حکومت کو شیخ عبداللہ سے کافی بدگمان کیا ہو کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں نیشنل
کانفرنس کا رویہ کرن سنگھ کے والد کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ شیخ عبداللہ کے بعد کرن سنگھ نے پارلیمنٹ
میں جو تقریر کی اس سے ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے جو شیخ عبداللہ کے خلاف ان کے اندر موجود
تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مرکزی حکومت نے از خود کرن سنگھ کی ان رپورٹوں کا اثر لیا ہو جو ان کا مقصود
نہ ہو۔ بہرحال ہوا یہی کہ شیخ عبداللہ کو بہت خطرناک سمجھ لیا گیا۔ وہ گرفتار کر لئے گئے اور اپنے عہدہ سے
برطرف کر دیئے گئے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافیاں کی جارہی تھیں ان کی اصلاح کی طرف

توجہ نہیں کی گئی۔ سنتے ہیں کہ شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کا فیصلہ جواہر لال کی عدم موجودگی میں ہوا۔ کیونکہ پارلیمنٹ میں جواہر لال نے کہا کہ شیخ عبداللہ کی گرفتاری میں ان کا ہاتھ نہیں ہے۔

لیکن شیخ لوہے کا چنا ثابت ہوئے۔ دنیا میں ہندوستان کی کافی بدنامی ہوئی۔ پاکستان نے صورتحال سے کافی فائدہ اٹھایا۔ آخر جواہر لال نے ان کو رہا کر دیا۔ وہ رہا ہوئے تو ان کے استقبال میں پورا کشمیر امنڈ آیا۔ پھر وہ نہرو کے بلانے پر ان سے ملے اور ان کی اجازت سے اور پاکستان کی دعوت پر پاکستان گئے جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کے معاملہ میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ جواہر لال بھی یہی چاہتے تھے کہ شیخ عبداللہ کے ذریعہ دونوں ملکوں میں اس معاملہ میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن ابھی شیخ عبداللہ واپس نہیں آئے تھے کہ جواہر لال کا انتقال ہو گیا اور شاستری جی وزیراعظم ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نے سوچا کہ جب تک حالات کوئی یقینی صورت اختیار کریں وہ حج کر آئیں۔ چنانچہ وہ باہر کے ملکوں میں گئے۔ چو این لائی سے ملے۔ سعودی عرب گئے۔ مؤتمر میں ہندوستان کی حمایت کی۔ لیکن ہندوستان میں فرقہ پرست پریس کرن سنگھ کو مضبوط بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں گلزاری لال نندا وزیر داخلہ تھے۔ جو حالات کو بگاڑتے زیادہ اور سلجھاتے کم تھے۔ شاستری کابینہ میں بھی جواہر لال کی سوجھ بوجھ کا کوئی آدمی نہ رہا تھا جس کو خیال ہو کہ گذشتہ غلطیوں کی تلافی ہونی چاہئے اور ہندوستان کی جو بدنامی ہو رہی ہے وہ دور ہونی چاہئے چنانچہ شیخ کو ہندوستان سے باہر رہنے کی اجازت نہیں رہی اور جب وہ دہلی پہنچے تاکہ وزیروں سے مل کر اپنی صفائی پیش کریں تو ان کو ہوائی اڈے پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ ونوبا جی جے پرکاش نرائن اور راجگوپال اچاری سبھوں نے ان کی گرفتاری کی مذمت کی۔ ونوبا جی نے کہا کہ اگر شیخ عبداللہ کی نیت خراب ہوتی تو وہ اپنی صفائی دینے ان کے پاس کیوں آتے۔ کم از کم ان کو اپنی صفائی کا موقعہ دیا جاتا۔ دولا سارا بھائی تو پہلے سے ہی ان کی مخالفت کو فرقہ پرستوں کی سازش سمجھتی تھیں۔ جے پرکاش سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کابینہ میں اندرا گاندھی نے ان کی گرفتاری کی مخالفت کی تھی۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ اندرا گاندھی نے وزیراعظم ہونے کے بعد ان کو رہا کر دیا۔ اور نندا جی سادھوؤں کے قصہ کے بعد وزارت سے ہٹا دیئے گئے۔ پھر ایک عرصہ کی گفت و شنید کے بعد شیخ عبداللہ کشمیر کے وزیراعظم ہو گئے۔

شیخ عبداللہ کی پہلی گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد کشمیر کے وزیر اعظم ہوئے تھے۔ ان کی وساطت سے حکومت ہند نے کشمیر میں قابل قدر کام کیا تھا۔ تعلیمی سہولتیں خوب دی تھیں غلوں کی ارزانی تھی۔ کارخانے تو نہیں قائم ہوئے شاید اس کی وجہ غیر یقینی صورتحال تھی لیکن تعلیم کا تناسب خوب بڑھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ڈاکٹر اور انجینیر اور بھی بہت ہو گئے۔

شیخ عبداللہ چاہتے تھے کہ کسی ایسے سمجھوتے پر اتفاق ہو جاتا جسے ہندوستان پاکستان اور کشمیری عوام تینوں پسند کرتے لیکن جب بنگلہ دیش بنا اور یہ بات ظاہر ہوگئی کہ پاکستان میں اپنی بات منوانے کی کوئی طاقت نہیں ہے تو انہوں نے پاکستان کو اہمیت دینا بے سود سمجھا اور خاموشی سے کشمیر کی خدمت کرنے لگے لیکن وہ کشمیر کے لئے زائد اختیارات کے اب بھی حامی تھے۔ نہ صرف کشمیر بلکہ ہر ریاست کے لئے موجودہ اختیار سے زیادہ اختیار دیئے جانے کو وہ پسند کرتے تھے کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حصہ پر پاکستان کا قبضہ تھا جہاں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ کشمیر ہی کا دو حصہ نہ تھا یہاں کے باشندے بھی دو حصوں میں تقسیم تھے۔ بیٹا یہاں تھا تو باپ وہاں۔ اس صورتحال کو باقی رکھنا وہ انسانیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ گاندھی جی ہوتے تو وہ بھی اس کو پسند نہ کرتے۔ اس لئے انہوں نے اس غیر سرکاری بل کی تائید کی جس کی رو سے ان کشمیریوں کو آنے کی اجازت مل سکتی تھی جو ہندوستان کے حصۂ کشمیر سے مجبوراً چلے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں شیخ کی حکومت ہند سے اور گورنر سے پھر جھڑپ ہوئی۔ شیخ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اعلان کیا کہ وہ اس کے لئے پھر جیل جانے کو تیار ہیں۔ انہوں نے یہ دلچسپ بات بھی کہی کہ حکومت ہند اس حصۂ کشمیر کو تو اپنا سمجھتی ہے۔ جو پاکستان کے قبضہ میں ہے لیکن کشمیریوں کو اپنا نہیں سمجھتی۔ بہرحال ابھی یہ معاملہ طے نہیں ہوا تھا کہ شیخ کا انتقال ہو گیا۔ دس لاکھ شہریوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی اندرا گاندھی صدر ریاست اور اپوزیشن لیڈروں نے بھی شرکت کی۔

شیخ عبداللہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ پرستوں پر سخت تنقید کرنے کے عادی تھے۔ راقم الحروف نے سہارنپور میں ایک دفعہ ان کی تقریر سنی جو آزادی سے پہلے ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے ہندو پریس پر سخت تنقید کی جو اپنے کو نیشنلسٹ پریس گمان کرتا ہے۔ لیکن اس کا ایک حصہ بھی اخبارات میں نہیں گیا۔ اور مسلم لیگ کے خلاف جو بولے وہ حصہ نمایاں طور پر اخبارات میں شائع ہوا۔ یقینی طور پر یہ بات صحافتی

دیانت کے خلاف تھی۔

کرن سنگھ کی تو تجویز تھی کہ کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے لیکن شیخ عبداللہ کی عظیم شخصیت کے سامنے ان کی کیا حقیقت تھی کہ وہ تقسیم کرا لیتے۔ بہرحال جن کی نظریں وسیع نہیں ہیں وہ ملکوں اور قوموں کو تقسیم کرنے میں ہی مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔

خان عبدالغفار خان

جن کو برطانوی استعمار کی مخالفت کی سزا سب سے زیادہ بھگتنی پڑی اور جن کو انگریز نوازوں نے آزادی کے بعد بھی نہیں بخشا وہ خان عبدالغفار خان ہیں۔

لمبے قد کا پٹھان، نیک دل، بہادر، انسان کی محبت رگ رگ میں پیوست، سچی بات کہنے والا، متواضع، سادہ لباس، کوئی چاہے کہ غلط مقصد کے لئے ان کو استعمال کرے ممکن نہیں۔ اپنے لئے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اگر وہ آزادی کے بعد اس راستہ کو چھوڑ دیتے تو مخالفوں کو کافی پریشانی ہوتی لیکن دشمنوں کی خوش قسمتی سے اس راستہ کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔ دشمن خوش ہیں کہ ان کو خوب ستایا۔ ہندوستانی ان سے محبت کرتے ہیں اور پاکستانی نفرت۔ پٹھان کبھی متاثر ہوتے ہیں کبھی نہیں۔

عہدہ ان کو نہیں چاہئے۔ کانگریس کی صدارت کی پیشکش ہوئی لیکن یہ عہدہ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ہندوستان میں رہتے تو صدر جمہوریہ کا منصب پیش کیا جاتا۔ وہ پاکستان میں رہے اور جیل میں زندگی گذاری لیکن جس کو عہدہ نہیں چاہئے۔ اس کو کیا پرواہ۔ جیل میں رہنا ان کو پسند آیا، پٹھانوں کو چھوڑنا پسند نہیں آیا۔

آزادی کے بعد خان عبدالغفار خان نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کو وفاق کی شکل دے دی جائے، حکومت وحدانی نہ ہو اور صوبہ سرحد کا نام پختونستان رکھا جائے۔ جناح صاحب اور ان کی حکومت نے اس بے ضرر مطالبہ کا جواب یہ دیا کہ ان کی پارٹی کی حکومت جو عوام کے ووٹوں سے بنی تھی توڑ دی اور خان عبدالغفار خان کو جیل میں ڈال دیا۔ اس وقت سے اب تک وہ کئی بار جیل گئے اور کئی بار چھوڑے گئے۔ انگریز اور امریکن بھی چاہتے ہیں کہ ان کے سامراج کا سب سے بڑا دشمن جیل میں رہے۔ جناح صاحب اور خان عبدالغفار خان میں کوئی یکسانیت نہیں۔ جناح صاحب کا خیال تھا کہ برصغیر جمہوریت کے لائق نہیں اور عبدالغفار

خاں جمہوریت کے حامی تھے۔ جناح صاحب حق رائے دہی بالغان کے خلاف تھے اور عبدالغفار خان حق رائے دہی بالغان کے مؤید تھے۔ جناح صاحب کی زبان و معاشرت انگریزی تھی۔ انہوں نے جو کچھ سیکھا انگریزوں سے سیکھا۔ خاں عبدالغفار خاں کی زبان اردو اور پشتو تھی۔ اور جو کچھ سیکھا پٹھانوں سے سیکھا، مسلمانوں سے سیکھا اور ہندوستانیوں سے سیکھا ان کی معاشرت افغانی تھی۔ جناح صاحب شان و شوکت سے نکلتے اور خان عبدالغفار معمولی آدمیوں کی طرح اپنے کاندھوں پر بستر اٹھائے ہوئے۔ جناح صاحب قانون کی خلاف ورزی کے خلاف تھے اور خاں عبدالغفار خان اس قانون کو توڑنے کے حامی تھے جو حق و انصاف کے خلاف ہو۔ جناح صاحب کی دوستی چودھری ظفراللہ خاں صاحب سے تھی۔ عبدالغفار صاحب کا کوئی دوست ظفراللہ خاں کا ہم مذہب نہیں تھا۔ جناح صاحب کے قدرداں پاکستان میں تھے اور عبدالغفار خاں صاحب کے قدرداں ہندوستان اور افغانستان میں تھے۔ جناح صاحب کا تعلق فرقہ اسماعلیہ سے تھا۔ عبدالغفار خان حنفی المذہب تھے۔

عبدالغفار خان نے ہمیشہ اعلان حق کے لئے اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈالا۔ ہندوستان آئے بلکہ بلائے گئے۔ کچھ لوگوں نے عقیدت کی بنا پر کچھ لوگوں نے ان کو استعمال کرنے کے لئے مرحبا کہا۔ آنے کے بعد ان سے پہلا سوال کیا گیا کہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے عبدالغفار خان پاکستان کے ستائے ہوئے آئے تھے۔ پاکستان سے ان کے ساتھ کسی اچھے سلوک کی امید نہیں چاہتے تو انتقامی جذبہ کے ساتھ بولتے کشمیر ہندوستان کا ہے لیکن جو کچھ بولے دنیا جانتی ہے۔ انہوں نے یہ بیان دیا کہ ہندوستان کو کشمیر کے سلسلہ میں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔ حق گوئی و بے باکی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ملے گی۔

حکومت ہند میں جو لوگ عہدوں پر فائز تھے ان کے کروفر اور عیش و آرام پر سخت تنقید کی۔ فرقہ وارانہ فساد پر برہمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ احمد آباد گئے جہاں فساد ہو چکا تھا۔ وہ کشمیر بھی جانے کو تیار ہوئے۔ انہوں نے پھلواری شریف پٹنہ میں امارت شرعیہ کی عمارت کی بنیاد بھی رکھی۔

آج کل افغانستان والے جس طرح آپس میں لڑ رہے ہیں اس سے امریکا کو تو خوشی ہو

سکتی ہے لیکن جس انسان کا دل بہادر پٹھانوں کی محبت سے معمور ہے اس کو کیا خوشی ہو سکتی ہو
عبدالغفار نے چاہا کہ پٹھانوں کی یہ باہم لڑائی بند کرائیں اور افغانستان کی زمین پر روس وامریکا
کی جنگ نہ ہو لیکن ان کو بند کر دیا گیا اور آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔

خان عبدالغفار خان کو میں نے نمک ستیہ گرہ کے وقت جانا جب قصہ خوانی بازار میں
ان کے ماننے والوں پر گولیاں چلی تھیں۔ وہ پشاور سے دور اپنے بھائی ڈاکٹر خاں اور ایک
عزیز خاں عطاء اللہ خاں کے ساتھ گیا لائے گئے جو راقم کا وطن ہے۔ خاں عطاء اللہ خاں تو
گیا ہی میں رکھے گئے لیکن یہ دونوں بھائی ہزاری باغ جیل بھیج دیئے گئے۔ میں اس وقت
کانگریس کا معمولی والنٹیر تھا۔ ہمارے بزرگ قاضی محمد حسین صاحب ان ہی دنوں مجلس احرار
کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتار ہوئے اور گیا جیل میں رکھے گئے جہاں ان کی خان عطاء اللہ
خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قاضی صاحب رہا ہوئے تو انہوں نے ان کے حالات
بتلائے۔ پھر میں کلکتہ چلا گیا۔ میں مدرسہ عالیہ میں پڑھتا تھا اور الیٹ ہاسٹل میں رہتا تھا۔
خاں عبدالغفار خاں چھوٹے تو ان کو پشاور جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ
کلکتہ چلے آئے اور مدرسہ عالیہ کے سامنے ایک عمارت میں ٹھہرائے گئے۔ اس موقع سے فائدہ
اٹھا کر میں روزانہ ان سے اور ان کے بھائی سے ملتا تھا۔ خاں عبدالغفار خاں تو اکثر کلکتہ کے
قریب علاقوں کے دورے پر چلے جاتے اور وہاں کے غریب مزدوروں اور کسانوں کے دکھوں
کا اندازہ کرتے لیکن ڈاکٹر خاں زیادہ تر رہتے تھے۔ ان سے خوب باتیں ہوتیں۔ اکثر میں اپنے
ساتھیوں کو بھی لے جاتا۔ میں دیکھتا تھا کہ عبدالغفار خاں بنگال کے دیہاتوں کی حالت دیکھ
کر بہت مغموم رہتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر خان نے کہا کہ اگر کوئی ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ وہ کسی مریض کو اچھا کر دے گا تو سمجھو
کہ وہ جاہل ہے۔ انہوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں نے ایک مریض کو سمجھا کہ
وہ میرے علاج سے اچھا ہو جائے گا لیکن وہ اچھا نہیں ہوا مر گیا اور کسی مریض کو سمجھا کہ اچھا نہیں ہوگا
مر جائے گا۔ محض ادائے فرض سمجھ کر علاج کرتا رہا اور وہ اچھا ہو گیا۔

اسی طرح انہوں نے ایک بار کہا کہ خدمت ایسی چیز ہے کہ لوگوں کی نفرت محبت سے بدل

جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ایک یورپین خاتون سے شادی کی تھی۔ پٹھان اسکو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ وطن آئے تو ان کا بائیکاٹ ہو گیا۔ پٹھان تو نصاریٰ کے پیدائشی دشمن ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی عادت بنالی تھی کہ جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں جو بھی بیمار پڑتا اگر ان کو خبر مل جاتی تو وہ اس کے یہاں ضرور جاتے اور اس کا علاج کرتے۔ کچھ دنوں میں مقاطعہ ختم ہو گیا اور لوگ ان سے محبت کرنے لگے۔ دوسروں کی خیر خواہی اور خدمت میں دلوں کو جیتنے کی بڑی قوت ہے۔

ایک اور مجلس میں انہوں نے ہم کو مشورہ دیا کہ اگر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینا ہے تو شادی نہ کیجئے۔ میں ایک مذہبی رجحان کا آدمی تھا، ان سے بحث کرنے لگا۔ وہ بولے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کسی حالت میں شادی نہ کی جائے۔ ہم خیال کوئی لڑکی مل جائے تو ضرور شادی کیجئے۔ ورنہ نہیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آزادی کی جنگ میں ٹھیک ڈھنگ سے حصہ نہیں لے سکتے رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ کسی مشن میں شریک ہونے کے لئے شریک زندگی کا بھی ہم فکر اور ہم خیال ہونا ضروری ہے۔

غالباً دو ہفتوں کے بعد دونوں بھائی پشاور چلے گئے۔ پھر بہار کا فساد ہوا۔ میں مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند اور قاضی احمد حسین صاحب کے ساتھ خان عبد الغفار خان سے دہلی میں ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بہار کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ پروفیسر عبد الباری سے وعدہ کر چکے ہیں کہ بہار کا دورہ کریں گے۔ پروفیسر عبد الباری صاحب ان سے ملے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہار کا دورہ کیا اور شاہ عزیز منعمی صاحب ان کے ساتھ رہے۔ شاہ صاحب نے جو رپورٹ دی وہ میں نے مرتب کر کے روزنامہ الہلال میں شائع کی۔ میں اس وقت روزنامہ الہلال کا ایڈیٹر تھا۔ خان صاحب کے دورے کی اطلاع صرف اسی رپورٹ سے لوگوں کو معلوم ہوتی۔

خان صاحب آزادی کے بعد دو بار ہندوستان آئے لیکن ہر بار میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا۔ پہلی بار ان کے سفر کی روداد عبد الاحد فاطمی صاحب ایڈیٹر "بھوداں تحریک" نے سنائی جو اکثر ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے سفر کی روداد عبد الباری صاحب مرحوم کے

لڑکے صلاح الدین صاحب نے سنائی۔ خان عبدالغفار خاں دوسری بار علاج کے لئے پٹنہ آئے تھے۔ وہ پروفیسر باری مرحوم کے گھر پر ان کے اہل و عیال کی خیریت دریافت کرنے گئے۔ پھر یہ لوگ کچھ دنوں ان کے ساتھ رہے۔

خاں عبدالغفار خاں صاحب کی عمر نوے سال ہے۔ ان کے سب ساتھی رخصت ہو چکے۔ ان کے قویٰ کمزور ہیں لیکن ہمت جوان ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند جوانی میں بھی تھے اور بڑھاپے میں بھی ہیں۔ اس سے ان کے ایمان اور ارادہ کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔

خان عبدالغفار خاں فوج میں معمولی ملازم تھے۔ اپنے انگریز افسر سے ناراضی کی بنا پر ملازمت ترک کر دی۔ خدائی خدمت گار کے نام سے سوشل کارکنوں کی ایک جماعت بنائی۔ انگریزوں نے پٹھانوں کی حرکت دیکھی تو خائف ہوتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پٹھانوں میں کوئی تحریک ہو خواہ بے ضرر کیوں نہ ہو۔ یہی کام کلیسا کی طرف سے ہوتا تو ان کی مدد کی جاتی۔ آج بھی پاکستان میں کلیسا کو سہولتیں حاصل ہیں۔ غرض کہ تصادم ہوا۔ اور خدائی خدمت گار سیاسی جماعت کی حیثیت سے ابھرے۔ انہوں نے گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کو اپنی لڑائی کے لئے اختیار کیا اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی حمایت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ملک آزاد ہوا اور اسی کی بدولت پاکستان بھی بن گیا۔ جناح صاحب کہتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے جائیں تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں لیکن پاکستان بننے کے بعد آٹھ کروڑ مسلمان اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ خان عبدالغفار خاں نے کہا کہ بیشک انہوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی ہندوستان میں مسلمانوں کو اس وقت بھی جو تکلیف ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا وجود میں آنا ان کے درد کی دوا نہ تھا۔

یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ اتنے اچھے سوشل ورکر سے اس نے فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ کوئی دوسرا سوشل ورکر پیدا کیا جو پاکستان کی برائیوں کو دور کرتا۔ پاکستان نے خان عبدالغفار خاں کی صلاحیتوں اور خوبیوں کی قدر نہ کی اور اس جرم میں کہ انہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی، انھیں زنداں کا اسیر بنا کر رکھا۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں پاکستان کی حمایت کرنے والے اشخاص کو بھی وزارت کا عہدہ ملا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟

مشاہیرِ اہلِ علم

اور

ملّت کے مصلحین اور خادمین

ڈاکٹر ذاکر حسین

میری عمر ۹ برس کی تھی۔ بڑے بھائی کا داخلہ جامعہ ملیہ میں ہوگیا تھا۔ باقی ہم دو بھائی بھی داخل ہونے والے تھے۔ داخلہ سے پہلے بڑے بھائی کے ساتھ جامعہ دیکھنے گیا تھا۔ جامعہ پہنچ کر دیکھا کہ ایک خوبصورت اور صحت مند آدمی اپنی خوبصورت داڑھی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ یہی ڈاکٹر ذاکر صاحب ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر نے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور رسم تاسیس شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے مقدس ہاتھوں سے انجام پائی تو جو طلبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو چھوڑ کر جامعہ میں داخل ہوئے ان میں ڈاکٹر ذاکر صاحب بھی تھے۔ ان کے ذوق علمی اور صلاحیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں افلاطون کی کتاب ریاست کا ترجمہ کیا تھا اور بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ام اے میں تھے کہ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوڑا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ذاکر صاحب جرمنی چلے گئے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد واپس آئے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے جو علی گڑھ سے دہلی منتقل ہو چکا تھا اور اس کے چانسلر حکیم اجمل خاں ہو گئے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جامعہ کی علی گڑھ سے دہلی کو ہجرت ایسی ہے جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو۔ جس طرح آپ نے مکہ معظمہ کی تطہیر فرمائی اسی طرح ہم کو علی گڑھ یونیورسٹی کو ٹھیک کرنا ہے۔

میں دہلی پہنچا تو مولانا محمد علی جوہر مکے کی مؤتمر میں شرکت کے بعد واپس آئے تھے۔ مکے جانے سے پہلے وہ عبدالعزیز کے حجاز پر قبضہ کرنے کے حامی تھے لیکن موتمر سے واپس ہوئے تو اس کے مخالف

ہو گئے تھے۔ دہلی جامع مسجد میں ہر ہفتہ ان کی تقریر ہوتی اور اہلحدیث حضرات ان کی مخالفت کرتے تھے۔ اور ہنگامہ ہوتا تھا۔ میں کمسنی کے باوجود ان جلسوں میں رہتا تھا اور جامع مسجد کے قریب رہتا تھا۔ جامعہ میں داخل ہوا تو فکر تھی کہ اب ان کی تقریر سننے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ والد مرحوم مولانا محمد علی جوہر سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں نے کسی لیڈر کے انتقال پر والد مرحوم کو روتے نہیں دیکھا سوائے مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے حالانکہ جمعیۃ العلماء سے مولانا محمد علی کا اختلاف ہوا تو والد مرحوم جمعیۃ العلماء کے حامی تھے۔ والد مرحوم کی اس درجہ محبت کی وجہ سے جو ان کو مولانا محمد علی جوہر سے تھی، میں بھی ان سے محبت کرتا تھا مجھ کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ وہ جامعہ میں ہر ہفتہ تقریر کرتے ہیں۔ میں ان کی تقریروں میں موجود رہتا تھا دیکھتا تھا کہ معین الدین حارث ایڈیٹر روزنامہ اجمل بمبئی جو سوشلسٹ پارٹی کے لیڈروں میں ہوتے اور ہمارے زمانہ میں جامعہ کے منتہی طلبہ میں تھے بہت سوالات کرتے رہتے تھے اور مولانا محمد علی جواب دیتے رہتے تھے۔

بہر حال میں جامعہ میں پڑھنے لگا۔ اس وقت جامعہ میں صرف پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ تہذیب و شائستگی کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ذاکر صاحب چھوٹے بچوں کے درجوں میں آجاتے تھے اور بتاتے تھے کہ جوتے قرینہ سے اتارے جائیں اور قرینہ سے رکھے جائیں۔ دیواروں پر لکھنے کی عادت نہیں ہونی چاہیئے۔ ہاتھ کتابوں اور کپڑوں کو صاف رکھنا چاہیئے۔ دارالاقامہ میں بھی ہمارے کمروں میں آجاتے۔ بستر دیکھتے کہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ چارپائیاں کسی ہوئی ہیں یا نہیں۔ کبھی کس کر بتاتے۔ سوتے وقت کمروں کو بند کرنے سے منع کرتے تاکہ صاف ہوا ملتی رہے اور گندی ہوا باہر نکل جائے۔ قلمی رسالہ نکالنے کی ہمت افزائی کرتے۔ بچوں کو بتایا جاتا کہ اپنی ضرورت پر خود خرچ کریں اور کس طرح خرچ کریں۔ بچوں کے بینک قائم ہوئے۔ انگریزی مصطلحات سے زیادہ سے زیادہ بچا جاتا عربی اور فارسی کی اصطلاحات استعمال ہوتیں یا پھر ہندی کی۔ بچوں کا ہفتہ وار اجتماع کہانیاں سنانے کے لئے ہوتا جن میں سبق آموز کہانیاں سناتے اور اسی غرض سے پہلے سے تیاریاں ہوتیں۔ نماز با جماعت کا خوب اہتمام تھا۔ صبح سویرے ہم سب نماز کے بعد میدان میں بھیج دیئے جاتے اور دیر تک ورزش کے بعد واپس آتے۔ ناشتہ تیار رہتا۔ ہم سب ناشتہ پر بیٹھ جاتے۔ کوئی لڑکا ننگے سر بیٹھ جاتا تو اس کو اٹھا دیا جاتا سال میں ایک بار یوم طلبا نو الا بالغ منایا جاتا۔ اس موقع پر تمام خادموں کو حتی کہ مہتروں کو چھٹی دے دی جاتی

لڑکے اور اساتذہ مل کر پاخانہ صاف کرتے۔ جھاڑو دیتے کھانا پکاتے اور شام کو سب مل کر کھاتے جس میں مہتروں، دھوبیوں، جھاڑو دینے والوں اور باورچی مدعو ہوتے اور ہم ان کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ اس کے بعد جلسہ ہوتا، تقریریں ہوتیں اور جلیان والا باغ کا واقعہ بتایا جاتا۔ اگر اس طرح کی بچوں کی تربیت کی جائے تو اونچ نیچ کا تصور ذہنوں سے ختم ہو جائے۔

ایک بار ایک لڑکا کسی بد اخلاقی کا مرتکب ہوا۔ ذاکر صاحب نے طلبہ اور اساتذہ کو جمع کیا اور کہا کہ بچوں کے والدین ہم پر بھروسہ کر کے جامعہ بھیجتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ جامعہ میں ان کے بچوں کی اچھی تربیت ہو گی لیکن آج ہم نے ان کے بھروسہ کو توڑ دیا ہے۔ ہم اس قابل نہیں رہے کہ ان کو منہ دکھائیں۔ ہم نے ان کے اعتماد کا خون کیا ہے۔ ہم مجرم ہیں۔ ہم اس قابل نہیں ثابت ہوئے کہ ہم ملک کو بہتر خادم دے سکیں گے۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے نہایت درد بھری تقریر کی۔ خود روئے دوسروں کو رلایا اس کے بعد اس لڑکے کو بہت معمولی سزا دی گئی۔ سزا کا تو کیا اثر ہوگا لیکن ڈاکٹر صاحب کی درد بھری تقریر نے ضرور اس کو متاثر کیا ہوگا۔

حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی جوہر اور دیگر رہنما جامعہ آتے رہتے۔ ذاکر صاحب ان کو ہمارے درجوں میں اور دار الاقاموں میں لاتے۔ ہم کو ان بزرگوں سے بات کرنے کا موقعہ ملتا۔ ایک بار بیگم بھوپال آئیں۔ استقبال کی خوب تیاریاں ہوئیں۔ حکیم اجمل خاں نے اور ذاکر صاحب نے تقریریں کیں پھر بیگم بھوپال کی تقریر ہوئی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ذاکر صاحب اور حکیم اجمل خان ان کو ہمارے کمروں میں لائے۔ انہوں نے نہ صرف کمروں کو دیکھا بلکہ ہم سے باتیں بھی کیں۔

جامعہ میں بہت چھوٹے بچوں کے سوا ہر شخص رمضان کے روزے رکھتا رات کو تراویح بھی ہوتی جن میں ہم شریک ہوتے۔ لڑکوں کو کھدر پہننے کی ترغیب دی جاتی۔ عید میں کھدر پہننے پر خاص طور سے زور دیا جاتا

میں اس زمانے میں ترکی ٹوپی پہنتا تھا جو کشمیر والوں نے نمدے کی بنائی تھی۔ یورپ کی آئی ہوئی ترکی ٹوپی نہیں پہنتا تھا۔ عید کا موقعہ آیا تو میں نے درخواست کی کہ میرے حساب سے میری ٹوپی دھلوانے کے لئے پیسے دے دیئے جائیں۔ نگراں دار الاقامہ نے اس کی تائید میں دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سب بچے گاندھی ٹوپی پہنتے ہیں تم بھی پہنو۔ میں ناراض ہوا۔ درخواست پھاڑ دی اور بستر پر جا کے

سو رہا۔ بڑے بھائی کو خبر ہوئی تو وہ ذاکر صاحب کے پاس گئے ان کو قصہ سنایا اور ان کی اجازت لے کر ہمارے حساب میں سے پیسہ لیکر آئے اور کہا چلو ٹوپی دھلوا لو میں خوش خوش اٹھا اور بازار جاکر ٹوپی دھلنے کو دے دی لیکن عید میں ترکی ٹوپی پہنی تو اچھا نہیں معلوم ہوا کیونکہ سب بچے گاندھی ٹوپی میں تھے جب گاندھی ٹوپی پہننے لگا یہاں تک کہ بہار کے فسادات کے بعد میں نے اس ٹوپی کو چھوڑا۔ آزادی سے پہلے یہ ٹوپی قومی جذبہ کی علامت تھی۔ آزادی کے بعد اس ٹوپی سے تملق اور چاپلوسی کا الزام لگ سکتا تھا۔

اس کے بعد میں کالی کھانسی میں مبتلا ہو گیا اور وطن واپس آنا پڑا۔ بعض حالات ایسے ہو گئے کہ پھر میں جامعہ نہیں جا سکا لیکن جامعہ سے میری محبت قائم رہی۔ ہمارے بہنوئی سید عبدالصمد صاحب دہلی میں دواخانہ کھولے ہوئے تھے۔ میں ان سے اور بہن سے ملنے ہر سال دہلی جاتا تو جامعہ بھی ضرور جاتا اور ذاکر صاحب، اپنے دارالاقامہ کے نگراں اور شاد صاحب سعد صاحب، سعید صاحب اور شفیق الرحمن قدوائی سے ضرور ملتا۔

ایک بار میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا تھا کہ ٹیگور کے شانتی نکیتن اور جامعہ ملیہ میں کیا فرق ہے ذاکر صاحب نے کہا کہ شانتی نکیتن میں ٹیگور صاحب کے تصورات کے مطابق تربیت کا انتظام ہے باقی نصاب حکومت کا ہے کتابیں کلکتہ یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہیں رہی شانتی نکیتن میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جنہیں مہاتما گاندھی کے خیال میں غلامی کے جراثیم پائے جاتے ہیں جس نصاب کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا:-

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور اکبر ہی کا دوسرا شعر ہے

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

لیکن جامعہ میں اپنا نصاب ہے۔ جدید علوم دینیات کے ساتھ ساتھ ہیں۔ کتابوں کے ذریعہ اور تربیت کے ذریعہ اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ جامعہ سے فارغ ہو کر طلبہ اپنے کو سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی

ثابت کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ طلبہ پر اسلام کا اثر ہو اور ہندوستان کی اس تہذیب کا اثر ہو جسے ہمارے بزرگوں نے صدیوں کی کوشش میں بنالیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ طلبہ پر ہم اپنا فلسفہ یا کسی کا فلسفہ لاد دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے طلبہ پڑھ کر یہ محسوس کریں کہ فکری طور پر بھی مغرب کا غلام نہیں بننا ہے باقی رہی سیاسی غلامی تو اس کے خلاف وہ بھی ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کو ان کے ملک کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقعہ نہیں ملتا۔

ذاکر صاحب اقبال کے اشعار کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچوں کے اجتماعات میں اور شبینہ مدرسہ میں اقبال کی نظمیں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اور "چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا" اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پڑھی جاتی تھیں۔

ذاکر صاحب نے جامعہ میں مختلف مکاتب فکر کے اساتذہ کو رکھا تھا۔ سورتی صاحب تھے، جو اہل حدیث تھے۔ خواجہ عبدالحئی فاروقی دیوبندی حنفی تھے اور مولانا عبداللہ سندھی کے شاگرد تھے اسلم جیراج پوری اہل قرآن تھے۔ ڈاکٹر عابد شیعہ تھے۔ پھر گاندھی جی کے لڑکے دیوداس گاندھی اور ان کے آشرمی رام چندر تھے۔ عیسائی کے لاٹ تھے۔ خیال اس کا تھا کہ مختلف الخیال حضرات ایک دوسرے کو برداشت کریں اور طلبہ پر اپنا خیال نہ تھوپیں۔ ان میں اسلامیت، اور سامراج کی مخالفت کا جذبہ غالب رہے۔

آزادی کے موقعہ پر دہلی اور پنجاب میں جو فسادات ہوئے اس میں ذاکر صاحب کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا۔ وہ ریل سے دہلی آرہے تھے کہ فسادیوں نے ان کو اتار لیا اور قتل کرنے کے لئے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کھڑا کیا۔ ایک غیر مسلم طالب علم جو ذاکر صاحب کو پہچانتا تھا، دوڑا ہوا اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ذاکر صاحب گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوستوں میں سے ہیں اور فسادیوں نے ان کو قتل کرنے کے لئے پکڑ رکھا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نے کسی طرح ان کو چھڑا لیا اور فوج بلا کر اس کی نگرانی میں ان کو روانہ کر دیا۔ اس سے سبق ملا کہ خدمت رائگاں نہیں جاتی۔ اس واقعہ سے ذاکر صاحب مشتعل نہیں ہوئے اور صدر جمہوریہ کے عہدہ تک پہنچے۔ ذاکر صاحب قتل سے بچ کر جامعہ آئے اور اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ مل کر مظلوم مسلمانوں کو بچانے اور ان کی مدد کرنے کا کام کرتے رہے۔ اس واقعہ سے ڈاکٹر صاحب آسانی سے نفرت کی نفسیات کا شکار ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی تعلیم اور گہرے شعور کی وجہ

سے منفی نفسیات کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

مولانا آزاد نے ذاکر صاحب کو مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنادیا تھا۔ آزادی سے پہلے سرکار برطانیہ کے حامی سر اور خان بہادریا ان سے جو قریب ہوتے وہی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں علی گڑھ کے خلاف کافی غصہ تھا۔ خطرہ تھا کہ یونیورسٹی ٹوٹ جائے۔ ذاکر صاحب ایسے لوگوں کو علی گڑھ میں لائے جو فرقہ پرست ہندوؤں کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے بڑی حکمت عملی سے مخالفتوں کا زور توڑا۔ علی گڑھ کو اس نازک زمانہ میں نقصان یا ختم ہونے سے بچا لینا ذاکر صاحب کی دانش مندی کا کمال تھا۔

جب وہ بہار آئے تو میں نے ان کو ایک خط لکھا جس میں ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ میری عادت وزیروں اور گورنروں کو مبارکباد دینے کی نہیں ہے۔ چونکہ آپ ہمارے استاذ ہیں اور بہار تشریف لائے ہیں اس لئے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ استاذ اس لئے بھی لکھا کہ وہ کبھی کبھی ہمارے درجہ میں انگریزی پڑھانے کے لئے آجاتے تھے۔ ان دنوں جب وہ بہار آئے تو میں امارت شرعیہ کا نائب ناظم اور ہفتہ وار نقیب کا ایڈیٹر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے سکریٹری کا خط آیا کہ آپ کا پتر ملا۔ گورنر صاحب نے آپکو ملاقات کرنے کے لئے فلاں تاریخ دی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں نے ملاقات کی کوئی خواہش تو کی نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ کسی دوسرے صاحب کو وقت دیا گیا ہو۔ اور خط غلطی سے میرے نام آگیا ہو۔ اس لئے میں نے ذاکر صاحب کو ایک خط میں اپنے شبہ کا اظہار کیا اور لکھا کہ اگر تاریخ معینہ تک آپ کا جواب نہیں آئیگا تو میں ملنے کے لئے آجاؤں گا۔ جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں ان کے یہاں حاضر ہو گیا۔ ذاکر صاحب نے کہا " میں مختلف مکتب فکر سے مل کر بہار کے حالات سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ اسی لئے آپ کو بلایا ہے۔" اس کے بعد ذاکر صاحب نے پہلے امارت کے بارے میں سوالات کئے پھر کچھ مشورے دیئے پھر کہا کہ تبلیغی جماعت کا طریقہ کار بہت اچھا ہے۔ میں مولانا الیاس صاحب کے زمانہ میں اس جماعت کو وقت دے چکا ہوں اور اس کو بہت مفید پایا ہے۔ آخر میں ہمت بڑھانے کے لئے کہا کہ مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ دنیا میں اتنے مسلمان جو بڑھے اور پھیلے ہیں وہ یوں ہی نہیں پھیل گئے۔ بلکہ بہت خون جگر پینا پڑا ہے بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔ مدتوں مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان عزت کی زندگی گذاریں تو ستائش اور ندامت سے بے پرواہ ہو کر آرام اور تکلیف کا خیال نہ کر کے مسلسل جدوجہد کرنی چاہئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر صاحب کی میری ملاقات مولانا آزاد کے انتقال کے بعد ہوئی جبکہ ان کی انگریزی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے کتاب کی تعریف کی لیکن کہا کہ مولانا سے سہو ہوا ہے۔ مولانا خود چودھری خلیق الزماں کو وزیر بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ جواہر لال ہی ان کو وزیر بنانے کے خلاف تھے ذاکر صاحب نے کہا کہ مولانا نے صدر جمہوریہ کا عہدہ قبول نہ کر کے غلطی کی ہے۔ کیونکہ اگر ہم لوگ صدر جمہوریہ نہ ہوئے تو پھر قیامت تک مسلمان ہندستان کے صدر جمہوریہ نہ ہوں گے۔

مولانا کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب نے مولانا پر دو تقریریں کیں۔ ایک تعزیتی جلسہ میں جس میں انہوں نے کہا کہ میں ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے مولانا کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ دوسری تقریر انہوں نے بزم ابوالکلام کا افتتاح کرتے ہوئے کی جس میں انہوں نے کہا کہ علمی ادارے جمہوری طریقہ پر نہیں چلتے۔ بزم ابوالکلام ایک علمی ادارہ ہے اس کا دستور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آپ نے بتایا ہے بڑے تجربہ کی بات تھی جو ذاکر صاحب نے کہی تھی۔ ایک ماہر تعلیم ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ ذاکر صاحب نے مولانا آزاد کی علمی ادبی اور سیاسی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ مولانا ان لوگوں میں ہیں جو روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

پھر میں ذاکر صاحب کو مولانا آزاد کا وہ خط دینے گیا جو انہوں نے حکیم سید سعد اللہ صاحب کو اپنے عقیدہ کے بارے میں لکھا تھا۔ غالباً حکیم سعد اللہ صاحب بھی ساتھ تھے

ذاکر صاحب سے ایک بار مولانا آزاد کے ترجمان القرآن پر گفتگو ہوئی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ مولانا دوسرے درجہ کی چیز لوگوں کو دینا نہیں چاہتے تھے اسی وجہ سے وہ ترجمان القرآن مکمل نہیں کر سکے لیکن جتنا انہوں نے دیا ہے وہ ہمارے استناد کے لئے بہت ہے۔

جب سیتا مڑھی میں فساد ہوا اور میں امارت کی طرف سے تفتیش حال کے لئے گیا تو مظفر پور اسپتال بھی گیا جہاں فساد کے مارے زخمی پڑے ہوئے تھے۔ ایک زخمی نے کہا کہ ذاکر صاحب بھی آئے تھے میں نے ان کو خوب جلی کٹی سنائی۔ میں نے پوچھا ذاکر صاحب نے کیا جواب دیا۔ بولے "کچھ نہیں کھڑے روتے رہے۔"

پٹنہ یونیورسٹی میں یہ تحریر زیر غور تھی کہ جو لڑکے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس نہ کریں ان کو کالج میں داخل نہ کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اسکی مخالفت کی اور کہا کہ سب لڑکے یکساں عمر بھی تو نہیں پاتے ہیں

بعض طلبہ شروع میں غبی ہوتے ہیں اور آگے چل کر ذہین اور تیز ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی شروع ہی سے تیز رہتے ہیں اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ میٹرک تک بعض طلبہ غبی ثابت ہوں اور کالج پہنچ کر ان کا ذہن کھل جائے ذاکر صاحب کے اس استدلال کو قبول کیا گیا اور پابندی نہیں لگائی گئی۔

ذاکر صاحب سے آخری ملاقات میں نے اپنے ماموں ڈاکٹر زین العابدین صاحب کے ساتھ کی جو کہ سے اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر ذاکر صاحب نے مجھ سے بہار کی پنچائتوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے پنچائتوں کی حمایت کی لیکن یہ کہا کہ تعلیم و تہذیب کی کمی ہے اس لئے انتخابات میں فسادات ہوتے ہیں اور بعد میں بھی کام اچھا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ شکایت تو رفتہ رفتہ ہی جائے گی۔

جب ذاکر صاحب بہار سے چلے گئے اور نائب صدر ہوئے تو ایک بار پٹنہ آئے تھے اور میں ان سے ملا تھا۔ حافظ یحییٰ صاحب مرحوم بھی ساتھ تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے حافظ یحییٰ صاحب سے کہا تھا کہ قاضی عبدالودود صاحب کی تحریریں بہت مفید اور کار آمد ہیں اگر آپ کو وقت ملے تو ان کو جمع کر دیں ذاکر صاحب نے کوئی کتاب خدابخش لائبریری کی حافظ یحییٰ صاحب سے نقل کرائی دیتی۔ اس وقت ذاکر صاحب کو اندازہ ہوا کہ حافظ صاحب صرف خوشنویس ہی نہیں ہیں بلکہ جو جملے اور حروف امتداد زمانہ کی وجہ سے مٹ گئے ہیں وہ سیاق و سباق سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ لفظ اور یہ جملہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے حکومت کو لکھا کہ ایسے آدمی حکومت کے لئے مفید ہیں، ان کو کوئی جگہ دینی چاہئے چنانچہ اس معاملہ میں ان کے بعض ہندو دوستوں نے بھی دلچسپی لی اور بڑھاپے میں ان کو سرکاری نوکری مل گئی۔ خدابخش لائبریری کے ذمہ داران نے بھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔ وہ جبتک زندہ رہے خوش اور آرام سے رہے۔

اس کے بعد ذاکر صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرمائے۔

ڈاکٹر سیّد محمود

ڈاکٹر سید محمود سے میرا ملنا جلنا بہت کم ہوا۔ لیکن جتنا بھی ملنا ہوا اور میں ان کو سمجھ سکا وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب ذہین آدمی تھے اور مسلمانوں کے اور ملک کے خیر خواہ تھے۔

یہ اصل میں یو پی کے رہنے والے تھے لیکن بہار کے مشہور لیڈر مسٹر مظہر الحق کے یہاں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ اس لئے زیادہ تر بہار میں رہنے لگے۔ مظہر الحق مرحوم کا وطن چھپرا تھا۔ بیرسٹر تھے۔ جب مسجد شہید کانپور کے مشہور ہنگامہ میں انگریزوں کی گولیوں سے سیکڑوں مسلمان زخمی، شہدا گرفتار ہوئے تھے تو ہندوستان بھر کے مشہور مسلمان بیرسٹروں کی ایک جماعت مسلمانوں کے لئے مقدمات کی پیروی کی غرض سے جمع ہوئی تھی۔ مظہر الحق مرحوم نے اس جماعت کی قیادت کی تھی۔ یہ گاندھی جی کے لندن کے ساتھی تھے اور ان کی تحریک عدم تعاون اور ستیہ گرہ میں شریک ہوئے تھے۔ پٹنہ میں صداقت آشرم کے نام سے ایک آشرم قائم کیا تھا جس میں قومی کالج کی بنیاد پڑی تھی۔ راجیندر پرشاد اور پروفیسر باری نے اس کالج میں کام بھی کیا تھا۔ اب یہ صداقت آشرم بہار ریاستی کانگریس کا دفتر ہے۔

مظہر الحق کی طرح ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی کاروان جنگ آزادی کے ایک رکن تھے۔ اور خلافت تحریک میں پیش پیش۔ چونکہ مظہر الحق کے داماد تھے اس لئے گاندھی جی بھی اسی طرح ان کو مانتے تھے جیسے کوئی ایک داماد کو مانتا ہو۔ مظہر الحق کی طرح یہ بھی بیرسٹر تھے۔ یہ پی ایچ ڈی بھی تھے۔ غالباً وکالت کبھی نہیں کی۔

لکھنؤ میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ہندوستان بھر کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک کانفرنس کی تھی اس میں طے پایا تھا کہ ہندوستان بھر کے نیشنلسٹ مسلمانوں کو منظم کیا جائے۔ ڈاکٹر محمود

اسی تحریک کے سلسلہ میں گیا آئے تھے اور ان کی تحریک سے گیا میں نیشنلسٹ کانفرنس کی شاخ قائم ہوئی تھی۔ اس کے صدر ہادی حسن بیرسٹر اور سکریٹری ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی مقرر ہوئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر محمود صاحب کو پہلی بار اپنے سیاسی شعور کے ساتھ اس موقع پر دیکھا۔ اس سے پہلے وہ گیا متعدد بار آئے ہوں گے لیکن مجھ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ زمانہ تھا جب میں گیا میں اسکول کا طالب علم تھا۔

کلکتہ سے نیشنلسٹ مسلمانوں نے ایک اردو روزنامہ جاری کیا تھا۔ کارکنوں میں یہ طے ہوا تھا کہ سب مل کر کام کریں گے۔ آمدنی ہوگی تو سب برابر تقسیم کریں گے اور آمدنی نہیں ہوگی تو سب برابر تکلیف اٹھائیں گے۔ اس اخبار میں ہمارے منجھلے بھائی عبدالرحمن عثمانی مرحوم بھی کام کرتے تھے۔ یہ دو بار جیل گئے تھے۔ ایک بار ۱۹۳۱ء میں جب خلاف قانون کل ہند کانگریس کا اجلاس پنڈت مالویہ کی صدارت میں گیا میں ہو رہا تھا۔ یہ اس وقت بڑا بازار کانگریس کے ڈکٹیٹر تھے۔ دوسری بار ان کے کمرہ کی تلاشی ہوئی تھی تو ان کے کمرہ سے ایسی سیاسی کتابیں پولیس کو برآمد ہوئی تھیں جو خلاف قانون تھیں۔ ان سے مجھ کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمود آئے اور انہوں نے دیکھا کہ سب ایک بڑے مقصد کی خاطر تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور ان کے پاس اپنا پریس بھی نہیں ہے تو انہوں نے اپنے پاس سے ایک پریس خرید کر دے دیا تھا۔ ڈاکٹر محمود کے قومی ایثار اور قومی جذبہ کی یہ ایک مثال تھی۔

بہار میں سری کرشن سنہا (جو بھومی ہار ذات سے تعلق رکھتے تھے) اور انوگرہ نرائن سنہا (جو راجپوت تھے) کے درمیان وزیر اعلیٰ کے عہدہ کے لئے مقابلہ تھا۔ چونکہ بہار کے ہندوؤں میں بڑے بڑے زمین دار بھومی ہار تھے اور اس لئے صوبہ میں طاقتور تھے اور کانگریسی وزارت سے پہلے انگریزی حکومت کے دور میں ہندو وزیر سر گنیش دت سنگھ بھی بھومی ہار تھے اس لئے راجیندر پرشاد کا خیال ہوا کہ سری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ ہوں تاکہ بھومی ہاروں کی حمایت حاصل ہو۔ اور سر گنیش دت کو موقعہ نہ ملے کہ وہ ان کو کانگریس کے خلاف بہکا سکیں اور کانگریس کو کمزور کریں۔ اس لئے انہوں نے بہت مشکل سے انوگرہ نرائن کو راضی کیا کہ وہ وزارت کی امیدواری سے ہٹ جائیں اور سری کرشن سنہا کو وزیر اعلیٰ ہونے دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس وقت مولانا سجادؒ نے آواز اٹھائی کہ ڈاکٹر محمود صاحب بہار کے سب سے سینیئر کانگریسی کے رہتے ہوئے سری کرشن سنہا کو وزیر اعلیٰ

بنانے سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ یہ بات اتنے زور سے چلی کہ کہا جاتا ہے کہ راجیندر پرشاد نے ڈاکٹر محمود صاحب سے یہ بیان دلوایا کہ انھوں نے خود وزیر اعلیٰ بننا نہیں چاہا۔ بات تو دب گئی لیکن ذات پات کے ساتھ جو رعایت کی گئی تھی اس کا اثر بہت خراب ہوا اور آج بہار ذات پات کی آگ میں جل رہا ہے۔ بہر حال اس وزارت میں ڈاکٹر محمود صاحب وزیر تعلیم ہو گئے۔ اپنے دور میں انھوں نے دیہات سدھار کے نام سے ایک سرکاری محکمہ قائم کیا۔ جتنے نوجوان آزادی کی لڑائی میں شریک تھے اور بیکار ہو گئے تھے ان کو اس محکمہ میں ملازمت دی۔ ہمارے منجھلے بھائی بھی اس محکمہ میں پی او کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ لیکن جب کانگریسی وزارتوں نے دوسری جنگ عظیم میں استعفٰی دے دیا تو گورنر بہار نے اس محکمہ کو توڑ دیا کیونکہ یہ محکمہ باغی نوجوانوں کا مرکز تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی اسکیم تھی کہ بہار کے ہر ضلع میں ایک اچھی اردو لائبریری قائم کریں۔ لیکن مسلم لیگیوں نے ڈاکٹر صاحب کی ہر جگہ مخالفت کی کیونکہ وہ کانگریس میں تھے۔ نتیجہ کے طور پر ان کے ہاتھ کمزور پڑ گئے اور وہ اتنے بے اثر ہو گئے کہ وہ اپنی اس اسکیم کو کامیاب نہ بنا سکے اور صرف پٹنہ شہری گورنمنٹ اردو لائبریری بن کر رہ گئی۔ اردو کی اتنی اچھی لائبریری جسے حکومت نے قائم کیا ہو شاید ہی کسی دوسری ریاست میں ہو۔

بہار میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اکثر مسلم بستیوں کا فساد کے عین موقعہ پر دورہ کیا اور مسلمانوں کو ہمت دلائی کہ اپنی حفاظت آپ کریں۔ اپنی حفاظت اور پڑوسیوں کی حفاظت میں لڑنا خلاف قانون نہیں ہے۔ بعض جگہ لوگوں کو اپنی مدافعت کے لئے جس کسی چیز کی ضرورت پڑی تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا بھی نظم کیا۔ اور یہ سب اس حال میں کیا کہ مسلمان کانگریسی ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو گالیاں دے رہے تھے۔ کاش ہندو لیڈر بھی مظلوموں کی حمایت میں اسی طرح دوڑتے تو پاکستان بننے نہ پاتا۔ اور مسلمان متحدہ ہندوستان میں رہنا ہی پسند کرتے۔ پاکستان بننے کی ذمہ داری ہندو لیڈروں کے سر پر بھی ہے۔

فساد کے بعد ہمارے ایک دوست نے قصہ سنایا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "ہماری بستی میں کئی بندوقیں تھیں لیکن جن کے پاس تھیں وہ فساد کے بعد بستی چھوڑ کر شہر چلے گئے ہیں۔ اب اگر بلوائی آئیں گے تو ہم سب مارے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ درخواست لکھ کر

لائیے سفارش کردوں گا۔ ہمارے دوست جب درخواست لے کر گئے تو بجائے سفارش کرنے کے ڈاکٹر صاحب خفا ہونے لگے۔ ہمارے دوست کو تعجب ہوا تھا کہ خود ہی درخواست مانگی اور جب درخواست لانے تو خفا ہو رہے ہیں۔ کچھ دیر خفا ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ یہ درخواست کس کو دیں گے ہندو افسر کو دیں گے؟ جب آپ اس سے کہیں گے کہ ہندوؤں کو مارنے کے لئے بندوق کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو بندوق کا لائسنس دے گا؟ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دوسری درخواست لکھوائی، ٹائپ کروایا، اس پر سفارش لکھی۔ وہ صاحب درخواست لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس گئے اور ان کو بندوق کا لائسنس مل گیا۔ معلوم ہوا کہ بہار کابینہ نے فیصلہ کیا تھا کہ جو مسلمان بندوق کا لائسنس چاہیں ان کو لائسنس دے دیا جائے گا لیکن اس فیصلے کا اعلان نہ کیا جائے بہار کابینہ کے اس فیصلہ میں ڈاکٹر محمود کی کوششوں کا حصہ ضرور ہوگا۔

قاضی احمد حسین صاحب بتیا گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے سکریٹری جمعیۃ علماء کو لکھا کہ چمپارن کی فرقہ وارانہ فضا فوجیوں کی وجہ سے بہت خراب ہو رہی ہے۔ صوبہ کانگریس کو چاہیئے کہ وہ اس ضلع کا دورہ کریں تاکہ فساد ہونے نہ پائے۔ میں اس خط کو لے کر سکریٹری جمعیۃ کے پاس گیا تھا ڈاکٹر محمود سے ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً فون اٹھا کر پرجاپتی مطر صدر صوبۂ کانگریس کو مخاطب کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ قاضی احمد حسین صاحب کو جانتے ہیں؟ جب سراجی نے کہا کہ ہاں جانتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا خط پڑھ کر سنایا۔ مسراجی نے کہا۔ بہار میں فساد کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے، بہت خطرہ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا "آپ حضرات کی کوششوں سے بہار میں امن ہے لیکن چونکہ پڑوس میں بدامنی ہے اس لئے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" مسراجی اس جواب سے خوش ہو گئے اور چمپارن روانہ ہو گئے۔ مجھ کو ڈاکٹر صاحب کا یہ شریفانہ اور عاقلانہ انداز بہت پسند آیا۔

بہار کے فساد کے بعد گاندھی جی نواکھالی چھوڑ کر بہار ڈاکٹر محمود صاحب کے بلانے پر ہی آئے تھے اور بہار کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا۔

آزادی کے بعد جب مولانا آزاد نے لکھنؤ میں مسلمانوں کی کانفرنس بلائی تو ہم نے پٹنہ سے اسپیشل بوگی کا انتظام کیا تھا۔ اس بوگی میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں قاضی احمد حسین صاحب

مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا عثمان غنی اور راقم الحروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب اسی گاڑی سے لکھنؤ جا رہے تھے اور فرسٹ کلاس ڈبہ میں تھے۔ ان کے سکریٹری مجتبیٰ صاحب مغلسرائے میں ہمارے یہاں آئے اور فوراً فوراً ہم سے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر صاحب ڈبہ میں چائے پر بلا رہے ہیں۔ میں نے مجتبیٰ صاحب سے کہا کہ آپ نے میرا نام کیوں جوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھ کو جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ مجتبیٰ صاحب نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس کی تصدیق ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہو جائے گی۔ بہر حال ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور مجتبیٰ صاحب نے میری بات بھی کہہ دی۔ ڈاکٹر صاحب بولے میں آپ کو جانتا ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے دی کہ آزاد کانفرنس میں کیا کیا تجویزیں منظور کی جائیں۔ کانفرنس میں ہم معمولی تماشائی تھے۔ ساری کارروائی مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، ڈاکٹر سید حسین ہمایوں کبیر، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر محمود نے چلائی۔ لیکن جب تجویزیں پیش ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ سب وہی باتیں تھیں جو ڈاکٹر محمود صاحب نے مغلسرائے میں ہم سے کہی تھیں۔ نہ ایک تجویز زیادہ تھی اور نہ ایک کم۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کارروائی پر ڈاکٹر صاحب حاوی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ ہم اس کے وفادار خیر خواہ ہیں لیکن ہندوؤں کو ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ ہم سے اعلیٰ ہندوستانی نہیں ہیں۔ ہماری ہی طرح ہندوستانی ہیں۔ وہ ہم سے مطالبہ کریں تو ہم کو چاہیے کہ کہہ دیں کہ جاؤ ہم وفادار نہیں ہیں، جو کرنا ہے کرلو۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر پر ہندو پریس میں کافی تنقید ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ریل کے ڈبہ میں یہ بات بھی کہی تھی کہ کامیابی کے بعد انسان کا حوصلہ اونچا ہو جاتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو مسلمانوں کا مطالبہ تھا مسلمانوں کا حوصلہ اونچا ہونا چاہیے تھا لیکن ان کا حوصلہ پست ہو گیا۔ وہ گھبرائے گھبرائے اور پریشان پھر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے کانگریس کو مشورہ دیا تھا کہ مسلم لیگ کے جو رہنما ہندوستان رہ گئے ہیں انکو مناسب عہدے دیئے جائیں اس طرح مسلمانوں کو کانگریس پر اعتماد پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ نواب چھتاری، جعفر امام وغیرہ اسی مشورہ کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری دوسری ملاقات مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ ہوئی۔ ڈاکٹر

صاحب ان سے کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں نے آزاد ہندوستان کے لئے اپنے کو تیار نہیں کیا تھا اس لئے پریشان ہیں۔ اب مزدوروں کے اقتدار کا زمانہ آنے والا ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے لئے تیار ہوں تاکہ آئندہ پریشانی میں نہ پڑیں۔

تحریک آزادی کے آخری دنوں میں جب مولانا آزاد وغیرہ کے ساتھ جیل میں تھے تو ایک واقعہ پیش آگیا تھا جس کو ڈاکٹر صاحب کے مخالفوں نے بہت اچھالا اور شاید ان کی قومی زندگی پر اس کا اثر بھی پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جتنے ارکان تھے وہ حکومت کے خلاف اپنا رویہ سخت کئے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے وائسرائے کو صدر کانگریس کی حیثیت سے جو خط لکھا تھا اس کا لہجہ کافی سخت تھا۔ ڈاکٹر محمود صاحب بھی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ان کے ساتھ جیل میں تھے۔ لیکن انہوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جو نرم قسم کا تھا اس لئے ساتھیوں کو اس کی خبر نہیں کی کیونکہ ان کے خیال میں ان کے ساتھی اس کو پسند نہ کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ وہ اس جنگ عظیم میں حکومت کی مدد کرنے کے حامی تھے۔ اور اس کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ لیکن وہ ورکنگ کمیٹی کے اس خیال کے ساتھ تھے کہ ہندوستان آزاد ہو اور وہ اپنی مرضی سے جنگ میں ہٹلر کے خلاف انگریزوں کی مدد کرے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ گاندھی جی کی زندگی میں موقعہ ہے کہ حکومت کانگریس سے صلح کرلے ورنہ ان کے بعد بہت سخت قسم کے لوگ کانگریس کی قیادت کو ہاتھوں میں لیں گے۔ وائسرائے کو یہ خط ملا تو اس نے ڈاکٹر صاحب کو رہا کر دیا۔ غالباً سر سلطان احمد نے جو وائسرائے کی ایکزیکیٹو کے ممبر تھے، لوگوں تک یہ خبر پہنچائی کہ ڈاکٹر صاحب کے خط کو وائسرائے نے معافی نامہ تصور کیا اور اس لئے ان کو رہا کر دیا گیا ہے۔ جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تو گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔ ڈاکٹر صاحب گاندھی جی کے پاس گئے اور اپنے خط کی نقل دکھائی۔ گاندھی جی نے بیان دیا کہ ڈاکٹر صاحب کے خط میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ البتہ ان کو اپنے ساتھیوں کو اس سے بے خبر نہیں رکھنا چاہئے تھا جس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے یہ دیا کہ ان کا ضمیر کہتا تھا کہ یہ خط کانگریس کے لئے مفید ہے لیکن ان کو یقین تھا کہ ان کے ساتھی اس طرح کے خط کو پسند نہ کرتے اس لئے ان سے تذکرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب وزارت خارجہ میں لئے گئے تو ان کی رائے سے بہت سے افسر مقرر کئے گئے تھے جن کا کام

یہ دیکھنا تھا کہ قابل اعتراض مال تو نہیں باہر بھیجا جا رہا ہے اور یہ کہ خریدار کے آرڈر کے مطابق سامان ہے یا نہیں۔ ہم لوگ جو ہندوستانی ہندوستان سے باہر رہتے ہیں، جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان ایسی بہت سی تجارتی بدنامیوں سے بچ گیا ہے جن کا شکار پاکستانی تاجر ہو چکے ہیں، جو مطلوبہ سامان سے کم درجہ کا سامان سپلائی کرتے ہیں۔

جب راورکیلا اور جمشید پور کے فسادات ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا کہ ہندو مسلم منافرت دور کرنے میں ہندو قیادت ناکام رہی ہے اس لئے اب یہ کام مسلمانوں کو کرنا چاہیے۔ انہوں نے اس غرض سے مسلم مجلس مشاورت بنائی جس سے اسعد مدنی صاحب کی جماعت غالباً حکومت کے دباؤ کی وجہ سے تھوڑے دنوں میں بے تعلق ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں شامل جماعتوں کے سربراہوں کو لے کر ملک گیر دورہ کیا۔ ہر جگہ تقریر میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد اور تعلقات کی افادیت بتائی۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر صاحب کا یہ کام بہت پسند آیا۔ گرچہ ڈاکٹر صاحب نہیں رہے اور ان کی بنائی ہوئی مسلم مجلس مشاورت مختلف اسباب کی کمی کی وجہ سے اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکی لیکن یہ کام کرنے کا ہے۔ دوسرے کام مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اپنے پلیٹ فارم سے ان کاموں کو انجام دیں۔ خود یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اس کے لئے کافی وقت اور محنت درکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے تعلق کی وجہ سے گاندھی جی کی پوتیوں کو بھی بعض دوروں میں ساتھ لے سکے تھے۔ اب اس اثر کا کوئی آدمی نہیں ہے پھر بھی کوشش کی جائے تو بہت سے ہندو ساتھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے ایسی قیادت درکار ہے جس کا ذہن ہندو مسلم منافرت کی نفسیات کا شکار نہ ہوا ہو اور جو اس کام کے لئے اپنا سارا وقت دے سکے۔

ڈاکٹر صاحب مسلم مجلس مشاورت کے دوروں کے سلسلہ میں گیا آئے تو انہوں نے ایک قصہ سنایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ جرمنی تعلیم کے لئے گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے یہ جان کر کہ وہ ہندوستانی ہیں، ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ پر ان سے گفتگو شروع کی۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے طالبعلم تھے لیکن قدیم ہندوستان کی تاریخ کی ان کو واقفیت نہ تھی۔ اور پروفیسر مذکور کو قدیم ہندوستان کی کافی واقفیت تھی۔ اس لیئے وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ پروفیسر مذکور نے

نے ان سے کہا کہ تم ہندوستانی ہو اور ہندوستان کی تاریخ سے واقف نہیں۔ اس جملہ پر وہ شرمندہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ نہ مسلمان ہندو کی تاریخ سے واقف ہیں اور نہ ہندو مسلم عہد کی۔ دونوں ایک ملک میں رہ کر ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ اسی ناواقفیت کی وجہ سے انگریزوں کو اس کا موقعہ ملا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ غلط روپ میں پیش کریں۔ اور دونوں فرقوں کو باہم لڑائیں۔

• ڈاکٹر صاحب مروجہ طریق انتخاب کے بھی خلاف تھے۔ آزادی کے پہلے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے وہ پہلے سے خلاف تھے۔ آزادی کے بعد تجربات کی بنا پر مروجہ طریقۂ انتخاب کو بھی ناقص سمجھتے تھے جس کی وجہ سے ذات پات اور فرقہ وارانہ جذبات تیز ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بیان دیا تھا کہ مروجہ طریقۂ انتخاب میں اصلاح ہونی چاہئے۔ مروجہ طریقۂ انتخاب کے نقص کو سب سے پہلے مولانا سجادؔ نے اپنی کتاب حکومت الٰہی میں بیان کیا تھا۔ اور بتایا تھا کہ اس سے اکثریت کی بھی نمائندگی نہیں ہوتی ہے۔ اس کے بہت بعد جے پرکاش نے بھی یہ لکھا تھا۔ آخر میں ڈاکٹر محمود صاحب نے بھی یہی رائے قائم کی۔ غرض بہار کے تینوں دانشور اس پر متفق تھے کہ مروجہ طریقۂ انتخاب ناقص ہے اور اس لئے قابلِ اصلاح ہے۔

مولانا حفظ الرحمنؒ

مولانا حفظ الرحمن کے نام سے میں پہلی بار اس وقت واقف ہوا جب عبدالباقی خان بی اے جامعہ نے لاہور سے ایک روزنامہ "آزاد" کے نام سے نکالا تھا۔ میں نے اس اخبار میں پڑھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی جگہ لیں گے۔ اس موقع پر بڑے بھائی مرحوم نے مجھ کو بتایا کہ مولانا ان کے استاذ ہیں۔ جب مولانا سے تعلقات ہوئے تو ایک بار انھوں نے بھائی صاحب کی خیریت دریافت کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھائی صاحب کو دیوبند میں مختصر المعانی پڑھاتے تھے۔

مولانا کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق گیا میں ہوا۔ میں ان دنوں ہاشمی ہائی اسکول گیا میں پڑھتا تھا۔ سنا کہ مولانا جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ تقریر فرمائیں گے۔ میں نماز کے بعد ٹھہر گیا اور مولانا کی تقریر سنی۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ان کا تعارف کرایا اور کہا تھا کہ "ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں جمعیۃ علماء کو یہی چلائیں گے۔ انشاء اللہ"

جب میں کلکتہ گیا اور مدرسہ عالیہ سے نکل کر بنگا باسی کالج میں داخل ہوا تو شام کو ٹہلنے کی غرض سے روزانہ کلکتہ میدان جاتا تھا۔ وہاں دیکھتا تھا کہ روزانہ مولانا حفظ الرحمن صاحب بھی آتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک صاحب اور ہوتے ہیں یہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب تھے جن کو اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا۔ ان دنوں چاٹگام اور نواکھالی وغیرہ مشرقی بنگال کے بہت مسلمان کلکتہ میں مقیم تھے۔ ماشاءاللہ ان کی کثیر تعداد نمازی تھی مسجدیں ان سے بھری رہتی تھیں۔ مسجدوں کے علاوہ فٹ پاتھ، پارک، سرکاری دفاتر جہاں بھی نماز کا وقت آجاتا اور ان کو جگہ ملتی تو اذان دے کر جماعت سے نمازیں پڑھتے تھے۔ یہ لوگ بالخصوص مغرب کے وقت کلکتہ میدان کے مختلف حصوں میں بھی اذان دے کر جماعت کرتے تھے۔ میں بھی ان کی کسی نہ کسی جماعت میں شریک ہو جاتا۔ کبھی کبھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مفتی عتیق الرحمن صاحب کا بھی ساتھ ہو جاتا۔ لیکن

اجنبیوں کی طرح کوئی تعارف نہ تھا۔

جب ہم شہر میں سوشل کام کرنے گئے اور مولانا آزاد کے یہاں آنا جانا ہوا تو ہمارے دوست قاضی معز الدین احمد صاحب حال ایڈیٹر تہذیب الاخلاق علی گڑھ کی خواہش پر کہ مولانا آزاد کے علاوہ کوئی اور شخصیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اگر مولانا آزاد سے مشورہ کا موقع نہ ملے تو ان کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ مولانا آزاد نے خود مشورہ دیا کہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملیں۔ چنانچہ میں تنہا ہی سراج بلڈنگ، کلکتہ جہاں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رہتے تھے گیا اور مولانا سے ملا۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بتایا کہ میں یہاں سوشل کام کرتا ہوں۔ میرے اور بھی ساتھی طلبہ ہیں۔ مولانا آزاد نے کہا ہے کہ میں آپ سے بھی مدد لوں اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے وعدہ کیا کہ ان کے لائق جو بھی کام ہوگا وہ ضرور انجام دیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے میرے متعلق سوالات شروع کیے۔ ان کو یہ معلوم کر کے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ میں کالج میں پڑھتا ہوں، کیونکہ میرے چہرہ پر داڑھی تھی اور میں عمامہ باندھتا تھا، کرتا بھی نیچا تھا۔ تعجب اس لئے کہ عموماً کالج کے لڑکے اس لباس میں نہیں رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا۔ یہ سن کر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بولے کہ اچھا آپ مولوی عیسیٰ کے بھائی ہیں وہ تو میرے بھی شاگرد ہیں۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا تعارف کرایا۔

مفتی صاحب کلکتہ میں پہلے سے تشریف رکھتے تھے اور کولوٹولہ مسجد میں درس قرآن دیتے تھے اور ان کو ایک تبلیغی ادارے کا انچارج بنایا گیا تھا۔ جس کا کتب خانہ اور دفتر سراج بلڈنگ میں تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دونوں ہم سبق بھی تھے۔ دونوں ایک ساتھ دیوبند میں مدرس رہے۔ دونوں ایک ساتھ دیوبند اور ڈابھیل میں مدرس ہوئے۔ اب دونوں کلکتہ میں تھے دونوں کے نام کے ساتھ رحمٰن لگا ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ اس لئے لوگ دونوں کو سگا بھائی سمجھتے تھے اور یہ بتانے پر کہ نہ دونوں میں کوئی رشتہ داری ہے اور نہ دونوں ایک جگہ کے ہیں۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبند کے رہنے والے اور مولانا حفظ الرحمٰن ضلع مراد آباد کے تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی مصلحت سے

چھپاتے ہیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ۴۲ء میں گیا جا چکا ہوں۔ خوب شاندار اجلاس ہوا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یہ سن کر کہا کہ آپ صدر اجلاس کے بھتیجے تھے اس لئے آپ کو اس میں شرکت کا موقع ملا۔ مجھ کو اس وقت کون جانتا تھا، جو میں گیا جاتا۔ میرا تو چند سال ہوئے پہلی بار گیا جانا ہوا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اسی سراج بلڈنگ میں صبح کو درس قرآن دیتے تھے۔ میں دور رپین اسٹریٹ میں رہتا تھا لیکن روزانہ صبح کو مولانا کے درس میں آجاتا تھا۔ کچھ ہم اپنی جماعت کا ہفتہ وار اجتماع بھی مولانا کے یہاں کرنے لگے۔ مولانا بھی اس میں حصہ لیتے تھے۔ کلکتہ میں کمیونسٹوں کا زور بہت زمانہ سے رہا ہے۔ اس لئے سوالات اٹھتے رہتے تھے کہ معاشی مسائل کا حل اسلام میں کیا ہے۔ ہمارے ساتھی مولانا سے پوچھتے۔ مولانا اس کا تشفی بخش جواب دیتے۔ کبھی کبھی فقہ کی کتابیں نکال کر حوالے دکھاتے۔ عام جلسوں میں بھی جو ہماری جماعت کے زیر اہتمام ہوتے، مولانا پہنچتے اور تقریریں کرتے۔ مولانا سے ہمارے دوستوں نے کہا کہ اردو میں 'اسلامی نظریہ معیشت' پر کوئی کتاب نہیں ہے کیا اچھا ہوتا اس پر آپ کوئی کتاب لکھ دیتے۔" چنانچہ مولانا نے کلکتہ چھوڑنے کے بعد 'اسلام کا اقتصادی نظام' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور وہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کا ایک نسخہ مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ یہ اردو میں اس عنوان پر پہلی کتاب تھی جس سے ان کے عالمانہ بصیرت اور پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ایک کتاب "بلاغ مبین" تھی۔ اس کا ایک نسخہ بھی مولانا نے کلکتہ ہی میں مجھ کو دیا تھا۔ ان کی ایک اور کتاب جس نے علمی دنیا میں ان کی اہمیت بڑھا دی وہ "قصص القرآن" ہے۔

کلکتہ میں شہید سہروردی صاحب نے کارپوریشن کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔ چونکہ شہید صاحب کو ہم اچھا نہیں سمجھتے تھے اور یہ بدگمانی بھی تھی کہ وہ اس تحریک کے ذریعہ کانگریس کی آزادیٔ ہند کی تحریک کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اس کے ساتھ نہ تھے۔

مولانا کو دیکھئے کہ اس تحریک کی حمایت میں جلسے ہوتے تو اس میں شریک ہوتے اور تقریریں کرتے چنانچہ ایک روز ہم نے مولانا سے کہا کہ "آپ شہید صاحب کو کیوں طاقتور بناتے ہیں۔ ان کی تحریک تو کانگریس کے خلاف ہے۔ مولانا سے اس سلسلہ میں دیر تک باتیں رہیں مولانا کا جواب تھا کہ اس تحریک میں ہم کانگریسی رہیں گے تو شہید صاحب کو موقع نہیں ملے گا کہ اس کو کانگریس کے خلاف استعمال کریں۔ باقی رہا یہ کہ شہید صاحب اس تحریک کو اپنے اقتدار میں اضافہ کے لئے استعمال کریں گے تو اگر میں (مولانا نے کہا) یہ دیکھوں گا کہ شہید صاحب اس کے ذریعہ اپنا اقتدار بڑھا رہے ہیں تو ان کو روک تو نہیں سکتا میں اپنی دلچسپی ختم کردونگا۔ اس گفتگو کے بعد مولانا نے اس تحریک سے اپنا تعلق تدریجی طور پر ختم کر دیا۔

ایک بار ہمارے دوست قاضی معزالدین احمد صاحب نے جو صوبائی اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے صدر تھے، مجھ سے کہا کہ ان کی جماعت یوم فلسطین منانے جارہی ہے۔ ہندو اس موضوع پر عمدہ نہیں بول سکتے۔ ارادہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی صدارت میں اس کا اجلاس کیا جائے۔ لیکن مولانا اس وقت تک کلکتہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ میں نے معزالدین صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ ان کو دہلی سے بلایا جائے گا تو شاید آئیں گے۔ ایسے ان کے آنے کی امید نہیں ہے۔ معزالدین صاحب نے کہا کہ بلانے کا موقع تو نہیں ہے۔ کوئی دوسرا نام بتلائیے۔ میں نے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا نام بتایا۔ چنانچہ ہم دونوں مفتی صاحب کے پاس گئے اور ان سے صدارت کی درخواست کی۔ مفتی صاحب راضی ہو گئے، جلسہ میں آئے اور نہایت بصیرت افروز اور فکر انگیز تقریر کی۔ مسئلہ فلسطین پر میں نے اس سے اچھی تقریر کبھی نہیں سنی، ہندو طلبہ بھی بہت خوش ہوئے۔

دھلی میں بھی مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ساتھ رہا اور یہ ساتھ مولانا کے آخر دم تک رہا۔ میں دہلی جاتا تو دونوں سے ملاقات ہوتی۔ اور مولانا محمد میاں سے بھی۔

جب مسلم لیگ کا زور ہوا تو جمعیۃ علماء کو زیادہ فعال قیادت کی ضرورت پیش آگئی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب ابتدائے تاسیس سے جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے۔ اور احمد سعید صاحب

ناظم دونوں نے بہت عمدگی سے جمعیۃ علما کی قیادت کی لیکن مفتی صاحب تدریس اور افتار کے کاموں سے فارغ ہوتے تو جمعیۃ کا کام کرتے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب اولیت انگریز دشمن تحریک کو دیتے تھے۔ انھوں نے شروع ہی میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کو سیاسی کاموں سے روکا نہیں جائے گا۔ اور اسی شرط پر انھوں نے دارالعلوم کی مدرسی قبول کی تھی۔ اس لیے جمعیۃ علما کے پرجوش کارکن چاہتے تھے کہ مولانا حسین احمد صاحب کو جمعیۃ کا صدر بنایا جائے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ان ہی لوگوں میں تھے چنانچہ جون پور کے اجلاس میں مولانا حسین احمد صاحب صدر ہو گئے۔ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ صاحب ناظم اعلیٰ ہو جمعیۃ میں دوسرے سب سے زیادہ فعال آدمی تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب صدارت سے ہٹ گئے لیکن وہ اور مولانا احمد سعید صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے برابر رکن رہے اور اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ جب مولانا سجادؒ کا انتقال ہوا تو انکی جگہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے لی۔

مولانا سجاد ناظم اعلیٰ بنائے جا رہے تھے تو اس کوشش میں بھی کہ مولانا ناظم اعلیٰ ہو جائیں، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی پیش پیش تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بہار کے کارکن نہیں چاہتے ہیں کہ مولانا سجادؒ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ ہوں کیونکہ اس صورت میں بہار کا کام خراب ہو جائے گا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا کہ مولانا سجاد صاحب ویسے بھی جمعیۃ علماء ہند کو کافی وقت دیتے ہیں ایک عہدہ ان کے نام کے ساتھ لگ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ دوسرے ایک بڑے کام کے لیے چھوٹے کام کا نقصان ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا سجادؒ واحد آدمی ہیں جو جمعیۃ علماء کے مختلف گروہوں کو جوڑتے ہیں۔ اگر وہ ناظم اعلیٰ نہیں ہوئے تو خطرہ ہے کہ ہماری جماعت میں پھوٹ پڑ جائے"۔

جب مولانا عبیداللہ سندھی کی صدارت میں بنگال صوبائی جمعیۃ علمار کا اجلاس ہو رہا تھا تو دوسرے اکابر کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی کلکتہ تشریف لائے تھے اور جب دوسرے روز کے اجلاس کے بارے میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا کہ اجلاس

ہو یا نہیں ۔ مولانا منیر الزماں صاحب نے کہا کہ اجلاس نہ ہو، کیونکہ مسلم لیگ اجلاس نہیں ہونے دے گی ۔ اور محنت رائیگاں جائے گی اور میں نے کہا کہ اجلاس ضرور ہو تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہماری تائید کی اور بولے کہ "آپ حضرات اپنے کو اتنا ہی کمزور پاتے ہیں کہ جلسہ نہیں کر سکتے تو ہم سب کو بلانے کی کیا ضرورت تھی" چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور راشرف الدین چودھری ناظم صوبائی بنگال کانگریس کمیٹی کی پرزور تائید سے میں اس قابل ہوا کہ دوسرے روز کے جلسہ کا نظم کروں ۔

جب مجلس مضامین کا جلسہ ہوا تو مولانا کے کہنے پر قاری رحمت اللہ صاحب نے تحریک کی کہ جمعیۃ علماء صوبہ بنگال کا ناظم اعلےٰ محمد عثمانی کو بنایا جائے ۔ چونکہ مجھ سے پہلے مشورہ نہیں لیا گیا تھا اور میں اتنا بڑا عہدہ سنبھالنے کے لئے تیار نہیں تھا اور میں اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ عہدہ لے لوں اور کام نہ کروں ۔ اس لئے میں نے انکار کر دیا ۔ اصل تحریک تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تھی اس لئے وہ فوراً آگے بڑھے اور مصر ہوئے کہ میں نظامت قبول کر لوں لیکن میں انکار ہی کرتا رہا یہاں تک کہ اس معاملہ کا فیصلہ نہ ہو سکا ۔ جب سب مہمان چلے گئے اور میں نے چاہا کہ جمعیۃ علماء کا کام کیا جائے تو قاری صاحبؒ نے کہا کہ "ہم سب نے طے کیا ہے کہ جمعیۃ علماء کا کام بند رکھا جائے یہاں تک کہ آپ نظامت کے لئے راضی ہو جائیں" ۔ یہ صورت کئی ماہ رہی کہ میں قاری صاحبؒ سے کام کے لئے کہتا اور وہ مجھ سے نظامت کے لئے کہتے ، یہاں تک کہ میں نے کہا کہ صوبائی جمعیۃ کی نظامت تو میں نہیں قبول کر سکتا نہ میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ میں بنگلہ زبان جانتا ہوں ، ہاں کلکتہ جمعیۃ کی نظامت قبول کرنے کو تیار ہوں ۔ قاری صاحبؒ نے کہا اچھا یہی صحیح چنانچہ ضلع جمعیۃ کا جلسہ بلا کر انھوں نے جمعیۃ میرے سپرد کی ۔ میں دہلی گیا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایتاً کہا کہ "جب میں نے چاہا تو آپ نے قبول نہیں کیا اور جب آپ کا جی چاہا تو راضی ہو گئے" ۔ میں نے جواب دیا "آپ اتنا بڑا بوجھ مجھ پر ڈال رہے تھے جو میں اٹھا نہیں سکتا تھا" ۔

اس کے بعد مولانا سے جون پور کے اجلاس میں ملاقات ہوئی جس کی تفصیل اوپر دے چکا ہوں اس کے بعد جب بھی دہلی جاتا تو جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ٹھہرتا تھا ۔ مولانا میری

خاطر بھی کرتے تھے اور مجھ سے کام بھی لیتے تھے۔

مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ جب ہم قومیت متحدہ بولتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم انگریزی سامراج کے مقابلے کے لئے ایک قوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم کسی فرقہ میں ضم ہوتے جا رہے ہیں۔

جب میں کلکتہ چھوڑ کر بھوپال چلا گیا تو میں نے مولانا کو لکھا کہ بنگال جمعیۃ علماء کی نظامت کے لئے مولانا عبداللہ الکافی سے رابطہ قائم کیجئے، وہ ایک اچھے عالم دین ہیں۔ بنگلہ، اردو اور انگریزی زبانوں پر قادر اور سیاست سے واقف اور بہادر آدمی ہیں۔ مولانا نے مجھ کو جواب دیا کہ "تم ان کو لکھو، اگر وہ راضی ہو جائیں تو میں کارروائی کروں گا" چنانچہ میں نے مولانا کو لکھا مولانا نے جواب دیا کہ سال دو سال پہلے تو یہ ممکن تھا، لیکن اب اس کا وقت نہیں رہا۔

جب انگریزی عہد کے آخری انتخابات کا اعلان ہوا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے غیر مسلم لیگی حضرات کا اجلاس دہلی میں بلایا جس میں نیشنلسٹ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں بھی مولانا نے مجھ کو بلایا تھا اور میں نے جلسہ میں شرکت کی تھی۔ اس کے بعد مولانا کا خط بھوپال میں میرے نام آیا کہ "بہار میں جمعیۃ کے کارکنوں کو آپ کی ضرورت ہے اور بہار جائیے" چنانچہ مولانا کے لکھنے پر اور قاضی احمد حسین صاحب کا تار پا کر میں پھلواری شریف چلا گیا۔ قاضی صاحب بہار نیشنلسٹ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر تھے انھوں نے مجھ کو بورڈ کے دفتر کا انچارج بنا دیا اور میں آفس سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

جب بہار میں فساد ہوا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پٹنہ تشریف لائے اور مجھ سے ریلیف کمیٹی کا چارج لینے کو کہا۔ میں ان دنوں روزنامہ الہلال کو ایڈٹ کر رہا تھا وہ بھی ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے میں نے حافظ یحییٰ صاحب کا نام تجویز کیا جن کو مولانا عثمان غنی صاحب ان کے قریہ سے جا کر لے آئے تھے اور جو پرانے کانگریسی اور بہار لوکل بورڈ کے ممبر تھے۔

مولانا کے ساتھ اس موقع پر مختلف وزراء سے ملا بھی تھا۔ مولانا نے شری کرشن سنہا کو کہا کہ " قاضی احمد حسین صاحب، مولانا عثمان غنی صاحب اور محمد عثمانی صاحب

یہ تینوں آدمی جمعیۃ علمار کی طرف سے آپ سے ملتے رہیں گے اور مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ کہنا ہو گا کہیں گے " پھر جمعیۃ علمار ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی مولانا نے مجھ کو بلایا تھا۔ اور مولانا کی تحریک پر قاضی احمد حسین صاحب مولانا آزاد سے ملے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ دوسرے روز مولانا آزاد کی قیام گاہ پر ان کی موجودگی میں شری کرشن سے ہم بہار کے لوگ ملیں، چنانچہ میں دوسرے روز قاضی احمد حسین صاحب کے ساتھ مولانا آزاد کی قیام گاہ پر گیا اور شری کرشن سنہا وزیر اعلےٰ بہار سے ہم دونوں کی گفتگو ہوئی۔ ہم نے جو رپورٹ پیش کی، شری کرشن سنہا نے اس کو صحیح تسلیم کیا۔ مولانا آزاد نے کہا کہ پولیس چوکیاں فسادزدہ علاقوں میں نزدیک نزدیک قائم کی جائیں اور ان میں مسلمان افسر رکھے جائیں ۔

پھر مولانا حفظ الرحمٰن کی خواہش پر میں، قاضی احمد حسین صاحب اور مولانا محمد میاں تینوں آدمی خان عبدالغفار خان سے ملے اور ان سے بہار کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کرنے کو کہا۔ خان صاحب نے جواب دیا کہ پروفیسر بارن صاحب ان سے مل چکے ہیں اور وہ ان سے بہار کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ خان عبدالغفار خان بہار آئے اور انھوں نے شاہ عزیر منعمی سابق وزیر بہار کے ساتھ دورہ کیا دورہ کی رپورٹ شاہ صاحب نے مجھ کو مفصل لکھوائی جو میں نے مرتب کر کے الہلال اخبار میں شائع کی تھی۔ اور یہی صرف مفصل اطلاع تھی جو لوگوں کو خان صاحب کے دورہ کے بارے میں ملی تھی۔

پھر میں جمعیۃ علمار ضلع پٹنہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس عرصہ میں مولانا پٹنہ تشریف لائے۔ میں نے مولانا کی تقریر کے لئے ایک جلسہ عام کا انتظام کیا تھا اور ایک خصوصی جلسہ کا۔ مولانا نے دونوں مقامات پر تقریریں کیں۔ پٹنہ کے وکلار اور دوسرے اہل علم حضرات اس میں بکثرت شریک ہوئے تھے۔ مولانا نے اس میں کہا تھا کہ یہ ہنگامی دور ہے مسلمانوں کی پشت پناہی کے لئے آپ سب حضرات ہمارے ساتھ ہو جائیں۔ پھر جب معمولی حالات پیدا ہو جائیں تو آپ کو اختیار ہو گا کہ جس جماعت میں چاہیں رہیں ۔

مولانا کی ہدایت پر میں نے پٹنہ ضلع کے لئے ریلیف کمیٹی بنائی اور جن مسلمانوں کی جائدادیں پاکستانی ہونے کے غلط الزام کے تحت ضبط کی گئی تھیں ان کو بچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں قاضی احمد حسین صاحب، مسٹر یونس بیرسٹر اور عبدالقیوم انصاری وزیر بہار نے میری بہت مدد کی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مجھ کو لکھا کہ پاکستان چلے جانے والے مسلمانوں کی جائدادوں کے سلسلہ میں جو قانون ہے اس میں ترمیم پیش کرنے کی رائے ہے۔ مشاورتی جلسہ بلایا ہے آپ بھی آجائیے۔ میں نے ترمیم کا ایک مسودہ پٹنہ کے وکلاء کے مشورہ سے تیار کیا تھا۔ اس مسودہ کو لے کر مسٹر یونس بیرسٹر کے ساتھ دہلی پہنچا اور جلسہ میں شریک ہوا۔ اس جلسہ میں ایک مسودہ منظور کیا گیا۔

بھوپال کے شاکر علی خان دہلی میں تھے انھوں نے سنا کہ میں آیا ہوں تو مجھ سے ملنے جمیعتہ کے دفتر میں آئے اور رات کو ٹھہر گئے، صبح کو ان کو لے کر ہوٹل گیا واپس آیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب موجود تھے۔ انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں شاکر علی صاحب کو ہوٹل لے گیا تھا تو ناراض ہوئے اور کہا کہ "جمیعتہ کے مہمانوں کے لئے کھانے کا نظم ہے آپ ان کو لے کر ہوٹل کیوں چلے گئے"۔

پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ نے مسٹر یونس کی چھوٹی ریلوے لائن پر بالجبر قبضہ کر لیا اور اس کے لوگ کاغذات اور حسابات لینے کے لئے مسٹر یونس کے یہاں آئے تو انھوں نے کاغذات اور حسابات دینے سے انکار کر دیا اور ان کو نکلوا دیا۔ اس پر ان کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کئے گئے جن میں ایک چوری کا مقدمہ بھی تھا۔ وارنٹ ناقابل ضمانت جاری کیا گیا تھا ڈاکٹر کے بیان پر کہ وہ اس درجہ بیمار ہیں کہ منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ مسلح پولیس کا پہرہ ان کے بستر کے گرد بٹھا دیا گیا تھا۔ مسٹر یونس نے مجھ سے کہا کہ آپ دہلی جائیے اور یہ تصویریں اور درخواست جواہر لال کو دے دیجئے، میں گیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ "جواہر لال تو انڈونیشیا جا رہے ہیں ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی ہے، چلو سردار پٹیل کے یہاں" میں مولانا کے ساتھ سردار پٹیل کے یہاں گیا۔ مولانا نے ہی ساری روداد سردار پٹیل کو سنائی۔

میں نے کاغذات پیش کئے۔ سردار پٹیل نے کاغذات پڑھ کر حکومت بہار کو لکھا کہ ریلوے کے جھگڑے میں دخل نہیں دیتا لیکن چوری وغیرہ کے مقدمات سے یہ اثر پڑے گا کہ ان کو خواہ مخواہ کے لئے تنگ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان مقدمات کو اٹھا لینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ مقدمات اٹھا لئے گئے۔

مدرسہ شمس الہدیٰ کے ایک جلسہ میں قومی ترانہ کا احترام نہ کرنے کے الزام میں ایک مدرس کو ہٹا دیا گیا تھا۔ شہر کے مسلمانوں میں اس سے غصہ تھا۔ میں اس سلسلہ کو جس طرح حل کرنا چاہتا تھا اس میں جمعیۃ کے بعض حضرات کی طرف سے رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ تو میں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو لکھا۔ مولانا نے مجھ کو دہلی بلایا۔ گفتگو میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کا ذکر آگیا جو انھوں نے اس مسئلہ کے سلسلہ میں دیا تھا اور پٹنہ کے اخبارات میں شائع بھی ہوا تھا۔ مولانا نے کہا کہ فتویٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ سائل جس طرح لکھے گا اسی مناسب سے جواب ہوگا۔ میں نے کہا آپ استفتار کا مناسب مضمون لکھ کر مفتی صاحب سے اس کا جواب منگوا لیجے میں اسے پٹنہ کے اخبارات میں شائع کرا دوں گا۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے استفتار کی عبارت لکھوائی اور ایک آدمی کو مفتی صاحب کے پاس بھیجا کہ اس کا جواب لکھ دیں۔ مفتی صاحب نے جواب کہلا بھیجا کہ" اس بارے میں ان کا فتویٰ شائع ہو چکا ہے، اب اس کے خلاف فتویٰ دینے کو تیار نہیں"۔

اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مولانا عثمان غنی صاحب صدر جمعیۃ علمار ضلع پٹنہ اور مولانا شاہ احمد حبیب صاحب صدر جمعیۃ علمار شہر پٹنہ کے نام خطوط لکھوائے کہ آپ دونوں حضرات اپنا اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔ مولانا عثمان غنی صاحب کے نام جو خط تھا وہ مجھ کو دیا گیا تھا اور میں نے مولانا کو وہ خط دے دیا۔ اور اس کے مطابق عمل بھی ہوا۔ لیکن مولانا شاہ احمد حبیب صاحب کے نام کا خط جن صاحب کو دیا گیا تھا وہ انھوں نے نہیں دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جھگڑا ختم ہو۔ اس لئے شاہ صاحب نے کوئی کاروائی نہیں کی، میں نے جب دیکھا کہ جھگڑا ناگزیر ہو گیا ہے اور مقامی جمعیۃ علمار میں پارٹی بازی ہو جائے گی جس کا کوئی حاصل نہیں سوائے تضیعِ اوقات کے تو میں جمعیۃ علمار سے علیحدہ ہو گیا تاکہ ایک

ہی گردپ جمعیۃ کو چلا ئے ۔

اس کے بعد قاضی احمد حسین صاحب کی رکنیت پارلیمنٹ کے سلسلہ میں دہلی گیا اور جمعیۃ کے دفتر میں ٹھہرا مولانا مجھ کو اس کام کے لئے راجندر پرشاد کے یہاں لے گئے ، راجندر پرشاد نے کہا کہ مولانا آزاد کو خود دلچسپی ہے ۔ ویسے میں بھی ان سے بات کروں گا ۔ جب قاضی صاحب کا نام مجلس عاملہ کانگریس نے منظور کر لیا اور اس خبر کے بعد میں جمعیۃ کے دفتر گیا تو مولانا بیٹھے ہوئے تھے کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اپنے لئے کوشش کرنے آیا ہوں ۔ مولانا نے مجھ کو مبارکباد دی تو وہ بولے " ان کا نام کہاں منظور ہوا ہے " مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا کہ یہ اپنے لئے آئے ہی کب تھے ۔ یہ تو قاضی صاحب کے لئے آئے ہیں ۔ ان میں ایک صاحب تھے جو کسی دوسرے صاحب کو امید دلاکر آئے تھے اور ان کے خرچ سے آئے تھے لیکن اپنے لئے کوشش کر رہے تھے انھوں نے معلوم نہیں کیا لکھا تھا کہ بیچارے کا شکریہ کا تار آیا تھا ۔ نام میں تھوڑی سے یکسانیت کی وجہ سے وہ تار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ملا ۔ مولانا نے مجھ کو پڑھنے کو دیا میں نے پڑھ کر سنایا اور کہا کہ یہ تار آپ کا نہیں ہے ، فلاں صاحب کا ہے ۔ مولانا انکی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ آپ نے تو ایک بار بھی مجھ سے ان کا نام نہیں لیا ، اپنے ہی لئے کہتے رہے ۔" مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو انھوں نے جواب دیا کہ یہاں آکر ان کے لئے کوئی راہ نہیں پائی ، اس لئے اپنے لئے کوشش شروع کر دی ۔

میں اپنے لڑکے محسن کو دیوبند بھیجنے لگا تو متردد تھا کہ ندوہ میں منطق فلسفہ نہیں ہے اور دیوبند میں ہے ۔ دینیات کی کتابیں وہ آگے کی پڑھ چکے تھے ۔ اس لئے ایسا نہ ہو کہ منطق فلسفہ نہ پڑھنے کی وجہ سے ان کو نیچے کی کتابیں دے دی جائیں اور اس طرح ان کا وقت ضائع ہو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب میرے اس تردد سے واقف تھے ۔ انھوں نے مجھ کو اطمینان دلایا تھا کہ دیوبند میں نظم ہو جائے گا چنانچہ میں نے محسن کو دیوبند بھیج دیا ۔ اس موقع پر دیوبند کی مجلس شوریٰ کا جلسہ تھا ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ، مولانا محمد میاں اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبند پہنچے ہوئے تھے ۔ مولانا محمد میاں نے محسن کو دیکھا تو پوچھا تمہارا کہاں مکان ہے ؟

محسن نے جواب دیا کہ میرا وطن پٹنہ ہے۔ محمد میاں نے دوبارہ پوچھا کہ تم عثمانی صاحب کے لڑکے ہو؟ محسن نے کہا جی ہاں۔ محمد میاں بولے "شکل ملتی ہے"! اس کے بعد انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو اطلاع دی وہ اسی وقت محسن کو لے کر مولانا ابراہیم صاحب صدر مدرس کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ یہ میرے دوست کے لڑکے ہیں۔ دینیات میں آگے کی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں منطق، فلسفہ نہیں پڑھی ہے، چونکہ ندوہ میں پڑھائی نہیں جاتی ہے ایسا نہ ہو کہ آپ اس وجہ سے ان کو دینیات کی نیچے کی کتابیں درس میں دے دیں۔ چنانچہ مولانا ابراہیم صاحب نے ان کی دینیات کی کتابوں کا امتحان لیا اور اس کے مطابق شرائط دورہ کی کتابیں پڑھنے کیلئے دے دیں۔

مولانا نے مجھ کو دہلی دفتر جمعیۃ العلماء ہند میں کام کرنے کے لئے بلایا تھا، لیکن میں اس وقت تک امارت شرعیہ کے دفتر میں کام کرنے لگا تھا اس لئے معذرت کر دی۔

میں دہلی انٹرنیشنل اگزیویشن دیکھنے گیا اور قاضی احمد حسین صاحب کے یہاں ٹھہرا۔ اور پھر مولانا سے ملاقات کی غرض سے گیا۔ دہلی آنے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ اگزیویشن دیکھنے آیا ہوں۔ بولے کہ میرے ساتھ چلو، میں نے عرض کیا، دیکھ چکا۔ بولے پھر دیکھ لو، چنانچہ مولانا کے ساتھ دوبارہ گیا۔

آخری بار جب مولانا پٹنہ تشریف لائے اور انجمن اسلامیہ میں جلسہ ہوا، تو میں جلسہ میں گیا۔ چونکہ جمعیۃ علماء سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس لئے عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا سوچا کہ جلسہ کے بعد مولانا سے ملاقات کروں گا۔ لیکن مولانا کی نظر پڑ گئی اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مجھ کو بلوایا۔ میں گیا تو بولے آپ نیچے کیوں بیٹھ گئے؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہنس کر بیٹھ گیا۔ جلسہ کے بعد دوسرے روز میں مولانا کی قیام گاہ پر گیا۔ مولانا کچھ لوگوں سے ملنے جا رہے تھے، بولے ساتھ چلئے، راستہ میں باتیں ہونگی۔ راستہ میں میں نے پوچھا آپ کی صحت کیسی ہے؟ بولے "میں تو اچھی نہیں محسوس کرتا، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اچھے ہو"، میں نے عرض کیا کہ میں نے اس لئے دریافت کیا کہ رات کو آپ تقریر ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہے تھے جو آپ کی عادت کے خلاف تھی۔ تقریر کا ذکر آیا تو مولانا بولے کہ "میں چاہتا تھا کہ کوئی

صاحب میری تقریر قلم بند کر لیتے لیکن ایسے کوئی صاحب نہیں تھے۔ مولانا کی وہ تقریر میرے حافظہ میں بالکل محفوظ تھی، لیکن میں نے مولانا سے کچھ نہیں کہا۔ جب مولانا چلے گئے تو میں نے مولانا کی تقریر قلم بند کر کے "نقیب" اخبار میں شائع کرادی، جس کا میں ایڈیٹر تھا اور اس کا ایک نسخہ مولانا کو بھیج دیا۔ مولانا نے مجھ کو لکھا کہ "آپ نے میری تقریر کی پوری ترجمانی کی ہے"۔ یہ مولانا کا میرے نام آخری خط تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا کینسر میں مبتلا ہو گئے ہیں اس کے بعد وہ امریکا علاج کے لئے گئے اور واپس آکر انتقال فرما گئے جو زندگی بھر برطانوی حکومت سے لڑتا ہے۔ اس نے اس کے حلیف ملک میں مرنا بھی پسند نہیں کیا۔

ایک صاحب نے بہار کے مختلف مقامات سے میرے خلاف مولانا کو خطوط لکھوائے تھے جن میں اپنی بے عملی کا الزام میرے سر ڈالا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ میری مخالفت کی وجہ سے جمعیۃ کا کام نہیں ہو رہا ہے، حالانکہ میں جمعیۃ کا کام چھوڑ کر دیہات چلا گیا تھا۔ میری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میرے معالج نے مشورہ دیا تھا کہ میں پٹنہ چھوڑ کر کسی خشک جگہ چلا جاؤں۔ پٹنہ کی مرطوب آب و ہوا میرے موافق نہیں۔ چنانچہ میں اپنے قریہ سملہ ضلع گیا چلا گیا اور وہاں کاشتکاری شروع کر دی۔ پبلک کاموں سے بے تعلق ہو گیا۔ جن صاحب نے ان خطوط کی مجھ کو خبر دی انھوں نے کہا کہ مولانا پر اس کا اثر ہے۔ لیکن چونکہ مولانا نے مجھ سے تذکرہ نہیں فرمایا اور ان کی شفقت میں میں نے کمی نہیں دیکھی اس لئے میں نے بھی اس خبر کے بارے میں مولانا سے کبھی بات نہیں کی اور جمعیۃ علماء کا انگریزی اخبار "میسیج" بھی میرے نام اعزازی طور پر آتا رہا۔

مولانا کی خدمت کا اصل اور عظیم دور آزادی کے وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ انسان نما درندے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کو قتل کرتے، ان کا گھر جلاتے، ان کی عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑتے، جوان عورتوں کا اغوا کرتے، ان کی عصمت دری کرتے۔ اس وقت مولانا مسلمانوں کو بچانے کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور خطروں کی پرواہ نہیں کی۔ مولانا گاندھی جی کے آشرمی ہندوؤں کی مدد سے کبھی بغیر مدد کے مسلمان عورتوں کو بدمعاشوں کے یہاں سے نکالتے، مسلمانوں کی جائدادوں کی حفاظت

ر نے حکومت کو مسلمانوں کی حفاظت پر آمادہ کرتے اور روزانہ گاندھی جی سے مل کر ان کو رپورٹ پیش کرتے، حتیٰ کہ سردار پٹیل نے کہا کہ جمعیۃ علماء کے مولوی (مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا ابوالکلام آزاد) گاندھی جی کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ مولانا نے مجھ سے کہا کہ "ایک روز میں نے گاندھی جی سے کہا کہ مسلمانوں کی حفاظت کا نظم اطمینان بخش نہیں ہے۔ کوئی صورت اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کو عام ہجرت کا مشورہ دے دیا جائے جیسا کہ پنجاب میں ہوا" گاندھی جی نے جواب دیا کہ غیر معمولی حالات میں ہمت کو نہیں چھوڑنا چاہیئے، کام کرتے رہنا چاہیئے، کچھ نہ کچھ تو نتیجہ نکلے گا ہی۔ سردار پٹیل گاندھی جی کو سمجھاتے گئے جب وہ مرن برت رکھے ہوئے تھے۔ گاندھی جی لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھے اور بولے تم وہ پٹیل نہیں ہو جس کو میں اتنے زمانہ سے جانتا ہوں۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جواہر لال وغیرہ کو راضی کر کے دہلی میں مسلم علاقے مقرر کرائے تھے اور ان علاقوں میں غیر مسلموں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ بھاگے ہوئے مسلمانوں کے مکانوں میں آ کے آباد ہوں۔ اس سے حکومت کو بھی مسلمانوں کی حفاظت میں آسانی ہوئی اور مسلمانوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

میں فساد کے بعد دہلی گیا تو دیکھا کہ دہلی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مسلمان چلے آ رہے ہیں سب اپنی اپنی داستان درد سناتے اور مولانا سبھوں کی فائل لے کر وزراء متعلقہ کے یہاں اور سنٹرل سکریٹریٹ دوڑتے اور جو مسلمان گرفتار کر لئے جاتے ان کو چھڑاتے۔

مولانا نے مجھ سے کہا تھا کہ قاسم رضوی حیدرآباد کے مجھ سے ملے تھے اور کہا تھا کہ "حیدرآباد میں ہندوؤں پر مظالم کی جو خبریں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں وہ جھوٹی ہیں، آپ چل کر دیکھ لیجئے" مولانا نے جواب دیا کہ "اچھا میں گیا میں نے دیکھا ظلم نہیں ہو رہا ہے اور واپس آ کر یہ بیان دیا کہ ظلم نہیں ہو رہا ہے پھر اس سے کیا حاصل ہوگا" خبر دینے والے جھوٹی خبریں دینے سے باز نہیں آئیں گے اور میں جو یہ مسلمانوں کی مدد کا کام کر رہا ہوں جس کے لئے مجھ کو حکام اور وزراء تک دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کام میں بھی رکاوٹ

پیدا ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے مولانا کے بارے میں بتایا کہ مولانا موٹر پر جا رہے ہیں دیکھا کہ بلوائی ایک مسلمان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ قریب تھا کہ اس پر تلواریں گرتیں، مولانا موٹر روک کر اتر پڑے اور شیر ببر کی طرح بلوائیوں پر جھپٹے اس مسلمان کو لے کر اپنی موٹر پر بٹھایا اور روانہ ہو گئے۔ مولانا اور کتنے نیک دل بہادر ہندو اور مسلمان فساد کے زمانہ میں یہ کام کرتے تھے۔ یہ واقعہ تو بطور نمونہ بیان کیا گیا ہے۔ دہلی میں اب جو مسلمان نظر آتے ہیں وہ انہی کی بدولت نظر آتے ہیں۔ اور ان میں بڑا حصہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ہے۔ مولانا کی بہادری کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کو آگ اور طوفان میں مسلمانوں کو بچاتے دیکھا ہے۔

حافظ یحییٰ صاحب مرحوم پٹنہ صوبہ بہار ہمیشہ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے ساتھ رہے ان کا لڑکا اپنی بہن کے ساتھ پاکستان گیا اور پابندیاں لگ جانے کی وجہ سے واپس نہ آسکا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے دریافت کر دو کہ اس کے بلانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے دریافت کیا تو مولانا نے کہا کہ وہ ایک درخواست حکومت ہند کو صوبائی حکومت کے واسطے سے بھیج دیں۔ اور اس کی نقل مجھ کو دیں، چنانچہ یہ کارروائی کی گئی اور مولانا کو اطلاع دے دی گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ پٹنہ سکریٹریٹ میں معلوم کیجیے کہ اس درخواست کا کیا حشر ہوا ہے۔ درخواست دہلی بھیجی گئی یا نہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے ایک ہندو دوست کو معلوم کرنے کے لیے بھیجا تو وہ معلوم نہیں کر سکے۔ ان ہندو نے کہا کہ کلرک متعلقہ سے دریافت کیا تو وہ کہتا ہے کہ "میاں جی کی تم کو فکر ہے"۔ یہ واقعہ حافظ صاحب نے سنایا۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خبر دی، وہ فوراً وزیر آبادکاری مسٹر جین کے پاس گئے۔ اور ان کو صورت حال بتائی وزیر آبادکاری نے وعدہ تو کیا کہ اس لڑکے کو آنے کی اجازت مل جائے گی لیکن یہ کہا کہ پہلے انکوائری ہوگی۔ مولانا نے کہا کہ پھر کام نہیں ہوگا، کاغذات کہیں دبے رہیں گے۔ کوئی پوچھنے جائے گا تو جواب ملے گا کہ "میاں جی کی تم کو کیوں فکر ہے"۔ وزیر آبادکاری نے یقین دلایا کہ تفتیش ارجنٹ کرائی جائے گی، دیر نہیں ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لڑکا پاکستان سے آگیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب میں گروہی عصبیت بالکل نہیں تھی۔ ہر مسلمان سے خواہ وہ کسی مکتب فکر کا ہو ایک طرح ملتے اور سب کی مدد کرتے۔ گاندھی جی نے برت توڑا اور ان کی خواہش پر قطب صاحب کے مزار پر قوالی ہوئی تو وہ اس میں شریک ہوئے حالانکہ ان کا مسلک اس کے خلاف تھا لیکن وہ ان باتوں کو اہمیت نہ دے کر مسلمانوں کی حفاظت کو اہمیت دیتے تھے۔

پارلیمنٹ میں سوچیتا کرپلانی نے جب یہ کہا کہ حکومت مسلمانوں کی پاسداری کرتی ہے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فوراً غصہ سے بھری ہوئی تقریر کی اور کہا کہ آپ کا تو یہ حال ہے کہ آصف علی گورنر اڑیسہ کے مکان کو گورنمنٹ کسٹڈی میں لے گیا کہ یہ پاکستان کا مکان ہے اور ڈاکٹر انصاری جیسے جلیل القدر لیڈر کے مکان کو بحق کسٹوڈین ضبط کیا گیا کہ یہ پاکستانی کا مکان ہے۔ حالانکہ ان کے وارث شوکت اللہ انصاری ترکی میں حکومت کے سفیر ہیں۔

مولانا نے جس جرأت سے آزادی سے پہلے انگریزوں اور مسلم لیگیوں کا مقابلہ کیا اسی جرأت سے آزادی کے بعد فرقہ پرست ہندوؤں کا مقابلہ کیا خواہ وہ حکومت میں تھے یا حکومت کے باہر۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ پنجاب کے غریب اور جاہل مسلمان جو پاکستان نہیں گئے اور ڈر سے ہندو ہو گئے تھے جمعیۃ کے دفتر میں آتے رہتے تھے کہ ایسا انتظام کر دیا جائے کہ وہ اپنے اسلام کا اعلان کر سکیں۔ مولانا ان کو غیرت دلاتے اور پھر حکومت سے کہہ کر ان کی حفاظت کا نظم کراتے اس کے بعد وہ اپنے اسلام کا اعلان کرتے۔

مولانا نے جب دیکھا کہ ملک میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا نظم نہیں ہو سکتا تو مسلمانوں کی ایک موتمر بلا کر انھوں نے لوگوں کو آمادہ کیا وہ مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم تعلیم کا نظم اپنے ہاتھوں میں لیں۔ مکاتب کھولے گئے۔ نصاب کی کتابیں تیار کرائی گئیں۔ اساتذ کو ٹریننگ دینے کا نظم کیا گیا۔

اسی طرح مسلمانوں کے باہمی مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرانے کے لئے مسلم شرعی پنچایتوں کے قیام کی تحریک کی بسنا ہے کہ یوپی کے بعض علاقوں اس پر عمل بھی ہوا ہے

مدرسہ عالیہ کلکتہ کا دوبارہ قیام بھی مولانا کی خدمات میں سے ایک بڑی خدمت ہے۔ یہ سرکاری مدرسہ بڑی اہمیت کا مالک تھا اس کی شاخیں بنگال میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے بنگال میں بعض بہت اچھے عالم پیدا ہوئے۔ بنگال تقسیم ہوا تو اس کے اساتذہ پاکستان چلے گئے اور عمارت کے سوا اس کی سب چیزیں لے گئے۔ جمعیۃ علما کے کارکن مولانا منیر الزماں اسلام آبادی، قاری رحمت اللہ صاحب لکھنوی وغیرہ کی رائے ہوئی کہ اس مدرسہ کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو متوجہ کیا اور مولانا نے مولانا آزاد کے واسطہ سے حکومت بنگال کو آمادہ کیا۔ جب وہ راضی ہوئی تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اساتذہ فراہم کئے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا عبد الحلیم صدیقی، مولانا محبوب الرحمٰن ازہری، مولانا کفیل احمد صاحب اور مولانا ابو مسلم محمد شفیع صاحب جیسے پختہ کار اساتذہ جمع ہوگئے۔ اب یہ مدرسہ ایک بار پھر مغربی بنگال کا مرکزی مدرسہ ہے اور اس کے عالم فاضل وغیرہ کے امتحانات صوبہ کے مختلف مقامات پر ہوتے ہیں اور طلبہ شریک ہوتے ہیں اس طرح بنگال میں علم دین کی اشاعت ہو رہی ہے۔ یہ مدرسہ گویا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے لئے ثواب جاریہ ہے کیونکہ ان ہی کی وجہ سے آزاد ہندوستان میں دوبارہ اس کا قیام عمل میں آیا۔

اسی طرح کلکتہ میں فساد ہوا۔ قاری رحمت اللہ صاحب نے مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو تار دیئے۔ سب سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آئے اور اس کے بعد مولانا آزاد۔ جلسہ میں سی بی رائے وزیر اعلیٰ بنگال کہہ رہے تھے کہ کلکتہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہو رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور بولے کہ میں شہر کا دورہ کر چکا ہوں۔ یہاں وہی حالات ہیں جو دہلی میں تھے۔ جس طرح دہلی کے سرکاری حلقے کہتے تھے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہو رہا ہے اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے۔ یہ سن کر فوراً مولانا آزاد فوراً اٹھے اور بولے "میں شہر کا دورہ کروں گا، میرے لئے موٹر کا انتظام کیا جائے۔" پہلے تو سی بی رائے نے ٹالا لیکن جب مولانا آزاد مصر ہوئے تو پیدل گھومنے کی دھمکی دی تو فوراً موٹر آئی اور مولانا آزاد نے شہر کا دورہ کیا۔ یہ قصہ قاری رحمت اللہ صاحب مرحوم نے مجھ کو سنایا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خدمات بہت ہیں۔ جمعیۃ علما میں ایسے لوگ ہیں جو مولانا

کی سوانح عمری لکھوا سکتے ہیں۔ خدا کرے ان کو اس کا احساس ہو جائے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا وحید الدین قاسمی اس سلسلہ میں بہت معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

مولانا کی تصنیفات میں "تبلاغ مبین"، "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" ان کی علمی یادگاریں ہیں۔

مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ

مولانا عبدالرؤف داناپور پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی تھی۔ سنہ ۲۲ء میں گیا میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر استقبالیہ تھے۔ کلکتہ میں شہید سہروردی سے ان کے تعلقات ہو گئے تھے۔ چنانچہ سہروردی کی سیاست ان پر چھاگئی تھی۔ پھر بھی وہ وفار کے ساتھ رہے۔ بسیرت کی مشہور کتاب اصح السیر کے مصنف تھے۔ ان کا فتویٰ کلکتہ اور اس کے نواح میں مانا جاتا تھا۔ انگریزی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔

مسلم لیگ کے عروج کے زمانے سے پہلے ہی میں کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ اولاً مدرسہ عالیہ میں اور بعد میں بنگا باشی کالج میں داخل ہو گیا تھا۔ ایسی شخصیتوں سے ملنے کا شوق تھا اور ان سے ملتا تھا جو انگریزی حکومت سے دور ہوتے تھے۔ شہید صاحب کی سیاست چونکہ انگریزوں کے گرد چکر لگاتی تھی اس لئے نہ شہید صاحب سے ملنے کا شوق ہوا اور نہ ان کے حلقہ احباب سے، چنانچہ اسی وجہ سے ابتداءً مولانا عبدالرؤف صاحب سے بھی نہیں ملا۔ صرف ایک بار اپنے خالہ زاد بھائی کو تلاش کرتے ہوئے ان کے یہاں گیا تھا جو ان کے عزیز ہوتے تھے۔

ایک بار مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کلکتہ تشریف لائے اور ان کے یہاں ٹھہرے۔ میں مولاناؒ سے ملنے ان کے یہاں گیا۔ اس دفعہ مولانا عبدالرؤف صاحب سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ مولانا سجاد صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ان سے ملتے رہو، ملتے رہنے سے ہماری مخالفت میں ان کی پالیسی نرم رہے گی اگر ایک ہی طرف کے لوگ ان سے ملیں گے تو ان کے طرز فکر میں اور طریقہ کار میں شدت پیدا ہوگی، لچک نہ ہوگی، مولانا سجاد کے ارشاد پر جب میں مولانا عبدالرؤف صاحبؒ کی طرف سے گزرتا تو ان سے ضرور مل لیتا تھا اور ان سے ہندوستان کی سیاسیات پر گفتگو بھی ہو جاتی تھی۔ اکابر جمعیۃ علماء کا میں نے ان کو مداح پایا کہتے تھے جمعیۃ میں رئیس العلماء ہیں۔ میں نے پوچھا پھر آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟ وہ جواب دیتے جب قوم میں ضد پیدا ہو جائے

اور وہ علماء کو چھوڑ دے تو علماء کو چاہیئے کہ اپنی سطح سے نیچے اتریں اور قوم کو ساتھ لیں۔ انھوں نے قوم کو چھوڑا ہے اور قوم نے ان کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ "خانہ خالی را دیو می گیرد" کے قاعدے سے قوم بے دینوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

جب مولانا آزاد کی امامت کے خلاف ہنگامہ تھا تو اس موقع پر میں نے مولانا عبدالرؤف صاحب کو ترجمان القرآن لے جاکر دیا۔ ترجمان القرآن پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے مولانا آزاد کی امامت باطل ہو اور انھوں نے لکھ کر دیا کہ میں مولانا آزاد کی امامت کو جائز سمجھتا ہوں۔

لکھنؤ میں کانگریسی حکومت کے زمانہ میں (یہ انگریزوں کا دور تھا) خاکساروں سے جس کے لیڈر عنایت اللہ مشرقی تھے، حکومت کی ٹکر ہوئی اور کانگریس دشمنی میں مسلم لیگ نے ہر جگہ خاکساروں کی تائید شروع کردی۔ چنانچہ کلکتہ میں بھی خاکساروں کی تائید میں پبلک جلسہ کی تیاری ہونے لگی۔ مولانا عبدالرؤف صاحب اس زمانے میں کلکتہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ نے عنایت اللہ مشرقی صاحب کی کتاب "تذکرہ" پڑھی ہے؟" انھوں نے جواب دیا "نہیں" میں نے کہا "آپ مسلم لیگ کے صدر ہیں اور عالم دین ہیں آپ کم از کم تذکرہ کا مطالعہ فرما لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ علماء خاکسار تحریک کے کیوں مخالف ہیں" مولانا نے کہا "میں نے خاکساروں سے کتاب طلب کی تھی لیکن وہ لائے نہیں" میں نے مولانا سے وعدہ کیا کہ میں ان کو کتاب لادوں گا، چنانچہ میں نے وہ کتاب مولانا کو لے جاکر دی۔ مولانا پڑھتے ہی آگ بگولہ ہو گئے، کہنے لگے یہ کافر ہے۔ اس نے عجیب عجیب عقائد پیش کئے ہیں۔ وہ مشرقی صاحب کے اس استدلال پر بہت ہنسے کہ چونکہ انگریز ترقی یافتہ اور معزز قوم ہے اور دنیا میں اس کی بڑی حکومت ہے اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ یہی اللہ کی چہیتی امت ہے۔ اس کے بعد کلکتہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس میں تجویز پیش ہوئی کہ خاکساروں کی تائید میں عام جلسہ کیا جائے۔ مولانا عبدالرؤف صاحب نے فوراً کہا کہ تب میرا استعفیٰ رہے گا میں بھی رہوں گا اور خاکساروں کی حمایت بھی ہو، دونوں باتیں ساتھ نہیں ہو سکتیں، اس کے بعد مولانا نے مشرقی صاحب کی کتاب تذکرہ کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس کے ذریعہ بدعقیدگی

کی اشاعت کی گئی ہے۔ مولانا کے اصرار پر خاکساروں کی حمایت کی تجویز واپس لے لی گئی۔ مولانا سجادؒ نے سنا تو فرمانے لگے "میں نے تم سے کہا تھا کہ ملتے رہتے سے فائدہ ہوتا ہے"

باوجود اختلاف خیال مولانا سجادؒ سے مولانا عبدالرؤف صاحبؒ بہت محبت کرتے تھے۔ جب مولانا سجادؒ کا انتقال ہوا اور میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے فوراً پوچھا کہ مولانا سجاد کی کیا خبر ہے۔ میرے پاس انگریزی اخبار تھا جس میں ان کے انتقال کی خبر تھی وہ میں نے ان کی طرف بڑھا دیا وہ پڑھتے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے گئے۔ کہنے لگے "مولانا سجادؒ کی ایک خوبی ایسی تھی جو اب کسی میں نہیں ہے وہ ہندوستان کی تمام قانون ساز اسمبلیوں پر نظر رکھتے تھے جہاں بھی کوئی ایسا قانون پیش ہوتا جو مسلمان کے لئے یا ان کے مذہب کے لئے قابل اعتراض ہوتا تو فوراً پوری مستعدی سے اس کو بدلوانے کی کوشش کرتے اور ہندوستان بھر کے قابل ذکر علماء کو خبر کر کے ان کی تائید حاصل کرتے۔ ایک باخبر عالم دین بے خبر علماء سے زیادہ بہتر ہے۔

مولانا عبدالرؤف تقریباً تمام نمازیں ناخدا مسجد میں ادا کرتے تھے۔ رہنا سہنا پرانے مولویوں کی طرح تھا اپنا ایک بڑا کتب خانہ بنا رکھا تھا حکیم بھی بہت اچھے تھے یہی ان کا ذریعہ رزق تھا۔ ایک دفعہ میں نے بھی ان سے اپنا علاج کرایا تھا۔

ایک دفعہ شہید سہروردیؒ صاحب ان کے یہاں تشریف لائے۔ مولانا سجاد مرحوم اس وقت وہاں موجود تھے۔ میں بھی بیٹھا تھا۔ شہید صاحب نے مولانا سے کہا کہ آپ ملک کے بارے میں اتنا سوچتے ہیں، کبھی کبھی مسلمانوں کے بارے میں بھی سوچا کیجیے۔ مولانا سجادؒ نے ہنستے ہوئے کہا کہ "آپ کو وکالت سے جب فرصت ہوتی ہے، تب مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہوں گے میرا تو یہ اوڑھنا بچھونا ہے اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان جس طرح پورے ملک میں منتشر ہیں ان میں باہم منافرت پیدا کر کے مسلمانوں کی کوئی اچھی خدمت انجام نہیں دی جا سکتی" مولانا عبدالرؤف صاحب آلہ کے بغیر سنتے نہیں تھے اس لئے انھوں نے آلہ لگا کر مولانا سجادؒ سے دریافت کیا کہ "آپ دونوں میں کیا بات ہوئی؟" مولانا سجادؒ نے گفتگو دہرا دی تو مولانا عبدالرؤفؒ کہنے لگے "صحیح ہے میں بھی شہادت دیتا ہوں۔ ہم مولوی مسلمانوں کے معاملہ کے سوا اور کیا سوچتے ہیں۔"

اسی زمانے میں ایک بار ایک صاحب آئے اور انھوں نے مولانا سجادؒ سے پوچھا "آپ نے کانگریس میں شرکت بلا شرط کی ہے یا شرط کے ساتھ" مولانا نے جواب دیا "شرط کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اسلام کے خلاف ہوگا تو نہیں مانیں گے" سائل نے کہا "زبانی ہے یا تحریری؟" مولانا نے جواب دیا "تحریری نہیں ہے" سائل نے کہا "اسلام تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ نکاح کرو تو اس کو بھی لکھ لو" مولانا نے جواب دیا "تب تو آپ کے نزدیک جو بے لکھے نکاح ہوتا ہے وہ منعقد نہیں ہوتا" اس پر جو لوگ موجود تھے ہنس پڑے اور وہ خاموش ہو گئے۔ مولانا عبدالرؤف صاحبؒ نے سنا تو کہا "مولویوں کا معاملہ مولویوں پر چھوڑیئے۔ کیا جائز ہے کیا ناجائز وہ ہم جانتے ہیں۔"

مولانا یوسف امیر جماعت تبلیغ

آزادی کے بعد جو شخصیتیں مسلمانوں کی عوامی زندگی میں نمایاں ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ اہل اور قابل قدر مولانا محمد یوسف امیر تبلیغ المعروف بہ حضرت جی صاحب تھے۔

انھوں نے مسجد میں بیٹھ کر دینیات کا پرانا نصاب پڑھا تھا، جدید علوم کا کوئی مطالعہ نہ تھا، اخبارات بھی نہیں پڑھتے تھے پھر بھی اس تحریک کو، جو ان کے والد نے شروع کی تھی انھوں نے دنیا کے ہر حصہ میں پہنچایا اور بہترین مسلم کارکنوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اس وقت یہ جماعت عالم اسلامی کی سب سے بڑی دینی دعوتی، غیر سیاسی جماعت ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مقصد صحیح ہو، اخلاص ہو کام کرنے کی دھن ہو اور دوسری جماعتوں سے ٹکر نہ لی جائے ہر شخص کا احترام کیا جائے تو وسائل آپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں اور کامیابی قدم چومتی ہے۔ اس کے لئے آجکل کی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مولانا یہ بھی پسند نہیں فرماتے تھے کہ انکی جماعت کی خبریں اخبارات میں شائع ہوں، یا اشتہارات وغیرہ شائع کئے جائیں۔ انھوں نے کوئی اخبار بھی نہیں نکالا پھر بھی لوگوں نے دیکھا کہ ان کے اجتماعات میں لاکھوں نفوس کی شرکت ہوتی تھی۔ اور اس دینی اجماعت کا کوئی قابل ذکر سرمایہ ان پر خرچ نہیں ہوتا تھا، سب شرکا خود خرچ کرتے تھے یا مقامی حضرات ـــــ تحریک کیا تھی؟ تعلق باللہ پیدا کرنا کہ اسطرح انسان کی اخلاقی حالت زیادہ آسانی سے سدھر سکتی ہے اور وہ سماج کا بہترین اور مفید رکن بن سکتا ہے۔

ایک اچھے سماج کے لئے ہر فرد کا اللہ سے رشتہ جوڑنا ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں اللہ کے بندوں کے ساتھ معاملہ ٹھیک رہے گا، ورنہ کتنا ہی اچھا نظریہ ہو، کتنا ہی بہتر نظام حکومت ہو، فرد کو چین نہیں مل سکتا۔ آج جمہوری ملکوں میں چوری، لوٹ، زنا بالجبر قتل وغیرہ کے واقعات جس کثرت سے ہوتے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ

جمہور میں خدا کا خوف اور اسکی محبت پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ انسان دوسروں کو اذیت دینے سے بچے، محض قانون ظلم وزیادتی سے باز نہیں رکھ سکتا، کیونکہ قانون نافذ کرنے والے انسان ہیں اور انکی گرفت سے بچا جا سکتا ہے۔

یہ چیز صرف کتابوں کے پڑھنے سے بھی نہیں پیدا ہوتی اسکے لئے صحبت درکار ہے اور تبلیغی جماعت کی تحریک دراصل صحبت اختیار کرنے کی تحریک ہے۔ یہ جماعت ہر جگہ سے لوگوں کو جو چل سکتے ہیں، ساتھ لیتی ہے۔ ان کے گھر کے کاموں سے چند دنوں کے لئے ان کو یکسو کر کے ان کو ضروری دین کی باتیں بتاتی ہے اور تھوڑے دن اپنی صحبت میں رکھ کر ان کو واپس کرتی ہے اور یہ خواہش رکھتی ہے کہ وہ بار بار جماعت کی صحبت اختیار کریں گے اور جو سیکھیں گے وہ دوسروں کو سکھائیں گے۔ یہ چلتا پھرتا تربیتی ادارہ (MOVING TRANING CAMP) مذہبی فضا پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے اور اہل دانش اسکی ستائش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا آزاد نے اسکی حمایت کی ہے اور تعریف فرمائی ہے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ اس کے کاموں میں حصہ لے چکے ہیں اور کوئی شک نہیں اخلاقی سدھار (MORAL UPLIFT) کے لئے جس پر اچھے سماج کی بنیاد پڑ سکتی ہے یہ بہت اچھی عوامی تحریک ہے۔ قاضی احمد حسین صاحب کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان کو مسلمان باقی رکھنے کا کام سب سے اہم ہے۔ اور یہ کام عوامی پیمانے پر صرف جماعت تبلیغ کر رہی ہے، جبکہ مسلمانوں کی کثیر آبادی ان پڑھ ہے، یا بہت کم پڑھی لکھی ہے کتابوں کے ذریعہ یہ کام نہیں ہو سکتا یہ کام تو ان میں گھوم کر ان تک پہنچ کر، زبانی بات چیت کے ذریعہ کرنے کا ہے اور تبلیغی جماعت یہ کام کر رہی ہے۔ غیر مسلموں میں اخلاقی سدھار کی تحریکیں ہیں، لیکن عوامی بنیادوں پر نہیں، کاش گاندھی جی کے بچے کھچے لوگ اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیتے، یا کوئی مسلمان ہی غیر مسلموں میں اس کام کو کرتا، یا دونوں مل کر کرتے اور بڑی بڑی اخلاقی خرابیاں ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، ان کو دور کرتے۔

میں تبلیغی جماعت سے اول اول مولانا سید سلیمان ندوی رح ایک تحریر کے ذریعہ واقف ہوا جو معارف میں شائع ہوئی تھی۔ پھر مفتی کفایت اللہ صاحب رح کے ذریعہ جو اس

تحریک میں عملاً حصہ لیتے رہتے تھے۔ اس تحریک کے بانی مولانا الیاس صاحب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مفتی صاحب کا ایک بیان دیکھا جس میں کہا گیا تھا کہ مولانا الیاس صاحبؒ کی جگہ ان کے صاحبزادے مولانا یوسف اس تحریک کو چلائیں گے۔ پھر مولانا عبدالرشید محمد مسکینؒ نے بھوپال میں یہ تحریک شروع کی جن کا حال اس کتاب میں درج ہے۔ بھوپال سے بہار آیا تو قاضی احمد حسین صاحب کو اس کام میں مشغول پایا۔ وہ بہار صوبہ میں اس تحریک کو امارت کے ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ انہی کے ساتھ میں مولانا یوسف صاحب سے ملا تھا۔ مولانا پہلے ہی مجھ سے واقف ہو چکے تھے بہت محبت سے ملے اور حکم دیا کہ "ان کو میری کتاب "حیات صحابہ" دی جائے"۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضرت ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا جائے میں عربی اخبارات میں اس پر تبصرہ بھیجوں گا۔ مولانا یوسف نے فرمایا "مجھ کو اسکی ضرورت نہیں ہے" ان صاحب نے پھر کہا "آپ اخبارات میں اور لوگوں سے یہ کہنے میں کیوں تامل کرتے ہیں کہ میں مبلغ ہوں جبکہ حضرت محمد صلعم فرماتے تھے کہ میں "نبی" ہوں"۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے جو تبلیغی جماعت کے دوسرے ستون تھے، جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں نبی ہوں، وحی کی بنا پر تھا جب کہ ہمارا اپنے کو مبلغ کہنا قیاسی ہے، وحی کی بنا پر نہیں ہے، ممکن ہے ہم غلطی کرتے ہوں"۔

بہرحال میں تھوڑی دیر مولانا کی صحبت میں بیٹھ کر واپس ہوا۔ اس موقعہ پر دیکھا کہ مولانا یوسف صاحب ہر وقت دین کی باتیں کر رہے ہیں لوگوں کو تبلیغ پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اور پھر مہمانوں کے قیام و طعام کے بارے میں معلوم کر رہے ہیں، پوچھ رہے ہیں کون قافلہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ لوگوں کا بھی تانتا بندھا ہوا ہے، تھوڑی دیر میں کتنے ہی لوگوں کو بستر سر پر اٹھائے آتے اور جاتے دیکھا۔ جب قاضی احمد حسین صاحب کا انتقال ہوا، اور میں نے مولانا کو حادثہ کی اطلاع دی تو مولانا نے تعزیت کے ساتھ تبلیغ میں لگ جانے کی دعوت دی، پھر مولانا سے کلکتہ میں ملاقات ہوئی۔ فریدی صاحب پہلے سے موجود تھے اور میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، سنا کہ مولانا آئے ہیں تو میں چل پڑا کہ سبقت کر کے مولانا سے ملوں، فریدی صاحب نے کہا کہ میں بھی چلتا ہوں، تعارف کرا دوں گا، میں نے کہا وہ مجھ کو جانتے ہیں، فریدی صاحب نے کہا اتنے لوگوں کو کہاں یاد رکھ سکتے ہیں، لیکن میں نہیں ٹھہرا۔ مولانا کے قریب

آیا تو معانقہ کرنے لگے، کسی تعارف کی حاجت ہی نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ اس مختصر ملاقات کے بعد یاد رکھنا کرامت ہی تھا۔

کلکتہ میں فسادات ہو گئے تھے۔ کلکتہ کے مضافات میں تبلیغی اجتماع تھا اسی میں تشریف لائے تھے جو فسادات کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ مولانا اسی اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے اس موقعہ سے کولوٹولہ مسجد میں ان کی تقریر تھی۔ میں نے سوچا کہ مولانا تقریر میں صبر وضبط کی تلقین کریں گے، حکومت کی شکایت کریں گے کہ اس نے مسلمانوں کی حفاظت کا نظم نہیں کیا فرقہ پرست عناصر کی مذمت کریں گے کہ انھوں نے بلا وجہ مسلمانوں کو اذیت دی، اپیل کریں گے کہ جن مسلمانوں کو نقصان پہنچا ہے ان کی مدد کی جائے، لیکن مولانا بولے تو یہ سب کچھ نہ تھا۔ انھوں نے کچھ اور ہی بات کہی، مومنانہ بات وہ بولے۔

"آپ اللہ کے خلیفہ ہیں، اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں، آپ بھی معاف کردیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتے ہیں، آپ بھی ان کو ہدایت دیں۔ جو کام اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد کیا ہے اس کام کو کریں، اگر کوئی آپ کو اذیت دیتا ہے تو وہ معاملہ آپ اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ قوی اور قہار ہے۔"

میں یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گیا۔ اس میں نہ جذباتیت تھی، نہ احساس کمتری، مسلمانوں کا اللہ کے یہاں جو مقام بلند ہے اس مقام بلند سے مولانا نے معاملہ کو دیکھا اور ان کو انکے فرض کی طرف متوجہ کیا۔

بلاشک ایسے ہی لوگ میدان جیت لیتے ہیں۔

افسوس کہ مولانا کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ بہت جلد اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی

غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے میں والد مرحوم کو لے کر بھوپال گیا تھا۔ ایک روز والد نے کہا کہ "یہاں حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کے ایک بزرگ صوفی ابو احمد مجددی تھے۔ ان سے گیا میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ بہت صاحب دل تھے۔" پھر کہا "معلوم کرو ان کی جگہ پر اب کون ہے" میرے ایک عزیز جو مجھ سے پہلے بھوپال میں مقیم تھے معلوم کر کے آئے اور کہا کہ شاہ یعقوب صاحب ان کے لڑکے، ان کی جگہ پر ہیں۔ عام لوگ پیر ننھے میاں اور جو زیادہ قریب ہیں حضرت صاحب کہتے ہیں۔ والد نے اشتیاق ظاہر کیا تو ان صاحب نے ان کو اپنے کندھوں پر ٹانگ کر تانگہ میں بٹھایا اور حضرت صاحب تک پہنچایا، کیونکہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو رہے تھے اس کے بعد والد کا انتقال ہو گیا اور وہ دوبارہ نہیں جا سکے لیکن میں وہاں جانے لگا۔ بھوپال میں میں تقریباً سات برس رہا اور حضرت صاحب کے یہاں اکثر میری حاضری ہوتی رہتی تھی۔ اس سات برس کے عرصہ میں حضرت نے بھی تین بار اس عاجز کی قیامگاہ کو اپنے قدم مبارک سے عزت بخشی جسکی تفصیل آگے آتی ہے۔

بھوپال میں بہت سے لوگ ان سے یا ان کے والد سے مرید تھے۔ وسط ہند کی چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کے والی بھی ان سے بیعت کا شرف رکھتے تھے۔ نواب بھوپال حمید اللہ خان کی والدہ ان کے والد سے بیعت تھے اور ان کے داماد حضرت صاحب کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ معلوم ہوا کہ مولانا عبد الشکور لکھنوی بھی ان کے والد سے بیعت تھے لیکن اس مقبولیت اور دنیادی اثر و رسوخ کے باوجود زندگی بالکل سادہ تھی آگے پیچھے خدام نہیں رہتے تھے۔ ملاقات کے لئے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک روز پہنچا تو اپنے صاحبزادہ کے ساتھ نل سے بالٹی میں پانی بھر رہے تھے۔

میں ایک بار ان کے حلقہ مراقبہ میں بھی شریک ہوا، دیکھے تو جب جاتا ان کی پر زور

اور پر نور تقریریں سنتا۔ اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی خوب دی تھی اور باتوں میں تاثیر عطا فرمائی تھی۔ ایک دفعہ بطور انکسار کہا کہ "مجھ میں کوئی خوبی نہیں اصل تو آپ حضرات بابرکت آتے ہیں۔ آپ کے آنے کے سبب کلمات خیر زبان سے نکل جاتے ہیں۔ نہ آتے تو دین کس کو پہنچاتا۔

بھوپال میں مسجدیں سب حکومت کے زیر نگرانی تھیں سوائے اس مسجد کے حضرت اپنی مسجد میں نماز پڑھاتے اور رمضان میں تو رات بھر تراویح ہوتی، خود قرآن سناتے، تمام مسجدوں میں ایک پارہ سے کچھ زیادہ قرآن تراویح میں سنایا جاتا۔ لیکن ان کے یہاں کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ اگر جنازہ آگیا تو نماز جنازہ پڑھائی میت کو قبرستان تک پہنچایا اور پھر آکے تراویح پڑھنے لگے۔ روزانہ کا معمول بھی یہی تھا کہ قرآن سننے والے آتے حضرت ان کو قرآن سناتے حدیث و تفسیر کے استاذ آتے ان سے گفتگو اور استفادہ اور افادہ ہوتا۔ ہم جیسے بے علم مجلس میں پہنچ جاتے تو روشنی حاصل کرتے اور علم کے موتیوں سے اپنا دامن بھرتے۔ آج کل کی خانقاہی رسوم میں سے کوئی رسم ان کے یہاں نہیں تھی، بجز ہفتہ وار ختم خواجگان کے جس کے بعد عام مسلمانوں کے لئے اور شرکا کی ضرورتوں کے لئے دعائیں ہوتیں۔ قبروں کی حفاظت کا بھی کوئی اہتمام نہ تھا۔ ایک بار میرے ایک عزیز (جوان سے مرید تھے) کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ حضرت صاحب کے خاندان خانقاہ میں دفن کرنے کی رائے ہوئی۔ ہم سب میت کے ساتھ قبرستان پہنچے۔ حضرت صاحب بھی ساتھ تھے۔ میں ایک جگہ یہ سمجھ کر کھڑا تھا کہ یہاں پر کوئی قبر نہیں ہے۔ ایک آدمی نے مجھ سے کان میں کہا کہ یہ حضرت صاحب کے والد کی قبر ہے، یہاں پر نہ کھڑے ہوں۔

ایک بار ان کے ایک مرید کو خاں صاحب کا خطاب ملا۔ انھوں نے حضرت صاحب کو اطلاع دی کہ "آپ کی دعا سے مجھ کو خاں صاحب کا خطاب ملا ہے" "یہ" آپ کی دعا سے" پڑھ کر حضرت بہت کبیدہ تھے۔ میں حاضر ہوا تو اس واقعہ کا تذکرہ کر کے کہنے لگے "غسل کرنا بہت اچھا ہے لیکن گندی جگہ پر کھڑے ہو کر غسل کیجئے تو طہارت نہ ہوگی، سب گندگی بدن پر آئے گی۔ یہی حال رضائے الہٰی کے حصول اور قربت الہٰی کے ارادہ کا ہے جس کو مرید ہونا کہتے ہیں۔ اگر اس ارادہ کے ساتھ دنیاوی عزو جاہ اور اس کی کثافتوں کو نہ چھوڑا تو مقصد حاصل نہ ہوگا اور

دنیا الٹی رہے گی۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے بہت محبت کرتے تھے، کہتے تھے ان سے بہت خیر پھیلا ہے۔ میں نے ان کے انتقال کی خبر دی تو آبدیدہ ہو گئے، اور پوری مجلس کے ساتھ دعائے مغفرت فرمائی۔

ہمارے ایک عزیز جو گیا کی ایک خانقاہ کے سجادہ تھے بھوپال تشریف لائے تو ان سے ملاقات کے لئے شاہ یعقوب صاحب خود ہمارے یہاں تشریف لائے اور مہمان بزرگ سے معانقہ کیا اور تھوڑی دیر تک مریدوں کی تعلیم کے طریقے پر گفتگو کی۔

ان کے وعدہ وفا کرنے کا ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ میں بھوپال میں ریاستی پرجا منڈل کی مجلس عاملہ کا رکن تھا جو اب صوبائی کانگریس ہے۔ شہر میں میونسپل انتخابات ہونے لگے، پرجا منڈل نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ حضرت صاحب کے حلقہ سے ایک ہندو کھڑا کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس حصہ میں مسلمان آباد تھے۔ ان دنوں پرجا منڈل کے سب سے بڑے لیڈر شاکر علی خاں تھے۔ شاکر علی خاں نے مجھ کو بلاکر کہا کہ اس امیدوار کو جو اس علاقہ سے کھڑا تھا، حضرت صاحب کے پاس لے جاؤ اور ان سے عرض کرو کہ وہ اس کی حمایت کریں۔ میں نے کہا ان سے کہنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ان کو تکلیف ہوگی اور وہ حمایت بھی نہیں کریں گے۔ ایک تو ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، دوسرے بڑے بڑے حکام ان کے یہاں آتے رہتے ہیں، مجھے امید نہیں کہ وہ حکومت کے مخالفوں کی حمایت کریں گے، لیکن شاکر علی نے اصرار کیا تو میں اس امیدوار کو لے کر حضرت صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ بے وقت گیا تھا، حیرت سے پوچھا کیسے آئے، میں نے کہا حضرت! اس بار میں اپنی ضرورت سے آیا ہوں انھوں نے کہا "ہاں، ہاں میں ضرور پوری کروں گا انشاءاللہ" میں نے کہا "یہ صاحب آپ کے علاقے سے میونسپلٹی کی ممبری کے امیدوار ہیں، میرے ساتھی ہیں، میں چاہتا ہوں آپ ان کی حمایت کریں" دیکھا کہ ان کی پیشانی پر شکن آگیا لیکن امیدوار سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "ووٹروں کی فہرست دے دیجئے گا میں ان سے کہہ دوں گا" چنانچہ حضرت صاحب نے اپنے ذوق کے خلاف ووٹروں سے کہا اور وہ ہندو امیدوار کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد شاکر علی خاں نے مجھ سے کہا کہ "حضرت صاحب کے یہاں آپ کی حاضری کا مجھ کو علم تھا۔ میں نے اس ہندو امیدوار کو آپ ہی کے بھروسہ پر کھڑا کیا تھا۔ سوچا تھا کہ اگر آپ کی سفارش کامیاب ہوگئی تو ہندوؤں کو بتا سکوں گا کہ مسلمان کا دل صاف ہے۔ وہ کمیونل نہیں ہے اور اگر کامیابی نہیں ہوئی تو کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ نفرت کے اس دور میں ہندو ہندو کو اور مسلمان مسلمان کو ووٹ دیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت کے انکساری کا جس نے مجھے شرمندہ کیا درج ذیل ہے۔

بھوپال میں برسات بہت زور کی ہوتی ہے، آسام کے چیرا پونجی کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش یہاں ہوتی ہے، اس لیے لوگ برسات سے پہلے جلاون کے لئے لکڑیاں جمع کر لیتے ہیں، میرے وہ عزیز جو حضرت صاحب سے مرید تھے، بھوپال سے باہر جا رہے تھے اور لکڑیاں جمع کئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا لکڑیاں مت خریدنا میرے یہاں لکڑیاں بہت ہیں منگا لینا۔ یہی پیش کش انھوں نے حضرت صاحب سے بھی کی لیکن نہ ان کو کہا کہ وہ مجھ سے یہی پیش کش کر چکے ہیں اور نہ مجھ کو کہا کہ وہ حضرت صاحب کو بھی کہہ چکے ہیں کہ لکڑیاں منگا لیں اب میں نے آدمی بھیجا کہ ان عزیز کے یہاں سے لکڑیاں لے آئے، آدمی تھوڑی لکڑیاں لایا اور بولا باقی لکڑیاں حضرت صاحب کے آدمی لے گئے۔ میں یہ سن کر کام پر چلا گیا واپس آیا تو دیکھا کافی لکڑیاں دروازے پر پڑی ہوئی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت صاحب نے یہ لکڑیاں بھجوادی ہیں۔ اس خیال سے کہ شاید میرا لکڑیاں منگوا لینا ناگوار گزرا ہے۔ ان کے یہاں حاضر ہوا اور معذرت کر کے اجازت چاہی کہ ان کے یہاں سب لکڑیاں پہنچا دوں۔ حضرت صاحب نے انکار کیا اور اس خیال سے کہ شاید میں اصرار کروں گا اٹھ کر اندر چلے گئے میں واپس آگیا اور پھر بہت زمانہ تک ان کے یہاں نہیں گیا۔ کوئی ایسا آدمی ان کے یہاں جاتا اور مجھے بھی جانتا تو کہتے محمد میاں کو بھیج دیجئے گا، لیکن میں اس پر بھی نہیں گیا۔ ایک روز میں بیمار تھا مجھ کو اطلاع دی گئی کہ پیر صاحب آئے ہیں، میں نے سمجھا کہ پیر بشو میاں آئے ہیں، ان کا تذکرہ آگے آئے گا، یہ میرے پاس بہت کثرت سے آتے تھے۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ ذرا

سٹ جائے بس پر بشو میاں کو اندر بلاتا ہوں، بہن ہٹ گئیں تو میں نے بلایا دیکھا کہ حضرت میاں لاٹھی پکڑے چلے آرہے ہیں، بس میں شرم سے ڈوب گیا، ان کا استقبال کیا، اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی، بیٹھتے ہوئے بولے "معلوم ہوا آپ کی طبیعت خراب ہے سوچا عیادت کرلوں" میں نے پان منگا کر پیش کیا پان لیتے ہوئے بولے میں پان کھاتا نہیں ہوں آپ کی خاطر سے لے لیتا ہوں۔ میں پھر حضرت صاحب کے پاس جانے لگا۔ بہت شفقت اور محبت سے ملتے تھے

میرے بہنوئی عبدالصمد صاحب کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے آئے اور جنازہ میں شرکت فرمائی وراثت کی تقسیم کے سلسلہ میں عبدالصمد صاحب کے ورثا میں اختلاف ہوگیا تھا اور سید سلیمان ندوی کی ثالثی میں مقدمہ تھا۔ وہ دیر کر رہے تھے اس لئے بھوپال میں کافی عرصہ قیام کرنا پڑا۔ ہر ہفتہ میں حضرت صاحب کے یہاں جاتا اور وہ مجھ سے دریافت فرماتے کہ "آپ کے معاملہ میں کیا ہورہا ہے؟" میں جواب دیتا کہ معاملہ ختم نہیں ہو رہا ہے اور یہاں کے قیام میں بے ضرورت خرچ ہو رہا ہے" ایک روز حضرت صاحب نے کہا میرے پاس ایک انگوٹھی ہے جس پر دعا لکھی ہوئی ہے وہ میں آپ کو اس شرط پر دیتا ہوں کہ کام ہو جائے تو واپس کر دیں۔ میں راضی ہوگیا۔ وہ ایک ڈبہ لائے جس میں عطر سے بھری ہوئی روئی کے اندر انگوٹھی تھی۔ مجھ کو ملی تو میں نے پہن لی۔ اس کا عجیب و غریب اثر پایا، جو معاملہ مدتوں میں طے ہوتا وہ دو روز میں طے ہوگیا نہ صرف سید صاحب کے یہاں بلکہ ہائی کورٹ کی تمام کاروائی بھی ایک روز میں طے پائی۔ میں حیرت میں پڑ گیا بہر حال انگوٹھی یہ کہتے ہوئے واپس کی کہ "حضرت جی تو نہیں چاہتا ہے کہ واپس کردوں لیکن آپ کا حکم ہے وعدہ کر چکا ہوں اس لئے واپس کرتا ہوں" حضرت نے فرمایا "جس اہتمام سے میں رکھتا ہوں اس اہتمام سے لوگ نہیں رکھ سکتے، اس لئے کسی کو نہیں دیتا"

والد مرحوم کا انتقال ہوا تو دوسرے روز ہم سب ان کے مزار پر جا رہے تھے میری بہن نے کہا میں بھی چلوں گی وہ اس قدر مغموم تھیں کہ منع کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ واپسی میں ہم سب حضرت صاحب کے یہاں گئے، ان سے کسی نے کہا کہ عورتوں کے مزارات پر جانے کے خلاف جو حدیثیں ہیں وہ سنادی جائیں۔ حضرت صاحب نے کہا ابھی نہیں۔ منع

کرنے کا وہ وقت تھا جب نہیں گئی تھیں۔ اور جب جا چکیں تو اب وہ وقت ہوگا جب غم پرانا ہو کر دور ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب بہن ان کی اہلیہ سے ملنے گئیں تو حضرت صاحب نے عورتوں کے مزارات پر جانے کے خلاف موثر تقریر کی۔

ایک بار قاضی ریاست نے جو مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے اور غالباً محمد حسن ان کا نام تھا ریڈیو کی خبر پر عید کا اعلان کر دیا۔ حضرت صاحب نے اس اعلان کو نہیں قبول کیا، ان کی حمایت میں نائب قاضی مولانا رضوان اللہ صاحب اور مفتی ریاست مولانا عبدالہادی صاحب بھی تھے، تینوں حضرات نے روزہ رکھا۔ دوسرے سال رویت ہلال رمضان کے بارے میں مولانا عبدالہادی صاحب نے جو ہمارے پڑوسی تھے، پوچھا ریڈیو کی کیا خبر ہے؟ میں نے کہا ریڈیو پر تو چاند ہو جانے کی خبر ملی ہے۔ مفتی صاحب نے کہا "ٹھیک ہے کل سے رمضان ہے" میں نے اعتراض کیا کہ "ایک سال پہلے تو آپ حضرات نے ریڈیو کی خبر کو تسلیم نہیں کیا تھا اب یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ کل سے رمضان ہے"؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ رمضان شروع کرنے کے لئے خبر مشہور کافی ہے کہ چاند ہو گیا لیکن رمضان ختم کرنے کے لئے خبر مشہور کافی نہیں اس کے لئے شہادت ضروری ہے کہ دیکھنے والا قاضی کے پاس کہے کہ میں نے چاند دیکھا" بہر حال اس واقعہ کے بعد قاضی محمد حسن صاحب ریٹائر ہو گئے اور سید سلیمان ندوی صاحب ان کی جگہ آئے اور جب عید کا موقع آیا تو انھوں نے ریڈیو کی خبر کو تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ریڈیو کی خبر، خبر ہے، شہادت نہیں ہے اور مقصود شہادت ہے۔ سید صاحب کے اس فیصلہ سے بھوپال کے علمار کو اور بالخصوص حضرت صاحب کو بہت خوشی ہوئی۔

میرے بڑے لڑکے محسن عثمانی جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو دہلی میں عربی نشریات سے متعلق ہیں[۱۵]، بھوپال ہی میں پیدا ہوئے تھے، میری بہن کبھی کبھی ان کو ساتھ لے جاتی تھیں۔ حضرت صاحب دیکھتے تو ان کو میرا طوطا اور میرا مٹھّا کہہ کر پیار کرتے تھے۔

۱۵۔ یہ ندوی جامعی، فاضل دیوبند و مدرسہ عالیہ اور ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں کتاب کی نظر ثانی کے وقت وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو چکے ہیں اور ریڈیو کی ملازمت ترک کر دی ہے۔

ایک دفعہ حضرت صاحب نے اپنے ایک قادیانی استاد کا ذکر کیا، کہنے لگے یہ قادیانی استاد جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ایک روز درس میں استاد نے اپنے خواب کا ذکر کیا انھوں نے دیکھا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ ہیں" حضرت صاحب نے کہا وہ یہ سن کر پریشانی میں پڑ گئے۔" مرزا صاحب کا کذاب ہونا اور جھوٹا نبی ہونا مسلم اور ان قادیانی استاذ کا سچا ہونا تجربہ سے ثابت، پھر اس خواب کا کیا مطلب ہے؟" حضرت صاحب نے اپنے دل میں یہ سوال کیا، یہاں تک کہ قادیانی استاد خود کہنے لگے کہ" انسان اپنے خیالات وجذبات وعقیدہ کے مطابق خواب دیکھتا ہے" حضرت صاحب نے کہا" تب میری سمجھ میں آیا کہ استاد نے کیوں ایسا خواب دیکھا، چونکہ یہ مرزا صاحب کو اچھا سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اس طرح کا خواب دیکھا ہے" سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے حضرت صاحب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہمیشہ بشارت کے لئے نہیں ہوتی بلکہ زجر اور تنبیہ کے طور پر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خواب کے بعد حالات اچھے رہے تو بشارت ہے ورنہ تنبیہ۔

وطن واپس آنے کے بعد ایک بار چند روز کے لئے بھوپال آیا، اور حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس کے بعد نہ بھوپال گیا، نہ حضرت صاحب کی زیارت ہو سکی۔ سنا کہ وہ پاکستان گئے تھے لیکن وہاں کا فسق وفجور دیکھ کر واپس آگئے۔ واللہ اعلم۔

مکہ معظمہ کے تبرکات کے بارے میں کہتے تھے کہ میں اپنے ماننے والوں کو کہتا ہوں کہ میرے لئے زمزم کے سوا کوئی چیز نہ لائیں۔ ایک دفعہ بمبئی میں راقم الحروف کے پاس ایک صاحب زمزم کا ایک بڑا ٹین چھوڑ گئے۔ یہ زمزم حضرت صاحب کو دینا تھا لیکن مجھ کو بھوپال نہیں جانا تھا، کئی آدمیوں سے کہا لیکن کوئی لے جانے پر راضی نہ ہوا۔ آخر میں اس ٹن کو پٹنہ لے گیا اور ان کے ایک مرید کو جو پٹنہ میں تھے اور بھوپال جا رہے تھے حوالہ کر دیا تاکہ وہ زمزم کے تحفہ سے خوش ہوں۔

معلوم ہوا تھا کہ کسی کو محض محمد کہہ کر پکارنا سوئے ادب سمجھتے تھے، اور غلام محمد پکارنا پسند کرتے تھے۔ واللہ اعلم اس لئے میں نے ان کو ایک دو خط لکھا

تو آخر میں اپنا نام اس طرح لکھا تھا "محمد غلام محمد" بھوپال چھوڑنے کے بعد حضرت صاحب سے خط و کتابت بھی نہیں رہی لیکن بہن مرحومہ سے خط و کتابت تھی۔ ان کے خطوط بہن کے کاغذات میں ملے چند عام افادہ کے لئے پیش ہیں۔

۱۔ خانقاہ شریف مجددیہ پیر دروازہ، بھوپال

جناب ہمشیرہ ام حبیبہ حفظہا اللہ!

بعد دعائے صحت و عافیت و فلاح دارین واضح ہو کہ خط آپ کا وصول ہو کر کاشف حالات ہوا۔ پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ نے جو اوقات ذکر متعین فرمائے ہیں بہت بہتر ہیں۔ اور جو برکات ظاہر ہو رہے ہیں موجب ترقی ہیں، اللہ پاک اور برکتیں عطا فرمائے اور باعافیت و بامراد رکھے۔

میں بھی خدا کے فضل سے مع متعلقین اچھا ہوں، بچیاں خیریت سے ہیں، عدیم الفرصتی کی وجہ سے وقتوں پر جواب دینا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ آپ سب کی عافیت کا طالب ہوں۔ گھر میں اور بچیاں سلام کہتی ہیں۔ اگر موقع ملا تو انشاء اللہ میں اپنے ہاتھوں سے بھی کوئی خط ضرور لکھوں گا۔ آپ کو ملاقات کا جتنا اشتیاق ہے اس سے زیادہ ہم لوگوں کو بھی ہے۔

راقم: محمد یعقوب مجددی

۲۔ از خانقاہ شریف، پیر دروازہ، بھوپال

عزیزہ وافر تمیزہ ام حبیبہ صاحبہ سلمہا اللہ تعالیٰ

بعد دعائے صحت و عافیت و فلاح دارین واضح ہو کہ آپ کا خط موصول ہو کر کاشف حالات ہوا۔ اللہ جل شانہٗ آپ سب کو بعافیت و بامراد رکھے اور اپنی رضا مندی کے کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ اصل جو عمدہ ذکر ہے اور جو ذکر کو قوت دیتا ہے وہ عام وقتوں کا ہے۔ اور زیادہ کار آمد ہے اس لئے کہ اس میں تکلیف کو اور مشق کو زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نشست جو بھی سہولت کی ہو بدلی جا سکتی ہے کیونکہ تکلیف سے توجہ تکلیف کی طرف ہٹ جائے گی۔ ذکر کی نشست اس لئے بالکل آرام دہ ہونا چاہئے اور حسب ضرورت بدلتے رہنا چاہئے

درود مبارک ایسے وقت کے لئے، اللھم صل علی سیدنا محمد نور القلب وقرۃ العین وعلیٰ آل سیدنا محمد جو وقت بے بہت عمدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت اور قوت عطا فرمائے۔ بحمد للہ اچھا ہوں اور آپ سب کی عافیت کا طالب

راقم: محمد یعقوب مجددی

اوپر کے ان دونوں خطوط پر تاریخ نہیں ہے اس لئے ان کو اوپر درج کر دیا گیا ہے نیچے کے خطوط تاریخ کے ساتھ ہیں۔

۴۔ از خانقاہ شریف مجددی، پیر دروازہ بھوپال

عزیزہ عفیفہ ہمشیرہ ام حبیبہ صاحبہ حفظہا اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ایک مفصل خط موصول ہوا جس میں آپ کا پتہ نہ تھا مجھ کو بہت پریشانی ہوئی کہ آپ کو جواب کیسے دوں، خیال ہوا کہ مکہ معظمہ ھدیٰ صاحب سے آپ کا پتہ معلوم کروں، اگر ان کو معلوم ہو تو آپ کا پتہ لے کر جواب دوں، خط معمولی نہ تھا کہ دیکھ کر ساکت ہو جاتا، اس میں بہت سی باتیں آپ نے معلوم کی ہیں، ان کا جواب بھی دینا ضروری تھا، کئی روز بہت پریشان رہا، اگر جگہ قریب ہوتی اور طبیعت اچھی ہوتی تو غالباً سفر کر کے آتا اور جواب دیتا، خداوند کریم کا ایک فضل ہوا کہ کچھ کاغذات تلاش کر رہا تھا اس میں ایک پرانا خط آپ کا نکل آیا اس میں پتہ نکلا تو بڑی خوشی ہوئی، اور کل سے میرے قلب کو بڑی تسکین ہے واقعہ یہ ہے جو جناب نے تحریر فرمایا ماں باپ کی اطاعت کا حکم جو اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے، وہاں ماں باپ کی بزرگی اور غیر بزرگی پر موقوف نہیں اسی طرح عورت کو خاوند کی فرمانبرداری پر جو مامور کیا ہے، یہ بھی حکم الٰہی ہے، اس کے لئے خاوند کا متقی و غیر متقی ہونا شرط نہیں، متقی اور غیر متقی اس روز کہیں گے جب قبر سے اٹھائے جائیں گے اس سے پہلے کسی پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا، جس کے عمل قابل قبول ہوئے وہ متقیوں میں شمار ہوا اور جس کے عمل نامقبول ہیں اس کا برا ٹھکانا مقرر ہوتا ہے، اسی طرح پیر ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ذریعۂ فیض مقرر کر دیا ہے۔ فیاض حقیقی جناب اللہ تعالیٰ

ہیں۔ دنیا میں فیض پہنچانے کا واسطہ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو رکھا ہے اور انسانوں ہی کے ذریعہ فیض پہنچتا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک فضیلت والے اللہ نے پیدا کئے ہیں اور وہ دنیا میں موجود ہیں، ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ جو کوئی اور فضیلت والا ملا تو پہلے والے کو ترک کر کے اس سے فیض حاصل کرنا چاہا یہ غلط طریقہ ہے، اسکی تفصیل بہت ہے جو اس مختصر میں آنا محال، خدا ملاقات کا موقعہ نصیب فرمائیں، اب آپ فیاض حقیقی کی طرف متوجہ ہوں اور جن شروط سے ذکر بتایا گیا ہے اپنی شروط سے ذکر جاری رکھئے صبح و شام استغفار (۳۶۰) بار پڑھنا جاری رکھئے۔ خدا کرے میرا خط آپ تک پہنچ جائے، جواب کا انتظار رہے گا، وقت بہت کم ہے۔ اس لئے اس مختصر پر ختم کرتا ہوں۔ میں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں آپ بھی دعاؤں میں مجھے نہ بھولیں، مکان میں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اور سلام کہتی ہیں اور ملاقات کی متمنی ہیں۔ سارا گھر آپ سے ملنے کا مشتاق ہے اس خط کا جواب ضرور دیں اور پتہ بھی ہر خط میں صاف لکھیں اور مکمل تحریر کریں۔ فقط

راقم محمد یعقوب مجددی

مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۵۸ء

۴۔ عزیزہ عفیفہ جناب ام حبیبہ صاحبہ سلمہا و عافاک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دو خط موصول ہوئے ہیں۔ ایک خط کا جواب لکھ دیا مگر دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کو خود خط لکھوں۔ کیا کروں نہایت عدیم الفرصت ہوں۔ اس لئے مجبور ہو جاتا ہوں۔ آپ کے اوقات سے نہایت خوشی ہوئی۔ مسلمان آخرت کو ایسا فراموش کئے ہوئے ہیں کہ اس کے ذکر سے بھی دلچسپی نہیں بلکہ وحشت ہے۔ لیل و نہار دنیا میں غرق ہیں۔ تدابیر دنیا روز و شب گھیرے ہوئے ہیں آخرت سے مطلق غافل ہیں۔ موت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں، اور نہ خبر سنتے ہیں کہ فلاں مر گیا، مگر اپنی موت یاد نہیں آتی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دل و دماغ میں گنجائش باقی نہیں کہ دنیا کے سوا اور خیال آوے۔ قرآن شریف کو غور کر کے تلاوت کرنا یہ سمجھنا کہ یہی ہمارا قانون زندگی اور بعد زندگی ہے، یہ بالکل مفقود ہے۔ اگر تلاوت کرتے ہیں تو خالی تلاوت کرتے ہیں۔

غور نہیں ہے۔ اگر قرآن شریف کو غور سے تلاوت کرو تو ممکن ہی نہیں کہ جذبۂ آخرت نہ پیدا ہو۔ خود بخود دل و دماغ جذبات آخرت سے موثر ہو کر دنیا اور اسباب دنیا کو نہایت ہی ناپائیدار ثابت کر دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسافرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہاں کی خوشی سے خوش نہیں ہوتا، یہاں کے رنج وغم سے متاثر نہیں ہوتا۔ حیات جس کا نام ہے وہ صرف کھانا سونا اور دنیا کے کام میں مصروف ہونا ہی نہیں ہے بلکہ حیات زندگی قلب ہے، اور قلب کی زندگی ذکرِ الٰہی ہے۔ ذکرِ الٰہی کے قبل بیگانگی دنیا سے ممکن صورت میں ضرور ہے۔
اب یہ خوب سمجھنا ہے کہ ذکر کیا ہے اور وہ کس طرح سے ہوتا ہے۔
یہ حقیقت ذکر جو مدد خداوندی اور تائید ایزدی سے لکھی جاتی ہے اس کا ذکر سے پہلے اور ذکر کے بعد ملحوظ رکھنا ضرور ہے وہ یہ ہے کہ:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

ترجمہ:۔ اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انس کو مگر عبادت کے لئے
جب ہماری تخلیق ہی عبادت کے لئے ہے تو یقیناً ہم پر اس کی راہیں بھی کھولی ہیں ذکر نام ہے غفلت دور ہونے کا۔ ہر شے ذاکر ہے، مگر ہماری غفلت اس ذکر کو معلوم کرنے سے مانع اور حاجب ہے۔ اس حجاب کو دور کرنے کی کوشش کرنا یہ ابتدائی کام ہے۔ اس کی نہایت واضح مثال یہ ہے کہ زمین کے نیچے پانی ہے اور ہم اس پانی کے ضرورت مند ہیں تو پانی پر جو حجاب ہے "مٹی" اس کو دور کرنا شروع کر دیتے ہیں، یہانتک کہ کنواں کھود لیتے ہیں شروع میں حاجب چیز سامنے آجاتی ہے اور جو چیز مقصود ہے وہ اس کے بعد ہے یعنی پانی۔ جب ذکر میں مشغول ہو تو اول مانع چیز پیش آتی ہے، اس سے ہرگز نہ گھبرائیے بلکہ کوشش بڑھائیے، خداوند کریم ارشاد فرماتے ہیں:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ ان اللہ مع المحسنین

ترجمہ:۔ جو کوشش کرتے ہیں ہماری طرف، ہم ضرور ان کو ہدایت کرتے ہیں اپنی راہوں کی طرف، بیشک اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
اول ذکر کرنے سے پہلے استغفار تین بار پڑھیں **استغفر اللہ الذی لا الہ**

الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ" اگر دلچسپی ہے اور معنیٰ کے ساتھ قلب مانوس ہے تو تین کی قید نہیں، جب دل حاضر ہے استغفار کرے اس کے بعد ایک بار یہ دعا پڑھے "اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک" معنیٰ کا خیال رہے معنیٰ یہ ہیں " اللہ! آپ میری مدد فرمائیں میرے ذکر میں اور شکر میں اور نیک عبادت میں" یہ سب قلب ہی سے ہے اور درود شریف دل میں تین بار پڑھیں اور ذکر شروع کر دیں جب چند بار ذکر ہو جاوے تب قلب ہی سے یہ دعا بتوجہ تام اور بحضور دل پڑھیں "اللھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک وحب عمل یقربنی الی حبک"۔ بعد پھر اسم ذات مبارک شروع کر دیں اور جب ذکر ختم کریں تو قلب ہی سے درود شریف تین بار تلاوت فرما کر ختم کریں۔ عام اوقات میں بلا قید امکانی صورت میں ذکر کا خیال رکھیں۔ جب زیادہ مصروفیت ہو بہ تکلف ہو اور بقوت و کوشش ذکر کا خیال رہے صرف خلوت اور تنہائی کے لئے ذکر مخصوص نہ رہے۔ عام اوقات میں تکلف اور کوشش کی ضرورت ہے۔ خاص اوقات میں بلا کوشش غور اور دھیان کی حاجت ہے۔ مجھ کو لکھنے کی کم عادت ہے، فرصت نہیں ہے کسی کو اپنے قلم سے نہیں لکھتا جناب کا شوق ذکر کا اس پر مجبور کیا کہ خود ہی لکھوں اور یہ باتیں دوسرے سے کہلوانا بھی مناسب نہیں۔ میرے خط وصول ہونے کی اطلاع فرما دیں۔ مکان میں بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اور بہت بہت سلام کہتی ہیں۔ ہر عبادت کے بعد معنیٰ پر توجہ فرماتے ہوئے یہ آیت ضرور تلاوت فرمائیں:

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

ترجمہ:۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو ہدایت دی اگر وہ ہدایت نہ دیتے تو ہم ہرگز ہدایت نہیں پا سکتے تھے۔ فقط

راقم الحروف محمد یعقوب مجددی

پیر دروازہ، خانقاہ شریف مجددیہ، بھوپال

۵۔ عزیزہ عفیفہ جناب ام حبیبہ سلمہا و عافاک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خط موصول ہوا۔ جذبات دینیہ نہایت قابل قدر ہیں۔ تمنا ہی ایک نعمت ہے جس کی پرورش سے بہت سی نعمتیں پا سکتے ہیں۔ عمل جیسا ہونا لائق ہے ویسا ظہور میں آنا محال ہے۔

بڑا کرم ہے اس پر جس کو اس کی تمنا ہے۔ بڑا غصہ اس پر جس کو اپنی تمنا سے محروم فرما دیا ہے۔ بہت ہی شکر کا موقعہ ہے جب اس کی تمنا ہو، بہت ہی خوف کا وقت ہے جب اس کی تمنا سے خالی ہو۔ جو نعمت عطا ہے موجب شکر ہے، لان شکرتم لازیدنکم فضل الہٰی پر شکر گذار رہے، شوق وامید خیر غالب رہے ان اللّٰہ بالناس لرؤف رحیم۔

دو چیزیں دونوں اپنے محل پر درست ہیں — خوف شوق، معصیت سامنے ہوتے وقت خوف غالب ہو اور ہر معصیت کو ایک عذاب الہٰی سمجھ کر خائف ہو اور پناہ مانگے۔ دنیا کی بعض ترقی جو دین کو بھلا دے عذاب الہٰی ہے۔ دعا کرے، خوف کرے، پناہ طلب کرے۔ عبادت، ذکر، نماز ان اوقات میں ذوق، شوق رہے۔ خداوند تعالیٰ کے کرم پر یقین تام ہو، جو حصہ عمر یاد میں صرف ہوا اور اس پر کمال خوشی و فرحت ہو۔ جو غفلت میں گزرے اس کی تلافی استغفار و توبہ سے ہو۔

یا رفیق، یا شفیق نجنا من کل ضیق (۰) بار ایک وقت میں مقرر کر کے تلاوت فرمادیں، جو پریشانی میں خدا کو فراموش نہ کرے اس کو اجر عظیم ہے اور درجات عالی اسی سے حاصل ہیں۔ جب کسی کام کو شروع کرنے کا مقصد ہو تو پہلے اس کی استعداد پیدا کرنا ضروری ہے، بے استعداد کام درست نہیں ہوتا۔ درود شریف کی استعداد کے لئے استغفار پڑھ کر اپنے دل و دماغ کو ممکنہ صورت میں اس قابل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ درود شریف کی تلاوت کر سکے۔ درود شریف بہت ہیں جون سا آسان ہو اور موقعہ اور وقت متقاضی ہو تلاوت فرمائیں۔ میں اکثر رمضان شریف میں خاص کر کے یہ درود شریف پڑھتا ہوں۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ اللھم رب الحل والحرام ورب الرکن والمقام

ورب المشعر الحرام بحق کلامک الذی انزلتہ فی شہر رمضان بلغ روح سیدنا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام منی تحیۃ وسلاماً یا ذوالجلال والاکرام یا اکرم الاکرمین یا ارحم الراحمین ۔ اور جو بھی موقع وقت درود شریف آسان ہو استغفار بھی اسی طرح ۔ آخری عشرۂ مبارک میں علاوہ اور چیزوں کے اللھم اجرنی من النار تلاوت فرمائیں ۔ ذکر تمام اذکار کی جڑ ہے ۔ مقصود زبانی ذکر سے بیداری قلب ہے ۔ جب زبانی ذکر سے مہلت مل جائے تو قلبی ذکر فرمائیں ۔ طریقہ زبانی بھی بیان ہوا ہے ۔ خلاصہ یہ کہ مختصر درود شریف قلب سے بھی ورد فرمائیں ۔

اللھم صل علی سیدنا محمد نور القلب وقرۃ اعینی وعلی الہ سیدنا محمد

دعائے استخارہ پڑھا کریں ۔ اس کے نہایت دل نشیں الفاظ ہیں ۔ قلب کو روشن کرنے والے ظاہری و باطنی معاملات درست کرنے والے ہیں یہ فقط استخارہ ہی نہیں ہے بلکہ ہر چیز کی طلب ہے ۔ خداوند کی قوت اور قدرت سے التجا ہے وہ استخارہ یہ ہے ۔ اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب ۔ اس کو زبانی بھی ورد فرمائیں ۔ سورہ الم نشرح بھی روشنی باطن کے لئے مفید ہے ، ایک ایک آیت کو ٹھہر ٹھہر کر قلب سے ورد فرمائیں ۔

چند روز سے اسہال اور ضعف بہت رہا ۔ آج بحمد اللہ کم ہے ، لکھنے کی عادت کم ہے ۔ اگر غلطی ہو تو مطلب اخذ فرمالینا ۔ آپ کے شوق ذکر نے آمادہ کر دیا کہ خود لکھوں دنیا کے قصے سب لے کر آتے ہیں ، دین کی بات کوئی نہیں پوچھتا ۔ دنیا دل و دماغ میں سما گئی ہے ۔ مکان میں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اور سلام کہتی ہیں ۔ فقط

راقم محمد یعقوب مجددی

۲۲ شعبان ۱۳۷۸ھ مطابق ۳ مارچ ۱۹۵۹ء

۶ ۔ عزیزہ عفیفہ جناب ام حبیبہ صاحبہ سلمہا اللہ تعالیٰ

۲۹ جون ۱۹۵۹ء

خط وصول ہوا، کیفیت معلوم ہوئی اللہ تعالیٰ بیداری اور حیات نصیب فرما دیں، وہ بیداری جس کو شریعت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداری شمار فرمایا ہے اور وہ حیات جس کے بعد ممات نہیں۔ اس ناکاری اور عارضی حیات کو لے کر جناب باری تعالیٰ حیات ابدی مدام عیش کی حیات عطا فرماتے ہیں۔ سادے سیدھے لوگ اس حیات پر اپنی دولت گنوا کر خالی ہاتھ جا کر پشیمانی اٹھاتے ہیں۔ دل اور دماغ اللہ کے ذکر سے روشن رہے تب صحیح اور درست راستہ سوجھتا ہے ورنہ تنزلات کو ترقیات، ذلتوں کو عزت، ممات کو حیات شمار کرتے ہیں۔ ہر ذلت اور عزت، ممات اور حیات نتیجہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ حیات جس کے آخر ممات ہے حقیقی حیات کب شمار کی جا سکتی ہے وہ حیات جس کو اللہ جل شانہ فرماتے ہیں "لایذوقون فیہ الموت" کیا مبارک حیات ہے اگر دنیا کی صد ہزار حیاتیں اس حیات پر قربان کی جائیں تو کم ہے۔

آپ کی ملاقات کی تمنا رہتی ہے۔ جناب مکرم علیٰی میاں صاحب ورجسٹرار صاحب کو میری جانب سے سلام مسنون فرما دیں۔

راقم محمد یعقوب مجددی
پیر گیٹ بھوپال

۷۔ ہمشیرہ عزیزہ سلمہا اللہ تعالیٰ وعافاک اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ جواب خط میں بہت عرصہ ہو گیا۔ بعض ایسے امور درپیش ہوئے جو تاخیر کا سبب بنے۔ خداوند تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ جذبات دینی آپ کے دل میں موجزن اور خیالات اخروی دماغ میں متمکن ہیں۔ یہ انعام ربی ہے "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء" پرفتن پرمحن دور میں دین پر قائم رہنا جہاد اکبر ہے بغیر توفیق الٰہی ممکن نہیں۔ امکان بشری سے باہر ہے۔ اہل عالم پر دنیا کی حرص ایسی چھائی ہوئی ہے کہ آخرت سے بالکل بے خبر ہیں۔ یعلمون ظاہراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون۔ دل و دماغ جو خاص ذکر و فکر اخروی کے لئے ہے اس کو دنیا کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ یہ لکھنا بیجا نہیں کہ مسجد جو خاص عبادت

کے لئے ہے اس کو کچرا کوڑا گھر بنا رکھا ہے۔ جس ذکر و فکر میں لیل و نہار گزار رہے ہیں اگر تائب، خائف نہیں ہوئے تو ان ہی نجاستوں کو لے کر قبر میں جائیں گے عیاذاً باللہ موت کو بالکل فراموش کر کے حیات عارضی کو حیات ابدی سمجھ لئے ہیں۔ جو خود اپنے حال کو خراب کر چکے ہیں وہ دوسروں کے حال کو بھی خراب کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ملاقات مضر ہو گئی ہے، تنہائی سب سے اچھی ہے۔ نیک ملاقات بالکل گم ہو گئی ہے، قرآن شریف کی تلاوت سے اولاً تو وحشت ہے اگر تلاوت کیا بھی تو معانی سے بیگانہ ہیں۔ مطالب اپنے منشار کے مطابق نکالتے ہیں۔ حضور سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ کے حال مبارک اور ارشاد مبارک قرآن شریف کی تفسیر ہے۔ حدیث شریف سے قرآن کی مطابقت ہونا صحیح ..... اذہان میں دیگر امور کی مداخلت نہ ہو۔ خدا کرے جناب سے ملاقات کا موقعہ نصیب ہو۔ میں بہت عدیم الفرصت ہوں، بہت خط آئے ہوئے ہیں جواب کا موقع نہیں ملتا اپنے ہاتھ سے کوئی خط نہیں لکھتا۔ آپ کے خلوص کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں۔ مکان میں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں، سلام کہتی ہیں۔ مجبوری سے خط تمام کرتا ہوں، ذکر کی پابندی فرماویں۔ بندہ کو خیریت کیفیت سے آگاہ فرماویں۔ فقط

راقم محمد یعقوب مجددی

خانقاہ محمد یعقوب نتھے میاں، ۲ر نومبر ۱۹۶۰ء

پتہ میں آپ نے ضلع کے بعد گیا نہیں تحریر فرمایا ہے۔ بمہربانی صاف اور مکمل پتہ تحریر فرمادیں۔ اگر ہمارے پاس پہلے کا پتہ نہیں ہوتا تو بہت دقت ہوتی۔

۸۔ عزیزہ عفیفہ جناب ام حبیبہ صاحبہ سلمہا دعافاک اللہ و بارکہا

السلام علیکم۔ بہت روز بعد خط وصول ہو کر خیریت و کیفیت سے آگاہی ہوئی۔ اول خط آیا تھا اور میں نے بہت بڑا جواب لکھا تھا شاید وہ اب تک نہ پہنچا۔ ڈاک کی بے انتظامی سے یہ باتیں اکثر پیش آرہی ہیں۔ بہت روز آپ کی ملاقات کو ہو گئے ہیں، جب کوئی جلسہ ہوتا ہے آپ یاد آتی ہیں۔ اتوار کو جلسہ مقرر ہوا کرتا ہے۔ عورت اور بہت مرد جمع ہوتے ہیں۔ خداوند کریم کی مدد سے وہ باتیں ادا ہو جاتی ہیں جو اول سے ذہن میں

نہیں ہوتیں. خود بھی مجھ کو عبرت ونصیحت ہوتی ہے اور تمنا کرتا ہوں کہ عملی قدم آگے ہو۔ قول جب ہی کار آمد ہے کہ قدم عمل بہت آگے بڑھا ہوا ہو۔ آپ کی پریشانیاں اور بیماری کا حال دیکھ کر دل پر بہت اثر ہوا۔ انشاراللہ دعا میں اپنی عاجز معصیت آلود زبان غافل قلب سے ملتجی ومتمنی بارگاہ عاجز نواز میں رہوں گا۔ وہ مالک حقیقی اپنے کرم سے آپ کو اطمینان وسکونی زندگی عطا فرما کر اپنے کام اور اپنی یاد میں مصروف فرمادیں۔ ان ذالک علی اللہ یسیر۔

دو رکعت نماز نفل صلوٰۃ حاجت جب ممکن آسانی ہو اس طرح ادا فرمادیں کہ اول رکعت میں بعد فاتحہ شریف سورہ الم نشرح تلاوت فرمادیں اس طرح کہ جب

فإن مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا

پڑھیں تو اس کو تین بار تکرار فرمادیں، بعد سورہ شریف تمام کر کے رکوع، سجدہ فرمادیں دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد والتین شریف تلاوت فرمادیں، جب

الیس اللہ باحکم الحاکمین

پڑھیں تو اس کے بعد تین بار کہیں — بلیٰ وانا علی ذلک من الشاھدین بعد تحیات ودرود شریف ربنا آتنا الخ تلاوت فرما کر سلام نہ پھیریں قبل سلام تین بار یہ دعا جو آگے مذکور ہوتی ہے تلاوت فرما کر سلام پھیریں، وہ دعا شریف یہ ہے:

اللھم لا سھل الا ما جعلتہ سھلا وانت تجعل الحزن سھلا اذا شئت

بعد سلام ہاتھ پھیرنے کے دعا میں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا تلاوت فرمادیں جو مذکور ہوئی۔ یہ نہایت ہی مفید چیز ہے۔ مکان میں بہت بہت سلام فرماتی ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اور ملنے کی دعا کرتی ہیں۔ بچیاں سب سلام کہتی ہیں۔ بڑی کی شادی ناگپور میں بحمداللہ ہو گئی ہے۔ فقط

راقم محمد یعقوب مجددی

۳۰ر جنوری ۱۹۶۳ء

۹- عزیزہ عفیفہ ام حبیبہ صاحبہ سلمہا وحفظہا۔ بعد دعا وترقی مدارج وفلاح دارین

واضح ہو کہ کل آپ کا خط وصول ہوا۔ خیریت کیفیت معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ میں بہت مصروف ہونے کی وجہ سے تاخیر جواب خط میں ہوئی۔ اکثر خطوط میں مصروفیت کی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ آپ کی خیریت کیفیت معلوم ہونے کا خود مجھ کو بے قراری سے انتظار رہتا ہے۔ آپ کے دلی جذبات کا اثر ہم سب پر ہے آئندہ انشاء اللہ بہت جلد جواب دیا کروں گا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں، کوئی اور بات نہیں ہے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ آپ کے یہاں آنے کا کوئی بہتر سامان ہو اور وہ باتیں جو دل میں ہیں جن کو قلم ادا کرنے سے مجبور ہے اور نہایت ضروری کارآمد باتیں ہیں کہنے کا موقع ملے۔ آپ جہاں تشریف لے جاویں وہاں کا پتہ تحریر فرمادیں۔ بہت جلدی میں مختصر خط آپ کو لکھا ہوں۔ فقط

راقم محمد یعقوب مجددی

اندرون پیر دروازہ خانقاہ، بھوپال

۱۴ / مئی ۱۹۶۳ء

۱۰۔ عزیزہ عفیفہ ہمشیرہ جناب ام حبیبہ سلمہا اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بہت روز میں آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہو کر کمال درجہ مسرت ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ آپ کو اپنی حفاظت میں مامون ومحفوظ رکھے۔ صبح وشام آپ اس کی تلاوت فرمالیا کریں اور خدا پر مطمئن رہیں اللہ تعالیٰ حفاظت کیلئے کافی ہے۔

فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین تحصنت بذی العزۃ والجبروت واعتصمت برب الملکوت وتوکلت علی الحی الذی لا یموت اصرف عنا جمیع البلاء انک علی کل شیٔ قدیر، وصلی اللہ علیہ خیر خلقہ سیدنا محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ اس میں سے ہر ہر جملہ کو تین تین بار تلاوت فرمائیں۔

آپ کو جو اشتیاق ہم سے ملنے کا ہے اس سے زائد ہم کو تمنا ہے۔ اہل خانہ بھی سلام عرض کرتی ہیں اور بچیاں سلام کہہ رہی ہیں، ہمارے خط وصول ہونے کی اطلاع مرحمت فرمائیں۔ اکثر خطوط ضائع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کے جواب خط موصول

نہ ہونے سے یہ فکر رہتی ہے کہ آیا ہمارا خط وصول ہوا یا نہیں۔ اس لئے جواب خط سے ضرور باخبر فرمادیں۔

فقط

راقم محمد یعقوب مجددی ۳ رجولائی ۶۴ء

خانقاہ مجددیہ پیر دروازہ، بھوپال

نوٹ:- محترمہ ہمشیرہ ام حبیبہ اپنے خاندان کے ایک بزرگ سے فردوسی (سہروردی) سلسلہ میں مرید تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت شاہ یعقوب صاحب سے انھوں نے تعلیم کے لئے رجوع کیا تھا۔ بھوپال میں تھیں تو تبلیغی جماعت والیوں کے ساتھ باقاعدہ تبلیغ میں حصہ لیتی تھیں۔ بہار آئیں تو اپنے قریہ میں اپنے طور پر اسی طریق سے تبلیغ کرتی رہیں یہاں تک کہ صحت نے جواب دے دیا۔ انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔

امیر شریعت ثالث مولانا شاہ قمرالدینؒ

خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں امیر شریعت اوّل مولانا شاہ بدرالدین اور ان کے صاحبزادگان خصوصاً مولانا شاہ محی الدینؒ کا مسلمانان بہار پر کافی احسان ہے۔ ان حضرات نے مسلمانان بہار کی دینی اور سیاسی رہنمائی کافی عرصہ تک کی ہے۔ جمعیۃ علماء بہار، دارالقضاء بہار اور امارت شرعیہ بہار کی تاسیس و تنظیم و تقویت میں مولانا سجادؒ کے موید و حامی و معاون اور رفیق رہے اور ہر قدم پر دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا، لیکن راقم الحروف کو چونکہ مولانا شاہ محی الدینؒ کے منجھلے بھائی سے ہی جو امیر شریعت ثالث ہوئے قربت رہی، اس لئے ان کا تھوڑا سا حال لکھتا ہوں۔

امیر شریعت ثالث مولانا شاہ قمرالدینؒ امیر شریعت اول مولانا شاہ بدرالدینؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ و عربی ادب وغیرہ و تصوف پر عبور اور قدرت رکھتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی سے ملتا تھا۔ ان کی شادی فردوسی خانوادہ کے ایک بزرگ خواجہ محمد خلیل صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی خواجہ محمد خلیلؒ مولانا فاروق چریاکوٹی کے شاگرد تھے۔ اور مولانا شاہ قمرالدینؒ کے رشتہ میں پھوپھا ہوتے تھے۔ والد مرحوم جن صوفیا رکی تعریف کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھے۔ اس لئے میں ان سے محبت کرتا تھا اور ان کی تعظیم کرتا تھا، گرچہ یہ رشتہ میں میرے چچازاد بہنوئی تھے۔

چونکہ میرا خاندان شروع سے جمعیۃ علماء اور امارت کا حامی تھا اس لئے جب مجھ میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیت ہوئی تو جمعیۃ اور امارت کی حمایت میں مضامین لکھنے لگا۔ میرے مضامین ان کو پسند آتے تھے اور جب ملاقات ہوتی تو میری ہمت افزائی فرماتے۔

شاہ قمرالدین صاحب خانقاہی مشغولیت کے باوجود امارت کے کاموں میں برابر ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور اس کی تقویت اور حمایت میں دوڑے کرتے تھے امیر شریعت ثانی کے زمانہ

میں امارت شرعیہ کے ناظم بیت المال رہے ۔ اور ان کے انتقال کے بعد امیر شریعت منتخب ہوئے جلسۂ عام میں تقریریں نہیں کرتے تھے لیکن اپنی مجلس میں مختصر لیکن فصیح و بلیغ اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ پوچھنے والے کو تشفی بخش جواب دیتے تھے، طبقہ صوفیا کے زبردست حامی تھے۔ کسی صوفی کی مخالفت سنتے تو اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی تاویل پیش کر دیتے، ویسے بھی کوئی کسی کی ان سے شکایت کرتا تو اس وقت تک اس پر یقین نہ کرتے جب تک کہ خود اس سے جس کی شکایت کی گئی ہے پوچھ نہ لیتے۔ ان کی مجلس میں دوسروں کو بھی غیبت کرتے نہیں پایا، کھانا بہت معمولی کھاتے تھے میں نے ان کے دسترخوان پر موٹا چاول، پتلی دال اور آلو کا بھرتہ دیکھا ہے، جو البتہ انکے پاس بہت اہتمام سے آتا تھا یہی بات جو میرا اپنا مشاہدہ تھا مجھ سے شاہ احمد حبیب صاحب نے کہی کہ وہ بھی ان کے عزیز ہوتے تھے اور پٹنہ کانگریس کے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ یہ معمولی کھانا پینا اس صورت میں اور بھی قابل تذکرہ ہے کہ ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی میں نے ان کو قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا سنجیدہ مذاق کر لیتے تھے۔

ایک دفعہ وہ ایک قریہ سملہ ضلع گیا جا رہے تھے جو راقم الحروف کا وطن ہے گیا اسٹیشن پر مولانا حکیم شاہ عماد الدین سلمہٗ سے ان کو معلوم ہوا کہ راقم الحروف بھی اسی ٹرین سے جا رہا ہے، انھوں نے فوراً مجھ کو بلا بھیجا اور کہا ملاقات کے لئے نہیں بلایا ہے۔ آپ سے اخبار و رسائل میں ملاقات ہو جاتی ہے، ناشتہ کرنے کی غرض سے بلایا ہے۔ اس کے بعد ہم سب نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔

خانقاہ کے ایک عرس کے موقع پر مسلم لیگ کے حامی طلبہ پٹنہ سے آکر نعرے لگاتے ہوئے پھلواری شریف بستی میں گھوم رہے تھے اور چلا رہے تھے "مولانا ہوں کہ مولانا، تسبیح سے گر گیا جو دانہ..... وغیرہ وغیرہ" میں اس وقت شاہ قمر الدین صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا سن کر کہنے لگے کہ آج کل علمائے حق کی بہت توہین ہو رہی ہے۔ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اللہ کا عذاب نہ آئے۔ ان کی زبان سے الفاظ نکلے تھے، سال پورا نہیں ہوا تھا کہ بہار کا فساد شروع ہوا مسلمانوں کی بستیاں جلائی گئیں، بچے اور بوڑھے قتل کئے گئے، عورتوں کی بے آبروئی ہوئی۔ مسلم لیگ کے ایک لیڈر کے بیان کے مطابق جو انھوں نے کانسل آف اسٹیٹ

میں دیا تھا، دس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے بعد سے مسلمانوں کے خلاف فسادات کا سلسلہ آج تک بند نہیں ہوا

فسادات کے زمانہ میں میں مولانا آزاد وغیرہ سے ملنے پٹنہ آیا تو معلوم ہوا کہ شاہ قمرالدین صاحب نے مجھ کو خط لکھا ہے۔ میں فوراً پھلواری شریف گیا اور ان سے ملاقات کی، انھوں نے کہا فسادات کی وجہ سے امارت کے کارکن ادھر اُدھر پھنسے ہوئے ہیں۔ مولانا عثمان غنی صاحب تک نہیں آسکے ہیں۔ میں نے تم کو خط لکھا ہے کہ آکر کچھ عرصہ کے لئے دفتر سنبھال دو۔ چنانچہ میں نے دفتر کا چارج لے لیا۔ 'نقیب' اخبار مرتب کیا، خطوط کے جوابات دیئے، استفسار و خطوط بہت جمع ہو گئے تھے ان کو لے کر شاہ قمرالدین صاحب کے پاس گیا اور ان سے ہنستے ہوئے کہا کہ فتوے بھی میں لکھ دوں، شاہ صاحب نے مختلف علمار کے نام بتائے جو پھلواری میں تھے اور فتوے دے سکتے تھے اور کہا ان کو ان میں تقسیم کردو۔

ایک استفسار ان عورتوں کے بارے میں تھا جو اپنی عزت بچانے کے لئے خودکشی کر چکی تھیں مولانا قاضی نورالحسن صاحب نے جواب لکھا تھا کہ ان کی موت حرام ہوئی۔ شاہ قمرالدین صاحب نے دیکھا تو کہا کہ ان کو کہئے کہ اس عبارت میں نظرثانی کرلیں۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ فتوی انھوں نے ٹھیک لکھا ہے۔ قاضی احمد حسین صاحب کے مشورہ سے میں نے اس فتویٰ کو نہیں بھیجا، بلکہ نقیب اخبار میں نوٹ لکھ دیا کہ اس طرح کے استفتے آتے رہتے ہیں اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ جو عورتیں خودکشی کر چکی ہیں ان کے بارے میں اب ہم کو کوئی فیصلہ کرنا نہیں ہے، اب وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہیں اور اس کے عفو و درگذر کی امیدوار ہیں، البتہ جو عورتیں زندہ ہیں ان سے کہنا ہے کہ وہ اس طرح کا ارادہ نہ کریں، کیونکہ خودکشی حرام ہے۔ شاہ قمرالدین صاحب نے یہ تحریر پڑھی تو بہت خوش ہوئے معلوم ہوا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہ بھی مسئلہ کی حد تک قاضی نورالحسن صاحب کے ہم خیال تھے۔

جب مولانا عثمان غنی صاحب تشریف لے آئے تو میں گیا واپس آگیا۔ امیر شریعت ثانی کے انتقال کے بعد جب شاہ قمرالدین صاحب امیر شریعت مقرر ہوئے تو مجھ سے کئی بار کہا کہ تم مستقل طور پر امارت میں جاؤ۔ یہی خواہش مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی مولانا نورالحسن صاحب

اور قاضی احمد حسین صاحب نے بھی کی تھی۔ اس وقت تو حالات نے مجھ کو اجازت نہیں دی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے کہ مجھ کو امارت شرعیہ کے کام کے لئے مستقل طور پر آنا پڑا۔ مجھ کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی جمعیۃ علماء کے کام کے لئے دہلی بلایا تھا۔ شاہ محمد الدین صاحب نے سنا تو کہا کہ "وہاں کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ بہار میں آدمی نہیں ملتے ہیں اس لئے آپ یہاں کام کریں۔"

ایک زمانہ میں میں بہت خوفناک خواب دیکھتا تھا میں نے ان سے ذکر کیا، انھوں نے کہا کہ آپ کے خاندان میں حصن حصین کی دعائیں معمول میں ہیں۔ اسی کی دعا بتا دیتا ہوں" چنانچہ انھوں نے مجھ کو دعا لکھ کر دی اس کو پڑھتا رہا لیکن شکایت دور نہیں ہوئی میں نے ان سے پھر کہا۔ اس بار وہ دو منٹ تک مراقب رہے اس کے بعد کہا جاؤ اب یہ شکایت نہیں ہوگی، ان شاء اللہ چنانچہ اس کے بعد یہ شکایت جاتی رہی، بلکہ بشارت کے خواب دیکھنے لگا۔

ایک بار انھوں نے کہا کہ دفتر امارت میں میلاد کی کتاب کے بارے میں کوئی صاحب مشورہ طلب کریں تو ان کو شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب کی میلاد کی کتاب پڑھنے کا مشورہ دے دو۔ میں نے کہا یہ کتاب تو اب ملتی نہیں ہے ان کے ورثاء بھی پاکستان چلے گئے، کہئے تو میں خود ایک کتاب لکھ دوں، چنانچہ ان کی اجازت سے کتاب مرتب کی اور ان کی خدمت میں پیش کی، انھوں نے کتاب پسند کی، لیکن یہ کہا کہ یہ کتاب امارت کی طرف سے نہیں شائع کرنی چاہیئے کیونکہ مسئلہ میلاد پر علماء کے درمیان اختلاف ہے دوسری بات یہ کہی کہ قیام کے وقت جس سلام کا رواج ہے وہ اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے لوگ ان کتابوں کو بھی رکھیں گے جن میں یہ سلام ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ موضوع روایتیں بھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مقصد حاصل نہ ہوگا اور غلط روایتوں کی اشاعت باقی رہے گی۔ چنانچہ ان کی رائے کی بناء پر امارت کی طرف سے یہ کتاب شائع نہیں کی گئی اور مولانا شاہ عون احمد صاحب نے جو اس زمانہ میں نائب قاضی تھے، مسودہ کتاب ایک صاحب کو دے دیا جو کتابوں کا کاروبار کرتے تھے انھوں نے یہ کتاب چھپوائی پھر مولانا منت اللہ صاحب کے عہد میں

مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت کی یہ رائے سے یہ کتاب امارت کی طرف سے شائع ہوئی اور اس میں مروجہ سلام درج کر دیا گیا۔

میں نے ابتدا میں کوشش کی تھی کہ ہر ضلع میں با اثر اشخاص کی ایک کمیٹی بنا دوں، جو امارت کے مبلغوں اور عالموں کی اپنے اپنے علاقہ میں مدد کریں۔ جب یہ خطرہ پیدا ہوا کہ بعض دوسری جماعتوں سے ٹکر ہوگی تو میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ ایک روز احمد نور صاحب نائب وزیر حکومت بہار نے مجھ سے پوچھا کہ وہ جو آپ ہر ضلع میں کمیٹیاں بنا رہے تھے اس کام کو کیوں چھوڑ دیا؟ میں نے کہا آپ حضرات کی مخالفت کی ڈر سے۔ اور نور صاحب نے کہا ہم تو ساتھ ہیں آپ اس کام کو کیجیے اور پہلے امارت کے دفتر میں ان لوگوں کو بلائیے جن کو آپ مفید سمجھتے ہیں۔ اور وہاں یہ مشورہ کیا جائے کہ کس طرح امارت کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ میں نے امیر شریعت کو اس کی اطلاع دی، انھوں نے کہا سب کو بلا لو۔ چنانچہ احمد نور صاحب کے مشورے سے چیدہ حضرات کو مدعو کیا گیا۔ عبدالقیوم انصاری اور جعفر امام سابق وزرائے بہار اور دوسرے حضرات آئے۔ دیر تک گفتگو رہی۔ جلسہ کے صدر مولانا عثمان غنی صاحب تھے۔ مدعوئین حضرات چاہتے تھے کہ امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ میں رد و بدل ہو، لیکن امارت کے ذمہ دار حضرات یہ نہیں چاہتے تھے آخر یہ بات طے پائی کہ سردست امارت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے ایک عام اپیل کی جائے۔ میں نے پہلے ہی اس کا مسودہ تیار کر لیا تھا سب حضرات نے اس پر دستخط کیے اور وہ اپیل پریس کو دے دی گئی۔ شاہ قمرالدین صاحب نے اس اپیل کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔

جمعیۃ علماء ہند کا نیا دستور بنا تو اس میں ایک دفعہ زکوٰۃ فنڈ کی تھی، میں نے مولانا عبدالصمد صاحب سے کہا کہ آپ نے مجلس عاملہ میں کیوں نہیں کہا کہ بہار کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جائے؟ مولانا عبدالصمد صاحب نے جواب دیا کہ یہ نہیں مانیں گے، تم کہہ کر دیکھو، چنانچہ میں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو متوجہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں تو جمعیۃ علماء بہار اور امارت شرعیہ بہار کے درمیان طے ہونے کی ہیں، پھر میں نے مزید کوئی گفتگو نہیں کی اور واپس چلا آیا۔

ایک روز مولانا شاہ قمر الدین صاحب سے ملنے گیا تو انھوں نے شکایت کی کہ جمعیۃ علمار بہار زکوٰۃ کی رقمیں وصول کر رہی ہے اور یہ کہ ان کے پاس اس قسم کے خطوط آئے کہ زکوٰۃ کس کو ادا کریں۔ مولانا سجادؒ کا خیال تھا کہ زکوٰۃ امیر شریعت کے واسطہ سے ادا نہ کریں تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، وہ قرآن کی یہ آیت "خذ من اموالھم صدقۃ" بطور دلیل پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر کے اس کے متعینہ مدات میں امیر خرچ کرے، زکوٰۃ کے مدات میں عاملین کا حق رکھا گیا ہے، یہ بھی اشارہ اسی طرف ہے کہ زکوٰۃ امیر کو دینا چاہیئے۔ پھر خلیفہ اول نے اس بارے میں اتنی سختی کی کہ جو لوگ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے تھے ان سے انھوں نے جہاد کیا۔ تینوں امیر شریعت مولانا سجادؒ کے اس خیال کے ساتھ تھے۔ خود مولانا آزاد نے کلکتہ میں عیدین کے کئی خطبوں میں اجتماعی زکوٰۃ پر زور دیا تھا، اور کہا تھا کہ سلف میں علمار نے امیر کو زکوٰۃ ادا کرنے کا فتویٰ دیا تھا، خواہ وہ فاسق ہو، مفتی کفایت اللہ صاحب بھی امیر کو زکوۃ ادا کرنے کے حق میں تھے، ان کی عبارت کتاب العشر والزکوٰۃ" مرتبہ مولانا عبد الصمد رحمانی میں موجود ہے۔ اسی طرح مولانا عبد الحلیم صدیقیؒ نے لکھا ہے کہ" امیر کے طلب کرنے پر زکوۃ امیر کو نہ دی جائے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

چونکہ جمعیۃ علمار اور امارت شرعیہ میں کام کرنے والے ایک ہی تھے اس لئے شاہ قمر الدین صاحب کو اس سے تکلیف پہنچی۔ میں نے مولانا حسین احمد صاحب کو خط لکھا۔ انھوں نے فوراً جواب دیا اور ایک اپیل لکھی ہوئی بھیجی کہ اس کو اخبارات میں شائع کرا دیا جائے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جمعیۃ علمار بہار کے کارکن زکوٰۃ کی رقمیں نہ لیں، بلکہ لوگوں سے کہیں کہ زکوٰۃ کی رقمیں امارت کو بھیجی جائیں۔ شاہ قمر الدینؒ نے شیخ کی اپیل دیکھی تو کہا شیخ نے تو لکھ دیا ہے، ان کے علم کا تقاضا بھی یہی تھا، لیکن یہ لوگ اب اس پر عمل بھی کرتے ہیں، یا نہیں یہ دیکھنا ہے۔

شاہ قمر الدین صاحب خانقاہ کے آداب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شاہ محی الدین صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے شاہ امان اللہ صاحب سجادہ نشین ہوئے، کئی سال تک

شاہ قمرالدین صاحب کا معمول تھا کہ عرس کے موقع پر اپنے کمرہ کا دروازہ بند رکھتے تھے تاکہ مریدین ان کے یہاں جمع نہ ہوں، اور یہ نہ سمجھا جائے کہ خانقاہ میں مرکزی حیثیت ان کی ہے۔ شاہ امان اللہ صاحب ان کی طرف سے گزرتے تو کھڑے ہو جاتے، حالانکہ ان کے بھتیجے ہوتے تھے۔

آخر وقت تک اپنے خانقاہی فرائض کو پورا کرتے رہے، سخت بیمار تھے، بنارس کے عرس کا موقعہ آیا جسکی ذمہ داری ان پر تھی تو روانہ ہو گئے۔ میں نے جانے سے پہلے دریافت کیا کہ ڈاکٹروں نے اجازت دے دی ہے؟ بولے اجازت دے دیں گے۔ گزشتہ سال اس سے زیادہ طبیعت خراب تھی لیکن گیا تھا۔ جب بنارس سے واپس آئے تو بہت زیادہ طبیعت خراب ہو چکی تھی، یہانتک کہ انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نے کبھی وضو ترک نہیں کیا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ تیمم کر لیں، لیکن فرماتے کبھی وضو کے بغیر نماز نہیں پڑھی وضو نہیں کروں تو نماز نہیں پڑھ سکوں گا۔

انتقال سے پہلے وصیت کی کہ ان پر جو قرض ہے کفن دفن سے پہلے ادا کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں نے تقویٰ کا یہی حال ان کے منجھلے بھائی مولانا شاہ نظام الدین صاحب میں پایا۔ میں نے ایک روز ان سے ایک دعا پوچھی تھی، انھوں نے کہا کل بتادوں گا، دوسرے روز ایک ضرورت سے میں پٹنہ چلا گیا انھوں نے دن میں میرا انتظار کیا جب شام ہو گئی تو ان کو خیال آیا کہ وعدہ خلافی ہو جائے گی۔ انھوں نے عماد الدین سلمہٗ کو بلا کر پوچھا کہ عثمانی صاحب جہاں رہتے ہیں تم جانتے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، فرمایا، چلو، میرے یہاں تشریف لائے میں تو موجود نہیں تھا۔ دعا میرے لڑکے کو دے کر چلے گئے۔

شاہ نظام الدین صاحب کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا منت اللہ صاحب امیر شریعت منتخب ہوئے اور پہلی دفعہ ان کی مجلس شوریٰ کا جلسہ ہوا تو کچھ ایسے لوگ بھی آئے جو پہلے کبھی پھلواری شریف نہیں آئے تھے۔ یہ لوگ پٹنہ اسٹیشن سے نکل کر پھلواری شریف جانے والے ٹم ٹم پر بیٹھے اسی پر شاہ نظام الدین صاحب بھی تھے۔ ان سے مہمانوں نے جو ان کو پہچانتے نہیں تھے پوچھا پھلواری میں خانقاہ کدھر ہے؟

شاہ صاحب نے کہا میں ادھر ہی چل رہا ہوں آپ کو پہنچا دوں گا۔ انھوں نے پھر پوچھا آپ خانقاہ میں رہتے ہیں؟ وہاں کیا کرتے ہیں، شاہ صاحب نے کہا جی ہاں خانقاہ میں رہتا ہوں، بچوں کو پڑھاتا ہوں بات تو ٹھیک تھی لیکن اگر وہ کہتے کہ میں سجادہ نشین کا چچا ہوں۔ امیر شریعت اول کا لڑکا ہوں امیر شریعت ثانی اور ثالث کا بھائی ہوں تو یہ بھی ٹھیک ہی باتیں تھیں لیکن انھوں نے اخفا سے کام لیا اور انکساری کی راہ اختیار کی۔ مولانا منت اللہ صاحب کے انتخاب پر انہوں نے فوراً ان کی امارت قبول کرنے کا اعلان بھی کیا تھا

مبارک ہے وہ خاندان جس کا ہر فرد اچھا ہو۔ یہ خاندان ابھی "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کے مصداق رہا ہے۔ آخر میں حضرت مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم کے مندرجہ ذیل تاثرات کو میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"امیر شریعت ثالث کی امارت کا دور سخت نازک دور تھا۔ امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والتسلیم امیر ثالث کے دور میں مختلف مصائب اور ہر قسم کے فتن میں مبتلا تھی، اور پوری امت وجعلنا بعضکم لبعض فتنہ کی مظہر بنی ہوئی تھی۔ ایسے نازک دور اور زمانہ فتن میں امیر ثالث کی ہمت کو شاباش ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے خطرات میں امت کی صحیح رہنمائی اور ملت کی خدمات انجام دیتے ہوئے گوناگوں امراض میں مبتلا ہوئے اور اپنی جان حضرت حق جل مجدہ کے سپرد کر دی۔"

مولانا عبدالخبیر (امیر جماعت اہل حدیث)

مولانا سید احمد شہید اور اسماعیل شہید نے جب جہاد فی سبیل اللہ کی طرف قدم بڑھایا اور اہل حدیث جماعت کی بنیاد رکھی تو ان کے ایک دست راست اور اہل حدیث تحریک کے مضبوط ستون مولانا ولایت علی (صادق پور، پٹنہ) تھے اور انھوں نے دونوں بزرگوں کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کی قیادت سنبھالی تھی۔ انھوں نے اور ان کے خاندان والوں نے اپنے عقیدہ اور اپنے مسلک کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ان کو سزائے قید، جائدادوں کی ضبطی اور عبور دریائے شور تک کی سزائیں بھگتنی پڑیں۔ اسی خاندان سے مولانا عبدالخبیر صاحب کا تعلق ہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے بعد ان کو جماعت اہل حدیث کا امیر بنایا گیا۔ پٹنہ، آرہ، دربھنگہ میں ان کے ماننے والے کثرت سے تھے۔ پٹنہ میں ان کو ماننے والے کی تعداد اتنی کثرت سے تھی کہ کوئی لیڈر جس کو عوام کی تائید حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مسلک کے لوگ بھی ان کی کافی عزت کرتے تھے۔ مدرسہ اصلاح المسلمین اور جماعت اہل حدیث کی نگرانی کے علاوہ انجمن اسلامیہ ہال میں جسے جسٹس شرف الدین نے بنوایا تھا، قرآن کا درس دیتے تھے۔ اہل علم حضرات اور مسلم وکلا بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ آخر میں صورت یہ ہو گئی کہ پٹنہ میں مسلمانوں کا جو جلسہ بھی ہوتا صدارت ان کو ملتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پٹنہ میں مسلمانوں کے صرف دو طبقے تھے جن کا عوام و خواص پر اثر تھا، ایک خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور دوسرے مولانا عبدالخبیر صاحب صادق پوری جو اپنے حلقے میں مولانا کے نام سے مشہور تھے۔

پٹنہ میں جب میرا قیام ہوا اور جمعیۃ علماء کی نظامت میرے سپرد ہوئی تو میں نے مولانا عبدالخبیر صاحب سے ملاقات کی۔ اور ان سے عرض کیا کہ ہم خصوصی حضرات کا ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں آپ اس میں شریک ہوں۔ انھوں نے بہت خوشی سے میری اس دعوت کو قبول کیا۔ اور پابندی سے اس اجتماع میں آنے لگے۔ حالانکہ انھوں نے امارت شرعیہ کی مجلس عاملہ کے رکن ہونے کے

باوجود اس میں کبھی شرکت نہیں کی۔ اس اجتماع میں ملک العلما مولانا ظفر الدین صاحب بھی شریک ہوتے تھے اور تبادلۂ خیالات میں حصہ لیتے تھے ایک روز قاضی احمد حسین صاحب نے سنا کہ یہ دونوں حضرات ہمارے اجتماع میں شریک ہوتے ہیں، تو کہنے لگے، تمہاری کرامت ہے کہ دو مختلف مسلک کے آدمی ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور آپس میں ٹکراتے نہیں ہیں۔ اصل میں مولانا عبدالخبیر صاحب جھگڑنے والے آدمی نہیں تھے۔ مخالفت کی بات ہوتی تو خاموش ہو جاتے تھے اور مولانا ظفر الدین صاحب مخالف الخیال حضرات کے مجمع میں خود کوئی اختلافی مسئلہ نہیں چھیڑتے تھے۔ البتہ کوئی دوسرا چھیڑے تو بخشتے نہیں تھے، ہمارے اجتماع میں چونکہ مسلک کے اختلاف پر کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی اس لئے دونوں حضرات اس میں حصہ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ مولانا عبدالخبیر صاحب مجھ سے محبت کرنے لگے کوئی درخواست ان کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ کبھی رد نہیں فرماتے تھے، اور اس کو ضرور کرتے تھے، میں بیمار ہوتا تو میری عیادت کو تشریف لاتے۔ ایک روز ایک صاحب نے آکر کہا کہ مولانا نے خطبۂ جمعہ میں آپ کا ذکر کیا اور کہا کہ مخلص آدمی ہیں پٹنہ میں جو کام کر رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اس میں ان کے ساتھ تعاون کریں، جن صاحب نے یہ بات کہی تھی وہ پابندی کے ساتھ مولانا عبدالخبیر صاحب کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ یہی بات مولانا ظفر الدین صاحب نے بھی اپنی مسجد میں بعد نماز جمعہ مسلمانوں کو روک کر کہی تھی۔

مولانا عبدالخبیر صاحب مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے بھی بہت محبت کرتے تھے اور کہتے میں پھلواری دوسرے مسلک والوں کی میت میں شریک کے لئے کبھی نہیں گیا لیکن جب معلوم ہوا کہ مولانا سجادؒ کا انتقال ہو گیا ہے تو پھلواری شریف گیا، مولانا کی میت اس قدر جلد دفن کی گئی کہ اس میں شرکت نہ ہو سکی۔

رویت ہلال کے سلسلہ میں امارت شرعیہ کو اپنا تعاون دیتے تھے، ایک بار اسی رویت ہلال کے سلسلہ میں امارت شرعیہ کے سے اختلاف ہو گیا اور پٹنہ میں دو روز عید قرباں کی نمازیں ہوئیں۔ میں اس زمانہ میں پٹنہ میں نہیں تھا۔ پٹنہ آیا اور عبدالقدوس صاحب وکیل مرحوم سے اختلاف کا حال معلوم ہوا تو پھلواری گیا اور قاضی احمد حسین صاحب اور مولانا عثمان غنی صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالخبیر صاحب سے تعلقات استوار رہنے چاہئیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ

جلوان سے مل کر اپنا اختلاف ختم کردیں۔ چنانچہ قاضی صاحب اور مولانا عثمان غنی صاحب کے ساتھ میں مولانا عبدالخبیر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچا اور اس موضوع پر ان سے گفتگو ہوئی مولانا عبدالخبیر صاحب نے کہا کہ "میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے تعاون سے کام کروں، آپ حضرات نو چھوڑ کر شہر میں جو رؤیت ہلال کمیٹی بنی ہے اس سے استعفیٰ تو نہیں دوں گا، لیکن اس سے دلچسپی کم کردوں گا۔

مولانا کو مجھ سے اس قدر حسن ظن ہو گیا تھا کہ پٹنہ کے مسلمانوں کے بعض مشورتی جلسوں میں انھوں نے مجھ کو تلاش کیا اور پوچھا کہ عثمانی صاحب کو خبر نہیں کی گئی ہے؟

کے ایم منشی کے ادارہ سے شائع شدہ ایک کتاب میں حضرت عائشہؓ کے خلاف بعض رکیک جملے تھے، مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس موقع سے پٹنہ کے مخصوص حضرات کا اولا اجتماع ہوا، پھر جلسہ عام ہوا، دونوں کی صدارت حکیم عبدالخبیر صاحب نے کی۔

خصوصی جلسہ کی ایک تجویز میں عبارت اس طرح تھی "حضرت عائشہؓ کی توہین کوئی اسلام پرست برداشت نہیں کرسکتا" یہ تجویز زیر بحث تھی کہ میں پہنچا اور بولا کہ "اسلام پرست" کا لفظ نکال کر مسلمان کر دیا جائے۔ یہ تجویز فوراً قبول کر لی گئی۔ مولانا عبدالخبیر صاحب نے کہا کہ یہ لفظ مجھ کو بھی کھٹک رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے اس کو بدلوایا۔ اسی طرح جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کے ایم منشی کی اس کتاب کا جواب یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں میں اپنے بزرگوں اور اسلام کا صحیح تعارف کرائیں اور اس کے لئے دن کا کھانا اور رات کی نیند حرام کر دیں اور اس طرح کی دل آزاریوں میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثالیں سامنے رکھیں۔ میں نے کہا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جتنی محبت تھی اس کا عشر عشیر بھی ہم میں رسول کی محبت نہیں ہے لیکن وہ حضور کی تکذیب اور توہین کا جواب غیض وغضب سے نہیں دیتے تھے بلکہ آپ کی تصدیق کرکے اور آپ کے پیغام کو دور ونزدیک پہنچا کر دیتے تھے اور اس راہ میں ہر طرح کی اذیت سہتے تھے۔ میں نے مسلمانوں سے یہ بات کہی کہ وہ عہد کریں کہ اسلام کو دوسروں تک پہنچائیں گے۔ جلسہ کے بعد جب مولانا سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے میری تقریر کو بہت سراہا۔ واقعہ یہ ہے کہ

غیر مسلموں کی طرف سے اس طرح کی اشتعال انگیزی کا جواب اشتعال انگیزی سے نہیں دینا چاہیئے اس کے بجائے مسلمانوں کو دعوت اور اسلام کے تعارف کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے۔

جب ابتدائی دینی تعلیم کے لئے بہار کے مسلمانوں کی جماعت بنی تو بہار کی اس جماعت کی صدارت کے لئے مولانا عبدالخبیر صاحب کا نام منظور ہوا۔ افسوس یہ جماعت جمعیۃ علمار اور جماعت اسلامی کے اختلاف کی نذر ہو گئی۔

جب مولانا منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار و اڑیسہ منتخب ہوئے تو ان کو خوشی ہوئی کہ کیونکہ وہ مسلک کے اعتبار سے ان سے کچھ قریب تھے۔ انھوں نے امیر شریعت سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ امیر شریعت کو ان کے یہاں لے گیا اور دونوں تھوڑی دیر تک دینی تحریکات کے سلسلہ میں باتیں کرتے رہے۔ پٹنہ میں امارت شرعیہ کے مقابلہ میں دوسری امارت شرعیہ بنانے کے لئے جب کچھ حضرات نے جلسہ کرنا چاہا تو مولانا کے ماننے والوں نے جن میں مولانا اصغر امام فلسفی پیش پیش تھے۔ اس جلسہ کو نہیں ہونے دیا۔

مولانا کا ذریعہ رزق ان کا مطب تھا جہاں کی ہر چیز پرانے وضع کی تھی، اپنی زندگی میں اپنے چھوٹے لڑکے مولانا عبدالسمیع صاحب کو جو مدرسہ اصلاح المسلمین، ندوۃ العلمار لکھنؤ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم پا چکے ہیں، اپنا جانشین بنا دیا۔ یہ بھی اپنی طبیعت اور طرز زندگی میں اپنے والد کی طرح ہیں اور ماشار اللہ ذی علم ہیں۔ جامعہ ام القریٰ مکہ معظمہ کے کتب خانہ میں کام کرتے ہیں۔

شمس العلماء حافظ محب الحق

شمس العلماء ایک بستی شاہو بیگھا ضلع گیا کے رئیسوں میں تھے۔ مشہور شاعر فضل حق آزاد عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مشہور بیرسٹر اور بہار کے پہلے مسلمان جج جسٹس شرف الدین وارثی کے برادر نسبتی تھے (جو گاندھی جی سے پہلے عہد کی کانگریس کے لیڈر تھے، جن کی ملی خدمات کے نشانات کلکتہ اور پٹنہ میں اب بھی ملتے ہیں) اور مسٹر عزیز بیرسٹر سابق وزیر تعلیم بہار کے بہنوئی تھے۔ متعدد دینی کتابوں کے مصنف اور جمعیۃ علماء بہار، امارت شرعیہ بہار کی تاسیس میں اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تحریک میں شریک تھے۔ میلان اہل قرآن کی طرف تھا پھر بھی مولانا محمد علی مونگیری سے نقش بندی سلسلہ میں بیعت کا شرف رکھتے تھے۔ ان کے انتقال پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے لکھا تھا کہ اہل قرآن میں اس لحاظ سے یہ منفرد تھے کہ ان کے قلم سے دل آزاری کا کوئی لفظ نہیں نکلا۔ ان کی علمی خدمات کی بنا پر نظام حیدر آباد انکو ایک بڑی رقم ماہانہ بطور وظیفہ دیتے تھے۔ یہ وظیفہ ان کو ساری زندگی ملتا رہا۔ آخر عمر میں خاکسار تحریک اور مسلم لیگ کے حامی ہو گئے تھے۔ لیکن تقاضائے عمر کی وجہ سے ان میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ پاکستان بنتے ہی کراچی اپنے بچوں کے ساتھ چلے گئے اور وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔

قرآن پران کو بڑا عبور تھا، اس کی آیتیں ضرب المثل کے طور پر استعمال کرتے۔ اس طرح کی نسبت قرآن سے میں نے کسی اور شخص میں نہیں پائی۔ نماز باجماعت کے اور تہجد کے پابند تھے۔ آخر دور میں ہر وقت قرآن تلاوت کرتے رہتے تھے۔ خوبصورت چہرے پر بڑی گول داڑھی بہت زیب دیتی تھی جس کا مقابلہ سر سید اور شیخ سنوسی کی داڑھی سے کیا جا سکتا ہے۔

علامہ شبلی اور سید مولانا سلیمان ندوی سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اس کا علم مجھ کو اس

وقت سواجب سید صاحب بھوپال میں مقیم تھے۔ انہوں نے میرے ایک بیان کی تصدیق کے سلسلہ میں شمس العلمار کو خط لکھا تھا۔ مولانا رضوان الدین صاحب نائب قاضی ریاست بھوپال نے کہا کہ اس کی تصدیق کون کرے گا کہ جواب ان کا ہی ہے۔ سید صاحب بولے "ان سے اس کثرت سے خط وکتابت ہوتی رہی ہے کہ ان کے خط کے بارے میں مجھ کو کوئی مغالطہ نہیں دے سکتا" شمس العلمار نے جو جواب دیا تھا وہ میں نے دیکھا تھا۔ خط کا مضمون اسی طرح کا تھا جس طرح ایک بڑا اپنے بہت ہی زیادہ عزیز کو لکھتا ہے۔ شمس العلماء نے جواب دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے لڑکے سید محمد بیرسٹر کو بھوپال اس غرض سے بھیجا کہ وہ اس بات کی تصدیق کر دیں کہ یہ خط شمس العلمار کا ہے:

۳۵ء کے دستور کے تحت جو انتخابات ہوئے اس سے پہلے تک ہم لوگوں سے بہت قریبی تعلقات رہے، ہمارے یہاں کے ہر کام میں دخیل رہے، ہمارے یہاں سے ایک ہفتہ خط نہ جاتا تو ان کی خادمہ دریافت خیریت کے لئے آجاتی (وہ پٹنہ میں رہتے تھے اور ہم مع والدین گیا میں) میری بہن کی منسوب انھوں ہی نے طے کی تھی۔ اور نکاح بھی انھوں ہی نے پڑھایا تھا۔ اصل میں مولوی عبدالغنی صاحب ساکن استھاواں ضلع پٹنہ نظام حیدر آباد کے استاد تھے اور شمس العلمار کے دوست تھے۔ عبدالغنی صاحب کے بڑے لڑکے محی الدین صاحب حیدر آباد میں معتمد تعلیمات تھے اور ان کے چھوٹے لڑکے تقی الدین صاحب آزادی کے زمانہ میں حیدر آباد کے وزیر ہو گئے تھے۔ محی الدین صاحب کے ایک سالہ عبدالصمد صاحب مرحوم تھے جن سے میری بہن کا عقد ہوا تھا۔ اور یہ رشتہ اسی تعلق کی وجہ سے ہوا تھا جو عبدالغنی صاحب اور شمس العلمار کے درمیان تھا۔

انتخابات ہوئے تو ہمارا پورا خاندان مولانا سجاد صاحبؒ کے ساتھ تھا جن کی سے انڈی پنڈنٹ پارٹی تھی اور شمس العلمار مسٹر عزیز کے ساتھ تھے جن کی یونائیٹڈ پارٹی تھی شمس العلمار کے صاحبزادے سید محمد بیرسٹر یونائیٹڈ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے ہمارے خاندان والوں نے ان کی مخالفت کی اور وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کا شمس العلمار پر بہت اثر پڑا اور تعلقات میں کمی پیدا ہو گئی۔ والد کو انھوں نے خط لکھا کہ میں نے کیا قصور کیا ہے

کہ تقی مرحوم (راقم الحروف کے نانا) کی تمام اولاد میرے خلاف ہے۔ پھر بھی وہ والد مرحوم سے خوش رہے۔ والد کا انتقال ہوا تو انھوں نے ایک ملاقات کے موقع پر مجھ کو کہا کہ آدمی ہو تو ایسا ہو، ساری عمر انھوں نے اسی طرح گزاری ہے کہ کسی کو ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

ان کے منجھلے لڑکے مسٹر محمود مرحوم کی شادی ہو رہی تھی ہم سب ان کے یہاں مہمان بن کر گئے، ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب فردوسی جو میرے بڑے ماموں کے داماد تھے اور پٹنہ ہی میں رہتے تھے ملنے کے لئے آئے۔ والد نے شمس العلما سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں رات ڈاکٹر صاحب کے یہاں گذاروں، شمس العلما نے اجازت تو دے دی لیکن ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ تم پر مجھ کو رشک آتا ہے۔ میرا مہمان وہ بھی ان کے جیسا مہمان مجھ کو چھوڑ کر تمہارے یہاں رہنا چاہتا ہے۔

قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کی بہت تاکید کرتے تھے۔ ان کی تاکید پر ہی والد نے مجھ کو بالکل ابتدا سے قرآن مع ترجمہ پڑھایا اور خود مجھ کو ہر وقت ملاقات میں قرآن مع ترجمہ پڑھنے کی اتنی تاکید کی میں عادتاً قرآن مع ترجمہ پڑھنے لگا۔ قرآن اصل میں کتاب ہدایت ہے اور اس سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اسے سمجھ کر پڑھا جائے اور اسمیں غور وفکر کی عادت ڈالی جائے۔

شمس العلما ندوہ کے بڑے حامی تھے ان کے بھلنجے اور میرے ماموں ڈاکٹر زین العابدین صاحب ندوہ تعلیم کے لئے ان ہی کی رائے پر بھیجے گئے تھے۔

ان کا اصل ذوق تو مذہبی تھا، شاعری سے دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ شکوۂ اقبال کے جواب میں انھوں نے بھی طبع آزمائی کی، ان کا جواب شکوہ شاعری کے لحاظ سے ہی بلند نہیں ہے، بلکہ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر مصرعہ قرآن کی کسی نہ کسی آیت کا ترجمہ ہے۔ اور انھوں نے ہر جگہ ان آیتوں کے حوالے بھی دے دیئے ہیں۔

ہندوستان میں شاید یہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے میلاد ناموں کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ علما رجانتے ہیں کہ میلاد کی کتابوں میں موضوع حدیثیں بھری ہوئی ہیں، جن کے بارے میں ان کے پیر کے پیر مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ فرماتے تھے کہ ان کے پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے ایک میلاد کی کتاب لکھی ہے، لیکن انھوں نے بھی ان موضوع واقعات کے اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی۔ شمس العلما رنے اپنی کتاب میں تمام موضوعات کو نکال دیا

اور ان کی جگہ یہ بتایا کہ ایک مسلمان کا عقیدہ کیا ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلعم نے دی۔ انھوں نے جابجا حمد و نعت میں اپنے ہی اشعار قلم بند کئے ہیں۔ یہ کتاب امیر شریعت ثالث مولانا شاہ قمر الدین رحمہ کو اتنی پسند تھی کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ جو لوگ دفتر امارت شرعیہ سے میلاد کی کتاب کے بارے میں دریافت کریں ان کو حافظ محب الحق صاحب کی کتاب کا نام لکھ دو۔ میں نے جواب دیا کہ وہ کتاب تو اب ملتی نہیں ہے۔ ان کے ورثا بھی اب پاکستان میں ہیں کہیئے تو میں دوسری کتاب لکھ دوں۔ امیر شریعت نے مجھ کو اس کی اجازت دی، میں نے میلاد کی کتاب لکھی جسے انھوں نے پڑھ کر پسند کیا۔ اس کتاب میں میں نے شمس العلماء کی کتاب سے استفادہ کیا تھا

میری کتاب سے پہلے مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کی کتاب "میلاد خیر البریۃ" شائع ہو چکی تھی۔ یہ کتاب بہت اچھی ہے لیکن اس کی زبان بہت اونچی ہے، ہمارے دیہات کے عام مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ میں نے اپنی زبان بہت معمولی رکھی ہے۔ میری کتاب شائع ہوئی تو مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے اخبار "صدق" میں یہ تبصرہ شائع ہوا "نئے رقم کا میلاد نامہ صحیح حدیثوں اور کام کی باتوں کا مجموعہ" میں نے یہ کتاب مولانا عبد الخیر صاحب امیر جماعت اہل حدیث بہار اور ملک العلماء مولانا ظفیر الدین صاحب سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور خلیفہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اور دونوں ہی نے اس کتاب کو پسند کیا تھا۔ مسلمانوں کا مزاج موضوع احادیث کی وجہ سے غیر حقیقت پسند اور توہم پسند بن گیا ہے۔ آج بھی وہ کتابیں بہت مقبول ہیں جن میں موضوع احادیث کے ذریعہ توہم پرستی کو فروغ دیا جاتا ہے۔

شمس العلماء اپنی مجلس میں ملت کی خرابیوں کی نشاندہی بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی مجلسیں عالمانہ ہوتی تھیں جن میں بیٹھنے والوں کو فائدہ ہوتا تھا۔

پاکستان بنا تو انھوں نے راقم کی والدہ اور ان کی وساطت سے ہم سب پر زور دیا کہ ہم سب پاکستان چلیں، لیکن ہم نہ اہل قرآن تھے، نہ خاکسار، نہ مسلم لیگی، نہ پاکستان کی افادیت پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ہم سب سے چھوٹ گئے اور ہم ہندوستان میں رہ گئے

لیکن ان کی یاد باقی ہے۔ اور ان کا احترام دل کی انتہائی گہرائیوں میں موجود ہے۔

ان کے لڑکے سید محمد بیرسٹر مرحوم نے ایک خبر رساں ایجنسی "اورینٹ پریس" (ORIENT-PRESS) کے نام سے قائم کی تھی اور اس پر بہت محنت بھی کی تھی۔ لیکن جب وہ پاکستان گئے تو دھیرے دھیرے یہ ایجنسی ختم ہوگئی۔ جو قوم صرف نعروں میں پلی وہ کوئی تعمیری کام کہاں کرسکتی تھی۔

مولانا عبداللہ الکافی

مولانا عبداللہ الکافی مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کے ابتدائی دور میں ان کے سکریٹری تھے۔ بنگلہ کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ انگریزی بھی اچھی جانتے تھے، ان کی الماری میں جدید عربی کی مصری مطبوعات کا اچھا ذخیرہ میری نظروں سے گزرا تھا۔ دیناج پور کے رہنے والے تھے۔ بنگال میں اہل حدیث جماعت کے امیر عبداللہ الباقی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آزادی کی تحریک میں جیل جا چکے تھے۔ ابتدا میں جمعیۃ علماء ہند کی شاخ کے روح رواں تھے۔ لیکن صوفی ابوبکرؒ سجادہ نشین پھر پھرا شریف نے جمعیۃ العلماء بنگال بنالی اور اپنے یہاں اس کا دفتر قائم کرلیا تو یہ جمعیت سے بے تعلق ہوگئے۔

اصل میں صوفی ابوبکر کا بنگال میں بہت اثر تھا۔ مولانا عبداللہ الکافی کی شکایت پر مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلمائے ہند پھر پھرا شریف گئے تاکہ صوفی صاحب کو سمجھائیں، لیکن وہاں عرس کا موقع تھا، لاکھوں مسلمان جمع تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے سوچا کہ اتنی بڑی طاقت کو چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے چنانچہ انھوں نے مولانا عبداللہ الکافی اور ان کے رفقاء کو کہا کہ آپ حضرات صوفی ابوبکر صاحب کے ساتھ مل کر کام کریں۔ صوفی صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ میں خود ان سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن وہ سیاسی لائن کے آدمی نہ تھے۔ سیاست میں خواہ مخواہ کے لئے دخل دیتے تھے۔ وہ صرف صوفی تھے اور مولانا عبداللہ الکافی اہل حدیث دونوں ایک جگہ جمع نہ ہوسکے۔ مولانا اور ان کے رفقاء نے جمعیت کو چھوڑ دیا اور پھر کبھی جمعیت میں نہ آئے لیکن بنگال کے باہر کے جمعیۃ العلماء کے کارکنوں سے ملتے تھے اور ان سے خلوص رکھتے تھے۔ کلکتہ آتے تو پرجا پارٹی کے دفتر میں ٹھہرتے تھے۔ میرے یہاں بھی ضرور آتے اور سیاسی و مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے۔

مولانا سجاد صاحب کے انتقال پر میں نے کلکتہ کی مختلف مساجد میں ختم قرآن کا نظم کیا تھا، میں خود حافظ جمال الدین کی مسجد میں تھا۔ جس کو کسی زمانہ میں کلکتہ کی جامع مسجد کا درجہ حاصل تھا۔ دیکھا کہ

مولانا عبداللہ الکافی وہاں پہنچے۔ میں نے ان کا استقبال کیا اور پوچھا آپ کیسے آگئے، آپ تو اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں؟ مولانا نے کہا کہ مولانا سجاد صاحب سے جو خلوص تھا اس بنا پر آگیا ہوں ہم قرآن پڑھنے کی مخالفت نہیں کرتے ہیں۔ گرچہ ہمارے عقیدہ میں اس سے مردوں کو ثواب نہیں ملتا، لیکن جو پڑھے گا اس کو تو ثواب ضرور ملے گا۔

ایک روز ہمارے دوست معزالدین صاحب نے ان سے کہا کہ میں مولانا آزاد کے یہاں جاتا ہوں تو کبھی ان کو سالم کپڑوں میں نہیں پاتا کسی نہ کسی جگہ سے پھٹا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف باہر نکلنے کے لئے مولانا اہتمام کرتے ہیں۔ مولانا عبداللہ الکافی نے جواب دیا کہ کپڑے ہی نہیں، کھانا بھی ان کا بہت معمولی ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ چکنے کھانے کا عادی ہوں۔ مولانا کے یہاں کام کرتا تھا وہ کھانے پر ہوتے اور مجھ کو بلاتے تو ان کا کھانا دیکھ کر ہمیشہ معذرت کر دیتا تھا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا کافی نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا آزاد قبل از وقت پیدا ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بعد از وقت پیدا ہوئے۔ ان کے رہنے سہنے اور بات کرنے کا طریقہ بالکل مغلیہ عہد کا ہے۔ وہ ناگوار باتوں کے متحمل نہیں، اس سے بچتے اور بھاگتے ہیں۔ یہ زمانہ مزدوروں کا ہے، دھکے دینے اور دھکے کھانے کا ہے۔ اور مولانا سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مخالفوں سے مقابلہ کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ یہی بات جواہر لال نے بھی لکھی ہے کہ مولانا آزاد دھکا کھانے والے اور دھکا دینے والے آدمی نہیں۔

میں جب کلکتہ چھوڑ کر بھوپال چلا گیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے قومی مسائل پر گفتگو رہی میں نے ایک دفعہ مولانا کو لکھا کہ صوفی ابوبکر اچھے آدمی ہیں، کوئی فعال آدمی ہوتا تو ان کے اثر کو استعمال کرتا اور جمعیت کو بنگال میں مقبول بناتا، لیکن کوئی فعال آدمی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اور نہ اس کی امید ہے کہ ان کے ساتھ کوئی فعال آدمی ہو۔ اس لئے ان سے جمعیت کو علیحدہ کر کے مولانا عبداللہ الکافی کے حوالہ کیا جائے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مجھ کو جواب دیا کہ آپ کی رائے ٹھیک ہے۔ آپ ان کو لکھیں اگر وہ راضی ہوں تو میں کوشش کروں گا" میں نے مولانا عبداللہ الکافی کو لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اب اس کا وقت نہیں رہا۔ اصل میں آزادی کا زمانہ بالکل قریب آگیا تھا۔ راجگوپال چاری پاکستان کی حمایت کرنے لگے تھے۔ بنگال کے نیشنلسٹ مسلمانوں نے سوچا کہ اب پاکستان بنا ہی چاہتا ہے اور اگر پاکستان بن گیا اور وہ مسلم لیگ سے علیحدہ رہے تو پاکستان میں کام کرنا

موقع نہیں رہے گا کیونکہ ان میں اکثر مشرقی پاکستان کے رہنے والے تھے، چنانچہ عبداللہ الکافی اپنے ساتھیوں سمیت مسلم لیگ میں شریک ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بہت بعد تک وہ زندہ رہے اور اس کے لیے اسلامی دستور کا خاکہ بنانے کی کوشش کرتے رہے، کامیاب نہ ہوئے یہانتک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

ایک دفعہ مولانا عبداللہ الکافی میرے ساتھ مولانا عبدالرؤف دانا پوری کے یہاں گئے تھے ہیں نے تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ان کے بڑے بھائی بنگال کے اہل حدیث حضرات کے پیر ہیں، اس لفظ "پیر" پر مولانا عبدالرؤف صاحب نے دریافت کیا کہ کیا آپ حضرات کے یہاں بیعت وارشاد کا طریقہ ہے؟ مولانا عبداللہ الکافی نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ ہم صرف کتاب وسنّت کی پیروی اور بدعات سے بچنے کا عہد لیتے ہیں۔

مولانا منیر الزماں اسلام آبادی

چاٹگام کو اسلام آباد کہتے تھے۔ مولانا منیر الزماں اسلام آبادی چاٹگام کے رہنے والے تھے۔ دینی تعلیم غالباً بنگال ہی میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد علمائے بنگال کی بنیاد رکھی۔ علماء کو مجتمع اور منظم کرنے کی ندوۃ العلماء کے بعد ہندوستان میں یہ دوسری کوشش تھی۔ ندوہ کا مقصد علمی اور انجمن علماء کا مقصد تبلیغی تھا اس کے بعد مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم نے جمعیۃ علماء بہار کی بنیاد رکھی۔ پھر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ کی تحریک پر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اپنے یہاں علماء کا خصوصی اجلاس بلایا۔ اور جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد پڑی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صدر اور مولانا احمد سعید ناظم مقرر ہوئے۔ جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیاں زیادہ تر ہندوستان سے برطانوی استعمار کے خاتمے کے لئے رہیں۔

مولانا منیر الزماں اسلام آبادی نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا اور اس راہ کی وادی پرخار سے گزرتے رہے۔ جب شمس الدین احمد نے پرجا پارٹی کی بنیاد رکھی تو بنگال کے تمام نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح یہ بھی پرجا پارٹی میں شریک ہو گئے، لیکن کانگریس سے تعلق نہیں توڑا۔ کانگریس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور ہندو بنگال میں جاگیردار اور زمین دار تھے مسلمان کاشتکار تھے اس لئے کانگریس کاشتکاروں کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ پرجا پارٹی کے قیام کی تھی۔ تمام نیشنلسٹ مسلمان کانگریس کے ساتھ ساتھ کہ وہ آزادی کے لئے متحد محاذ تھا، پرجا پارٹی کو بھی اپنا پلیٹ فارم بنائے ہوئے تھے۔

۱۹۳۵ء کے دستور کے مطابق جب انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں تو میں ان دنوں کلکتہ میں تھا۔ تین بڑی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں۔ پرجا پارٹی، کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ۔ پرجا پارٹی اور کانگریس میں تعاون تھا۔ میری ہمدردیاں پرجا پارٹی کے ساتھ تھیں۔ اس کے صدر مولانا عبداللہ الباقی تھے جو بنگال کے اہل حدیث جماعت کے امیر تھے۔

اور لیڈر فضل حق تھے۔

میری ملاقات مولانا منیر الزماں سے اسی زمانہ میں ہوئی۔ اکثر ملاقات ہوتی رہی کبر سنی کے باوجود ان کی ہمت اور محنت دیکھ کر مجھ کو رشک آتا تھا۔ مولانا کا بہت زیادہ ساتھ اس وقت رہا جب ہم جمعیۃ علماء بنگال کا اجلاس کر رہے تھے۔ اور اس کی صدارت کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کو بلا رہے تھے جو ابھی دنوں جلا وطنی سے واپس آئے تھے۔ ہم دونوں کلکتہ اور نواح کلکتہ کا ایک ساتھ گشت کرتے، صبح سے آدھی رات تک مارے پھرتے اور میں دیکھتا کہ مولانا کو آرام کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، صرف دوپہر کو کھانا کھا کر ایک گھنٹہ آرام کرتے، کہتے "دوپہر کو کھا کر میں فوراً کام نہیں کر سکتا ہوں، باقی دن رات کام لو میں بھاگنے والا نہیں" ایک دن دوپہر کو مجھے اپنے یہاں لے گئے، لیکن میرے لئے کھانا ہوٹل سے منگایا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمارا کھانا تم سے کھایا نہیں جائیگا۔ ہم تو چاول اور مچھلی ایک ساتھ جوش دیتے ہیں اور پھر ان کو مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔

کلکتہ میں ہر زبان کے لوگ کثیر تعداد میں رہتے ہیں، جہاں اردو اور انگریزی کی ضرورت ہوتی ایسی جگہ مولانا مجھ سے کام لیتے، جہاں بنگلہ زبان سے کام چلتا وہ خود آگے بڑھتے۔

ہم نے جھنڈا لہرانے کی رسم بھی ادا کی تھی۔ مولانا منیر الزماں اسلام آبادی نے جھنڈا لہرایا تھا۔ جھنڈے کو سلام کرنے کو منع کر دیا گیا تھا، کہ اسلامی آداب کے خلاف ہے۔ اس میں شرک کی بو آتی ہے۔ مولانا نے جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا کا جسم بوڑھا ہے لیکن ہمت جوان ہے۔ کیا زمانہ تھا انگریزوں کو نکالنے کے لئے، بوڑھے جوان اور بچے اپنے کو کھوئے ہوئے تھے، بس ایک دھن تھی کہ کس طرح انگریز نکلیں۔

مسلم لیگ نے ارادہ کر لیا تھا کہ کسی طرح جمعیۃ علماء کا اجلاس نہ ہونے دیں گے، مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ اجلاس ہوا تو پہلے کچھ مسلم لیگی اندر گھس کر شور مچانے لگے۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ آف پولس نے اعلان کر دیا کہ میں اس اجلاس کو خلاف قانون قرار دیتا ہوں۔ اس موقع پر ہم سب جیل جانے کو تیار تھے، لیکن رائے ہوئی کہ شام کو ہم اکٹھے ہو کر مشورہ کر لیں، پھر دوسرے روز جمع ہوں اگر یہی صورت پیش آئے تو زبردستی جلسہ کریں اور

جیل چلے جائیں۔

شام کو حاجی اللہ بخش پشاوری مرحوم کے یہاں ہم جمع ہوئے، مولانا کی ہمت نے جواب دے دیا تھا کہنے لگے مسلم لیگ جلسہ نہیں ہونے دے گی۔ اس لئے کوشش بیکار ہے، میں نے کہا جلسہ ضرور کیا جائے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور اشرف الدین چودھری جنرل سکریٹری بنگال کانگریس نے میری تائید کی اور یہ طے پایا کہ جلسہ ہو، پرانے ٹکٹ منسوخ کردیئے جائیں۔ نئے ٹکٹ تیار کرنے اور تقسیم کرنے کا کام میرے ذمہ ہوا۔ چنانچہ دوسرے روز ہنگامہ کرنے والے اندر نہیں داخل ہوسکے اور پولیس کو مداخلت کا موقع نہیں ملا۔ جلسہ خوب کامیاب رہا۔ اجلاس کے بعد مولانا منیر الزماں نے مجھ کو گلے لگالیا اور کہا کہ بوڑھے اور جوان میں فرق ہونا ہی چاہیئے

مولانا سے آخری ملاقات پٹنہ میں ہوئی۔ خدابخش لائبریری کسی علمی تحقیق کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے۔ دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف جاکر انھوں نے میرا پتہ معلوم کیا اور پھر میرے یہاں تشریف لائے۔ دن بھر رہے شام کو چلے گئے۔ میں نے پوچھا آپ پاکستان نہیں گئے؟ بولے میں اپنی عادت سے باز نہ آتا اور پاکستان والے یہ برداشت نہ کرتے اور مجھ کو مار ڈالتے، اس لئے پاکستان نہیں گیا۔ کام تو ہو ہی گیا یعنی انگریز چلے گئے۔ اب جس طرح چاہیں سب حکومت چلائیں، مجھ کو اس میں کیا کرنا ہے۔ برابر ہے پاکستان میں رہوں یا ہندوستان میں۔

ملک العلماء مولانا ظفر الدین رح

ملک العلماء مولانا ظفر الدین پٹنہ ضلع کے رہنے والے، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے شاگرد اور مرید اور خلیفہ اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے قدیم اساتذہ میں تھے۔ اور آخر میں کچھ دنوں تک پرنسپل بھی رہے تھے۔ تفسیر و حدیث و فقہ و منطق و فلسفہ خصوصاً قدیم علم ہیئت میں گہری نظر تھی۔ بلکہ علم ہیئت میں اپنے دور میں اپنی مثال آپ تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے اور بہت عمدہ مناظرہ کرنے والے اور خطیب تھے۔ اختلافی مسئلہ اگر کوئی نہ چھیڑے تو بہت اچھی گفتگو کرتے تھے۔ اختلافی مسئلہ چھیڑنے پر ان کو غیرت آجاتی تھی اور اپنے مسلک کی حمایت میں بولنے لگتے۔ پٹنہ کی مختلف مساجد میں قرآن کا بہت اچھا درس دیتے تھے۔

ایک بار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پٹنہ تشریف لائے جمعیۃ علماء بہار کے دفتر میں تھے کہ ہم ان کے ساتھ قریب کی مسجد میں نماز مغرب کے لئے آگئے۔ اعلان ہوا کہ بعد نماز مولانا ظفر الدین صاحب درس قرآن دیں گے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مجھ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے بتایا کہ تو کہنے لگے میں ذرا سنوں گا، کسی کو میرے بارے میں بتایئے نہیں۔ چنانچہ بعد نماز مولانا ایک گوشہ میں تھوڑی دیر بیٹھے اس کے بعد واپس ہوئے راستہ میں کہنے لگے کہ تفسیر تو بہت عمدہ تھی کوئی اختلاف کی بات بھی نہیں کی۔

میرا مکان چونکہ مولانا ظفر الدینؒ کے مکان سے بہت قریب تھا اس لئے اکثر میرے پاس آجاتے تھے، اور دلچسپ باتیں کرتے تھے کہتے تھے میں دو وجہ سے آپ سے محبت کرتے ہوں۔ ایک حسن خلق کی وجہ سے۔ مولانا سجادؒ کی یہ خصوصیت آپ میں پاتا ہوں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ آپ میرے مرشد سید شاہ ایوب صاحب کے بھانجی داماد ہیں۔"
میں نے ایک دفعہ ان سے کہا کہ اصول فقہ کتاب میرے لڑکے محسن کو پڑھا دیجئے

اس کو مدرسہ عالیہ کلکتہ سے عالم کا امتحان دینا ہے۔ انھوں نے کہا بھیج دیجیے۔ میں نے دریافت کیا آپ کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟ فرصت تو ہے؟ انھوں نے جواب دیا فرصت تو نہیں ہے لیکن یہ سب کتابیں اتنی بار پڑھا چکا ہوں کہ ان کے لئے کسی محنت اور مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے بہت محبت سے محسن کو وہ کتاب پڑھائی، مدرسہ عالیہ کے امتحان کے بعد محسن دارالعلوم دیوبند چلے گئے، انھوں نے سنا تو مجھ سے کہا کہ "دیوبند عام تعلیم گاہوں کی طرح ایک تعلیم گاہ ہے۔ وہاں پڑھے اور اکابر دیوبند کو حرف آخر نہ مان کر کتاب و سنت کو معیار حق مانئے تو بھٹکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اختلاف وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں لوگ کتاب و سنت کی جگہ اپنے بزرگوں کو معیار حق مان لیتے ہیں اور اس غرض سے کتاب و سنت کے غلط معنی پہنانے لگتے ہیں" بہت سے اداروں میں برائی اکابر پرستی میں غلو کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک روز انھوں نے اپنا ایک قصہ سنایا، کہنے لگے "میں بریلی میں پڑھتا تھا۔ وہاں سے قریب ایک حکیم صاحب تھے جو مولانا اشرف علی صاحب کے مرید تھے۔ میری وہاں ٹیوشن تھی۔ کسی نے حکیم صاحب کو کہہ دیا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کا یہ شاگرد ہے اور تم سب کو کافر کہتا ہے۔ حکیم صاحب نے مجھ سے پوچھا "تم مولانا اشرف علی صاحب کو کافر کہتے ہو"؟ میں نے جواب دیا "نہیں تو"! انھوں نے پھر پوچھا "تمہارے استادان کو کافر کہتے ہیں"؟ میں نے جواب دیا ہاں، "وہ مولانا اشرف علی صاحب کو کافر کہتے ہیں اور وہی نہیں بہت سے علماء عرب و عجم ان کو کافر کہتے ہیں اور میرے خیال میں مولانا اشرف علی صاحب خود اپنے کو کافر سمجھتے ہیں" حکیم صاحب نے کہا "یہ کیا بولتے ہو، مولانا اشرف علی صاحب اپنے کو کافر سمجھتے ہیں"؟ میں نے کہا سنئے "مولانا اشرف علی صاحب کی عادت ہے کہ جب کوئی غلط مضمون وہ دیکھتے ہیں تو اس کی اصلاح میں ایک رسالہ لکھ دیتے ہیں۔ جیسے اصلاح ترجمہ نذیر احمد وغیرہ۔ اگر وہ اپنے اوپر فتویٰ کو غلط سمجھتے تو اس کی اصلاح میں بھی کوئی رسالہ لکھ دیتے"۔ حکیم صاحب نے کہا "انھوں نے حلم سے کام لیا" میں نے فوراً جواب دیا "آپ ان کے مرید ہیں آپ بھی حلم سے کام لیجیے"۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے کہا میں اتنے دنوں سے آپ

کے یہاں آتا ہوں۔ آپ مریضوں کو دیکھتے ہیں، میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ آپ نبض اس طرح کیوں دیکھتے ہیں، اس طرح دیکھئے۔ قارورا اس طرح کیوں پکڑتے ہیں۔ اس طرح پکڑتے۔ میں نے اس لئے آپ کو نہیں ٹوکا کہ آپ حکیم ہیں۔ یہ میرا شغل نہیں ہے۔ اسی طرح یہ فتوے وغیرہ ہم مولویوں کی چیز ہے۔ آپ اس میں نہ پڑیئے اسے ہم مولویوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔

مولانا ظفر الدین صاحب نے صحیح البخاری کے انداز میں صحیح البہاری کے نام سے حدیثوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع کیا تھا۔ جو ان کے قول کے مطابق حنفیوں کی تائید میں ہے۔ انھوں نے یہ کتاب مجھ کو عنایت کی تھی۔ اور جو میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ موصوف خلافت تحریک کے بھی خلاف تھے۔ اس پر بھی انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ بھی مجھ کو دی تھی۔ یہ کتاب بھی میری لائبریری میں موجود ہے۔ خاکسار تحریک جب ہندوستان میں مقبول ہو رہی تھی اور عنایت اللہ مشرقی صاحب نے لکھا کہ مسلمانوں کا سمت قبلہ ہندوستان میں علم ہیئت کی رو سے غلط ہے، تو مولانا ظفر الدین صاحب نے اس کا مفصل اور معقول جواب دیا تھا، جسے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے "معارف" میں تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی علم ہیئت پر کتنی گہری نظر تھی۔

ان کی مدرسہ شمس الہدیٰ میں پرنسپلی کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ انٹرویو لینے کے لئے بلائے گئے تو سید صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اختلاف مسلک کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔ مولانا ظفر الدین صاحب نے مولانا اسہول صاحب دیوبندی اور مولانا عبید اللہ صاحب المجری کے ساتھ مدتوں اس مدرسہ میں پڑھایا ہے۔ اور وہ ذی علم بھی ہیں اس لئے ان کا حق ہے۔ چنانچہ سید صاحب تشریف لائے تو انھوں نے انٹرویو کے بعد اول ترجیح مولانا ظفر الدین صاحب کو دی اور دوسری مولانا ریاست علی صاحب ندوی کو لیکن حکومت کے ارباب حل وعقد نہیں چاہتے تھے کہ مولانا ظفر الدین صاحب ہوں اس لئے دوبارہ درخواستوں کے لئے اعلان کیا گیا اور دوسری بار انٹرویو کے لئے مولانا

ظفرالدین صاحب کو طلب نہیں کیا گیا۔ مشہور مجاہد آزادی مولانا نورالدین بہاری بھی اس معاملہ میں سید سلیمان ندویؒ کے ہم خیال تھے۔

ایک بار اپنے لڑکے کے بارے میں کہنے لگے کہ میں نے جو چاہا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے زیادہ دیا۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ وہ مولوی ہو جائے لیکن اللہ نے اس کو مولوی بھی بنایا، ایم اے بھی بنایا یورپ بھی بھیجا پی ایچ ڈی کیا اور مسلمانوں کی مشہور یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر بھی بنایا۔ آج وہ خدا کے فضل سے شعبۂ عربی کے صدر ہیں اور عربی مخطوطات اور غالبیات اور تحقیق کی دنیا میں ان کا نام معروف ہو چکا ہے۔

مولانا ظفرالدین صاحب ہمارے محلہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے اور خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ خطبہ میں کوئی بات اختلاف کی میں نہیں پاتا تھا۔ مسجد میں لوگ "قد قامت الصلوٰۃ" پر اٹھتے تھے۔ ایک روز میرے دوست مولانا عبدالغنی صاحب آ گئے، یہ تھے تو ان کے شاگرد، مدرسہ شمس الہدیٰ کے پڑھے ہوئے لیکن مسلکاً دیوبندی تھے۔ مولانا سہول صاحب وغیرہ کا اثر زیادہ تھا، مولانا ظفرالدین صاحب بیٹھے ہوئے تھے دونوں میں اس پر بحث ہو گئی کہ قد قامت الصلوٰۃ پر اٹھنا چاہیئے یا نہیں۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ قد قامت الصلوٰۃ پر اٹھنا ٹھیک ہی ہے، لیکن ضروری تو نہیں جس کے لیے لڑائی کی جائے۔ مولانا نے دریافت کیا کون لڑائی کرتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے مسجد میں کئی بار دیکھا ہے کہ لوگ شروع تکبیر میں کھڑے ہونے والوں کو بامرار بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، مولانا نے کہا یہ جاہل کرتے ہوں گے لیکن شاید مسجد میں مولانا نے اپنے ماننے والوں کو منع کیا کہ سختی نہ کی جائے، کیونکہ اس کے بعد میں نے اس مسجد میں کسی کو بٹھاتے نہیں دیکھا۔

ایک روز ایک صاحب نے مولانا ظفرالدین صاحب کو کہا کہ "میرے یہاں میلاد ہے تشریف لائیے گا، لیکن قیام نہیں ہوگا، مولانا نے قیام نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ مولانا عبدالخبیر صاحب کو بھی دعوت دی ہے۔ اور وہ قیام پسند نہیں کرتے۔ قیام کوئی ضروری چیز تو ہے نہیں۔"

مولانا ظفرالدین صاحب نے کہا کہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے تو ہونا یہ چاہیئے کہ

میں میلاد پڑھوں اور قیام نہ کروں اور مولانا عبدالخبیر صاحب میلاد پڑھیں اور قیام کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قیام نہ واجب ہے نہ حرام ۔ اس پر مجھ کو ایک واقعہ یاد آ گیا جو مولانا ریاض احمد صاحب نے مجھے سنایا تھا اور وہ واقعہ میں نے مولانا ظفرالدین صاحب کو بھی سنایا ، اور وہ یہ ہے کہ مولانا شاہ محی الدینؒ امیر شریعت ثانی سجادگی سے پہلے چمپارن اپنے کسی مرید کے یہاں گئے تھے ۔ مرید نے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میلاد کی مجلس رکھی تھی ۔ مولانا ریاض احمد صاحب امیر شریعت کے ساتھ تھے ۔ امیر شریعت نے اعلان کیا کہ چونکہ ان کے ساتھ بعض ایسے علماء ہیں جو قیام کو پسند نہیں کرتے اس لئے ان کے احترام میں اس میلاد کی مجلس میں قیام نہیں ہوگا ، چنانچہ انھوں نے قیام نہیں کیا ۔

مولانا ظفرالدین صاحب نے عیسائیت کے رد میں ایک روز بہت اچھی تقریر کی تھی ۔ افسوس میں اس کو یاد نہیں رکھ سکا ۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عیسائیت کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت اچھا تھا ۔

امارت شرعیہ کے بارے میں جب بھی مولانا سے گفتگو ہوئی میں نے محسوس کیا کہ مولانا اس کو خوب اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور انھوں نے سمجھ کر امارت کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا ۔

میں نے اپنی میلاد کی کتاب ، مولانا کو دی ، کچھ عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ " آپ کی میلاد کی کتاب بہت اچھی ہے میں اپنے یہاں بچی کو یہ کتاب پڑھا رہا ہوں "

ایک روز اپنے ہی مسلک کے مشہور بریلوی عالم مولانا حشمت علی کی مذمت کرنے لگے کہ وہ خواہ مخواہ ہر جگہ لڑائی چھیڑتے رہتے ہیں ۔ میں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب کے مسلک کا حامی ہوں ۔ ان کی ایک ایک رائے کی حمایت میں دلیل بھی رکھتا ہوں ۔ لیکن خواہ مخواہ کے لئے لوگوں سے لڑائی نہیں کرتا پھرتا ان کی اس بات سے ان کی رواداری اور شریفانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

ایک روز ہمارے دوست مولوی شمس الضحیٰ سے گفتگو میں سخت برہم ہوئے ۔ شمس الضحیٰ صاحب نے کہا تھا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں اور اس طرح گفتگو کرتے

ہیں مولانا بولے میں ذات کا ملک ہوں، سید نہیں ہوں۔ پڑھا پٹھان سے روٹی کھائی پٹھان کی، مرید ہوا پٹھان سے اس لئے اختلاف کی بات اگر چھیڑیئے گا تو مجھ سے نرم نرم گفتگو کی توقع نہ رکھیئے۔ مولانا کا یہ انکسار مجھ کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ مولانا نے اپنی برہمی مزاج کی خود ہی تاویل کرلی۔

مولانا نے ایک روز مجھ سے کہا کہ صوفی اگر اختلافی مسائل میں الجھتا ہے تو وہ صوفی نہیں ہے، اس کو تو ہر جگہ خدا کا حسن اور جلوہ نظر آتا ہے، البتہ ہم مولویوں کی مثال میونسپلٹی کے جمعدار کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہاں پر گندگی ہے۔ گندی نالیاں صاف ہوئیں یا نہیں، تاکہ مچھر مکھیوں کے پیدا ہونے کا احتمال نہ رہے۔

بہرحال پہلے زمانے کے لوگ خواہ کسی مسلک کے ہوں قابل قدر تھے اب تو لوگ صرف مسلک کی لڑائی لڑتے ہیں اندر سے کچھ نہیں ہوتے نہ علم کی گہرائی ہوتی ہے اور نہ تقویٰ اور خدا رسی۔

مولانا کا انتقال ہوا تو ہماری اہلیہ کے ماموں شاہ ایوب صاحب مرحوم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، جن سے انھوں نے آخر عمر میں ارشاد لیا تھا۔

مولانا کے ایک عزیز ھدیٰ صاحب نے جو کلکتہ میں رہتے ہیں مجھ سے کہا کہ میں نے دیکھا تھا مولانا ظفر الدین صاحب، مولانا سہول صاحب دیوبندی کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان سے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ جماعت کی اہمیت کی بنا پر ان کے پیچھے نماز پڑھ لی۔

مولانا سے نقیب، کے سیرت نمبر کے لئے ایک بار مضمون مانگا۔ مولانا نے فوراً اپنا مضمون بھیج دیا۔ مولانا عثمان غنی صاحب نے کہا اس میں چند سطریں ہیں، اگر ان کو نکال دیا جائے تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ مولانا عثمان غنی صاحب کی رائے سے وہ سطریں نکال دی گئیں اور باقی حصہ شائع کر دیا گیا۔ مولانا نے کبھی کبھی ملاقات میں مجھ سے نہیں پوچھا کہ یہ سطریں کیوں نکال دی گئیں۔

مولانا کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ بہت متعصب بریلوی تھے، لیکن میرا

اپنا تاثر اس سے مختلف ہے۔ میں نے مولانا کو اس ناچیز سے ہمیشہ خوش پایا جس کو مذہبی اختلافات سے کوئی دلچسپی نہیں، اسی طرح مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کی ہمیشہ تعریف کرتے ہوئے دیکھا جس کے تعلقات علماء دیوبند سے قوی تر تھے، یہی نہیں بلکہ وہ بالکل ابتداء میں امارت شرعیہ کی حمایت میں بیان دے چکے تھے جسکی کاپیاں اب بھی دفتر امارت شرعیہ میں شاید محفوظ ہونگی اور یہ سب کو معلوم ہے کہ امارت شرعیہ میں مختلف مسلک کے علماء کام کرتے رہے ہیں۔

مولانا سید محمد عثمان غنی رح

مولانا عثمان غنی موضع دیورہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ ان کے چچا مولانا شاہ ولایت حسین صاحب دارالعلوم دیوبند کے فارغ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے، دیندار تھے اور تفسیر و حدیث و فقہ و ادب عربی و منطق و فلسفۂ قدیم پر گہری نظر تھی۔ اپنی مجلس میں سوائے مذہبی باتوں کے کوئی دوسری قسم کی گفتگو نہیں کرنے دیتے تھے، یا فقہی مسائل پر گفتگو ہوتی یا احادیث بیان کرتے رہتے۔ تصوف میں مولانا اشرف علی رح اور مناظروں کے لئے مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی اور مولانا مرتضیٰ صاحب اصغر کے مداح تھے۔ انہی کے شوق دلانے پر مولانا عثمان غنی صاحب دیوبند بھیجے گئے مولانا سہول صاحب عثمانی سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ان دنوں دیوبند میں مدرس تھے۔ ان ہی کی نگرانی میں مولانا عثمان غنی صاحب کو رکھا گیا۔ انکے اساتذہ میں مولانا سہول صاحب کے علاوہ مولانا شائق احمد عثمانی صاحب سابق ایڈیٹر عصر جدید مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انور شاہ صاحب تھے۔ مولانا شائق احمد صاحب، مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد تھے۔ مولانا عثمان غنی کے زمانہ میں طالب علمی میں دیوبند میں انگریزی حکومت کے خلاف بہت پرجوش فضا تھی۔ چنانچہ مولانا پر اس کا اثر پڑا۔ جب فارغ ہوکر گھر آئے تو امارت شرعیہ کے لئے ایک ناظم دفتر کی ضرورت تھی۔ امارت شرعیہ کی بنیاد انھی دنوں پڑی تھی۔ بہار میں اس عہدہ کے لئے ان کے سوا کوئی دوسرا موزوں و مناسب نہ تھا۔ عالم تھے، لکھنے پڑھنے کا شوق تھا انگریزی حکومت کے مخالف تھے۔ ان لوگ اعزا صوبہ کی خلافت تحریک میں پیش پیش تھے۔ خانقاہ مجیبیہ کے لوگ بھی دوسروں کے مقابلہ میں باوجود اختلاف مسلک اُن کو زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے تھے۔

مولانا کی تاریخ اور امارت شرعیہ کی تاریخ تقریباً ایک ہے ابتدائے تاسیس سے امیر شریعت ثالث کی زندگی تک وہ امارت سے وابستہ رہے اور اس میں وہ مندرجہ ذیل حیثیتوں میں کام

کرتے رہے ۔

۱۔ بحیثیت صحافی، ۲۔ بحیثیت مفتی، ۳۔ بحیثیت ناظم دفتر امارت شرعیہ، ۴۔ بحیثیت مصنف۔

امارت کا پندرہ روزہ اخبار 'امارت' مولانا کی ادارت میں دیا گیا، چونکہ جریدہ امارت ایک خاص مقصد کے تحت جاری کیا گیا تھا اس لئے مولانا کی صحافت بھی پیشہ وارانہ نہ تھی بلکہ مقصدی تھی، مقصود اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ مولانا نے اس فریضہ کو بخوبی انجام دیا۔ اور اس کے لئے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرلیں۔ امارت شرعیہ کو مقبول بنانے کے لئے مبلغین، محصلین اور نقبا تھے، ان کے علاوہ ذمہ دار حضرات کے دورے بھی ہوتے تھے، لیکن ان سب حضرات کو قوت جریدہ 'امارت' سے ملتی تھی ۔ اور مولانا کا قلم ہی لوگوں کو امارت اور کارکنان امارت کی طرف متوجہ کرتا تھا۔

انڈی پنڈنٹ پارٹی کا قیام دراصل مولانا کی پرزور تحریروں کا نتیجہ تھا جو وہ انگریزی حکومت کے حامیوں اور کاسہ لیسوں کے خلاف لکھتے رہتے تھے، گرچہ پارٹی کے کرتا دھرتا سب کچھ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ تھے لیکن اس پارٹی میں مولانا عثمان غنیؒ کا آنا دونوں تھا کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی عدم موجودگی میں پارٹی کی صدارت کے فرائض مولانا عثمان غنی ہی انجام دیتے تھے۔ نئی نسل کو شاید نہیں معلوم کہ انڈی پنڈنٹ پارٹی کی کامیابی نے صوبۂ بہار میں حسب ذیل اثرات ڈالے تھے۔

۱۔ لوگ معترف ہو گئے تھے کہ صوبۂ بہار کی واحد بااثر جماعت مسلمانوں میں امارت شرعیہ ہے۔

۲۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ معترف ہو گئے تھے کہ علمائے دین بالخصوص مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سیاسیات سے اچھی طرح واقف اور سیاسی قیادت کی اہلیت رکھتے تھے۔

۳۔ انگریزوں کے حامی مسلمانوں کا عام مسلمانوں میں کوئی اثر نہیں ہے۔

جب حکومت نے جریدہ امارت سے ضمانت طلب کی تو امارت شرعیہ کی طرف سے بجائے امارت پندرہ روزہ نقیب کا اجرا ہوا گرچہ ادارت میں نام صغیرالحق صاحب ناصری کا تھا، لیکن امارت کے سب کارکن جانتے ہیں کہ وہ اس فن کے آدمی نہ تھے ان کی حیثیت محض ایک کلرک کی تھی ۔ ادارت کے فرائض مولانا مولانا عثمان غنی صاحب ہی انجام دیتے تھے، یہاں تک کہ اس جریدہ کی ادارت میری طرف منتقل ہوئی لیکن اس زمانہ تک جب کہ وہ امارت سے وابستہ رہے پندرہ روزہ

نقیب کی تمام تحریریں ان کی نظروں سے گزرنے کے بعد ہی شائع ہوتی تھیں۔ مولانا کا انتقال ہوا تو وہ ہندوستان کے سب سے پرانے اردو صحافی تھے۔ اور اب مولانا حامد الانصاری غازی ہندوستان کے سب سے پرانے اردو صحافی ہیں۔ صحافت سے وابستگی کے لحاظ سے اس کے بعد نمبر غالباً اس راقم السطور کا ہے۔

مولانا عثمان غنی صاحب کی دوسری حیثیت مفتی کی تھی، سوائے اس عرصہ کے جب مفتی عباس صاحب نے افتاء کے فرائض انجام دیئے اور یہ عرصہ مختصر رہا۔ مولانا عثمان غنی صاحب ہی امارت کے مسند افتا پر فائز رہے اور صوبہ بہار میں مسلمان انھیں کے فتووں کی طرف رجوع کرتے رہے اور بہار سے باہر بھی ان کا فتویٰ مستند سمجھا جاتا رہا۔

ایک صاحب بہار کے معروف عالم مولانا ریاض احمد صاحب کی مجلس میں مولانا عثمان غنی صاحب کے فتووں پر اعتراض کر رہے تھے۔ مولانا ریاض احمد صاحب نے فرمایا کہ مولانا عثمان غنی صاحب کے فتوے دیوبند کے فتووں سے بہتر ہوتے ہیں۔ مولانا ریاض احمد صاحب بہار صوبہ کے ممتاز عالم تھے۔ مدرسہ عزیزیہ میں مدرس کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد ہیں انھوں نے دار العلوم دیوبند میں بھی کچھ عرصہ بحیثیت استاد تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ساتھ ہی ضلع چمپارن میں ان کا اپنا مدرسہ تھا۔ چمپارن کے طول وعرض میں ان کا اثر پھیلا ہوا تھا۔

مولانا ریاض احمد صاحب کے مذکورہ بالا بیان کی صحت کا مجھ کو اس وقت علم ہوا جب میں امارت کا وفد لے کر جمشید پور گیا۔ وہاں بریلوی دیوبندی محاذ کھلا ہوا تھا اور مسلمان دو حصوں میں تقسیم تھے۔ بریلوی حضرات کے لیڈر ارشد القادری صاحب تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ میں امارت شرعیہ پھلواری شریف سے آرہا ہوں۔ ہمارے امیر مولانا شاہ قمر الدین صاحب ہیں۔ آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ یہ وقت مسلمانوں کی باہمی لڑائی کا نہیں ہے۔ ارشد القادری صاحب نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن انھوں نے فتووں کی ایک فائل نکالی اور مجھ سے کہا کہ "پھلواری شریف کو ہم اپنے سے قریب سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھئے کہ دیوبند کا یہ فتویٰ ہماری حمایت میں ہے اور پھلواری شریف کا فتویٰ ہماری مخالفت میں"

قصہ یہ تھا کہ ارشد القادری صاحب نے نعلین مبارک کا ایک نقش شائع کیا تھا اس

پر غالباً کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا، ایک شخص اس نقش کو مسجد میں لٹکانے گیا امام نے کہا کہ پہلے دکھاؤ کیا ہے، پھر لٹکانے کی اجازت ملے گی۔ امام صاحب نے اس نقش کو چاہا کہ چھین لیں اس میں نقش پھٹ گیا اب شور ہوا کہ امام صاحب نے نقش کی توہین کردی۔ نوبت لڑائی تک آئی اور مختلف دینی مدارس میں استفسار کے خطوط بھیجے گئے۔ دارالعلوم دیوبند سے فتویٰ آیا کہ امام نے نقش کی توہین کی ہے اس لئے اس امام کو ہٹا دینا چاہیئے۔ مولانا عثمان غنی صاحب نے جواب دیا تھا کہ جس نقش پر اللہ اور رسولؐ کا نام لکھ کر اللہ اور سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی ہو۔ اس لئے امام نے بہت ٹھیک کیا جو اس کو چاک کردیا۔ اور مسجد میں لٹکانے کی اجازت نہیں دی۔ سہارن پور کا فتویٰ تھا کہ محض نقش کو پھاڑ دینے سے امامت باطل نہیں ہوتی اور مساجد میں تو نقش و نگار مکروہ بھی ہے۔

مولانا ریاض الدین صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مظاہر العلوم سہارنپور کے فتوے سب سے بہتر ہوتے ہیں اس کے بعد مولانا عثمان غنی صاحب کا فتوی ہوتا ہے۔ کاش کوئی صاحب محنت کر کے مولانا کے فتوؤں کو جمع کر کے شائع کر دیتے تاکہ فتاویٰ کا یہ مجموعہ عامۃ المسلمین کے نفع کے لئے موجود ہوتا۔

مولانا کی تیسری حیثیت ناظم دفتر امارت شرعیہ کی تھی۔ مولانا پر جو کئی طرح کی ذمہ داریاں تھیں ان کے باوجود انھوں نے اس فریضہ کو بھی بخوبی انجام دیا یہاں تک کہ کام بڑھا تو مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی کو ناظم دفتر بنایا گیا۔

مولانا نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ سب سے پہلی کتاب مقدمہ بازی کے خلاف تھی۔ زمین داروں کو مقدمات لڑنے کا چسکا لگ گیا تھا اور اس میں مسلمان زمین داروں کی کافی جائدادیں برباد ہو رہی تھیں۔ مولانا کی یہ کتاب بے حد مفید ہے۔ اس کے علاوہ سیرت پر بھی بچوں کے لئے ایک چھوٹی سی کتاب "بشریٰ" کے نام سے لکھی ہے۔ اور بھی کتابیں وقتی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔

چونکہ جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ ایک ہی چیز تھی اس لئے جمعیۃ علماء کا دفتر بھی دفتر امارت شرعیہ میں تھا۔ اور اس کے صدر بھی مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا عبدالوہابؒ دربھنگوی

اور مولانا عثمان غنیؒ باری باری سے ہوتے رہے۔

جب تک آزادی کی جنگ رہی مولانا کانگریس کی حمایت کرتے رہے اور اس کے ممبر بھی رہے کیونکہ کانگریس کو مخالفین سامراج کے متحدہ محاذ کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا سید شاہ عثمان غنی صاحب کی سیاسی واقفیت بھی خاصی تھی اور صوبہ میں جن کو سیاست داں کا دعویٰ تھا ان سے نیچے نہیں بیٹھتے تھے۔ مولانا کا یہ اثر وراثت میں ان کے بچوں میں بھی آیا، اور ان کے بچے ماشاء اللہ سب باخبر، ذہین اور کتاب وقلم کے شوقین ہیں۔

مولانا عثمان غنی صاحب اپنے وطن دیورہ ضلع گیا کے سجادہ نشین شاہ فدا حسین صاحب سے سلسلہ فردوسیہ میں مرید تھے۔ شاہ صاحب دو خانقاہوں کے سجادہ تھے۔ جن میں سے ایک جگہ کے لئے انھوں نے مولانا کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، لیکن مولانا نے کوئی دلچسپی نہیں لی، نہ کسی کو مرید کیا اور نہ کسی کو اجازت دی۔

مولانا سے گذشتہ پشتوں سے ہماری رشتہ داری ہوتی رہی ہے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا سے پہلی بار میری کب ملاقات ہوئی۔ یہ واقعہ ہے کہ جن لوگوں نے میری زندگی پر اثر ڈالا ان میں مولانا بھی ہیں۔ پندرہ روزہ "امارت" اور پندرہ روزہ "نقیب" اس وقت تک مولانا مجھ کو بھیجتے رہے جب تک کہ میں امارت میں کام کرنے کی غرض سے نہ آگیا۔ جب مولانا امارت شرعیہ سے الگ ہو گئے تو پندرہ روزہ "نقیب" کے ساتھ ساتھ ہفتہ وار "نقیب" بھی شائع ہونے لگا، اور اس کی ادارت بھی میرے ذمہ ہوئی۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں سوچتا تھا کہ میں پڑھنے کے بعد مولانا سجادؒ کے ساتھ کام کروں گا۔ اللہ نے اس کا موقع تو نہیں دیا، لیکن ان کے رفقاء مولانا عثمان غنی اور قاضی احمد حسین صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور کچھ عرصہ مولانا ابوالمحاسن کے مشن خصوصی امارت شرعیہ کو چلانے کا۔

آج مولانا عثمان غنیؒ زندہ نہیں ہیں، لیکن بہار کے مسلمانوں کی عوامی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کے بغیر یہ تاریخ نامکمل ہو گی۔ وہ بہار کے مستند عالم دین، بزرگ صحافی اور عوامی رہنما تھے۔ شریعت کے پابند تھے۔ تسبیحات واذکار سے بھی شغف رکھتے تھے بدعات سے متنفر ہونے کے لیکن ہر مسلک کے لوگوں سے شریفانہ تعلقات رکھتے تھے۔

مولانا ریاض احمد چمپارنی

مولانا ریاض احمدؒ سنت پور ضلع چمپارن کے رہنے والے تھے، ۲۶؍اپریل ۱۹۶۱ء کو ان کا انتقال ہوا، وہ علم وفضل کے اعتبار سے ایک مکمل کتب خانہ تھے۔ معقولات ومنقولات پر بہت گہری نظر تھی علم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حافظہ بھی غیر معمولی عطا فرمایا تھا۔ تقویٰ وطہارت کی دولت سے بھی مالامال تھے، شہرت و ناموری کی خواہش سے دور ونفور تھے۔ پھر بھی بقول اکبر ع

کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

چمپارن، چھپرا، مظفر پور اور دربھنگہ میں ان کے ہزاروں متوسلین و معتقدین پھیلے ہوئے تھے۔ متوسلین سب ماشاء اللہ بدعات وخرافات سے دور ہیں، اور کتاب وسنت کو حجت سمجھنے والے ہیں۔ مولانا اپنی مقبولیت کے باوجود بڑے متواضع اور خوش اخلاق تھے، کسی کو حقیر خیال نہیں کرتے تھے۔ بڑی میٹھی اور علمی گفتگو فرماتے تھے بسلسلۂ تلمذ شاہ ولی اللہؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے چند ہی واسطوں سے جاکر مل جاتا تھا۔

مولانا مدرسہ اسلامیہ بتیا کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہر علم وفن کے مشہور اساتذہ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے استفادہ کیا۔ پھر مدرسی کے فرائض انجام دینے لگے۔ مدرسہ اسلامیہ بتیا، مدرسہ حمیدیہ گودنا، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں برسوں مدرس اور صدر مدرس کے عہدہ پر فائز رہے۔ بہت اچھے تلامذہ پیدا کیے۔ انھیں کے تلامذہ میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم ہیں، جنھوں نے عربی ادب میں نام پیدا کیا۔ موجودہ نائب امیر شریعت بہار بھی ان ہی کے شاگرد ہیں، حضرت مولانا سید حسین احمد کی خواہش پر شیخ التفسیر کی

حیثیت سے دارالعلوم دیوبند بھی گئے، لیکن چند ہی ماہ بعد ضعیفی، خرابی صحت اور متوسلوں کی اصرار کی وجہ سے لوٹ آئے۔ مولانا شمالی بہار میں خلافت تحریک کے روح رواں رہے اور جمعیۃ علمار اور امارت شرعیہ کے بھی۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے خصوصی محبت تھی، ہندوستان میں قیام امارت کو واجب سمجھتے تھے۔ امارت شرعیہ بہار کی شوریٰ کے رکن اور چمپارن ضلع کے صدر نقبار تھے۔ یہ امارت کی تنظیم میں اہم عہدہ ہے۔

مولانا کا تعلق جمعیۃ علمار کے ایک لیڈر کی حیثیت سے کانگریس سے بھی تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اس سے مایوس ہو گئے تھے۔ بتیا میں مولانا سے اس عاجز کی ملاقات ہوئی اور یہ مولانا کا آخری زمانہ تھا تو فرمانے لگے اب کانگریس کی حمایت کو جی نہیں چاہتا ہے۔ اس عاجز کی یہ کہہ کر ہمت افزائی کی کہ "آپ کی تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی حمایت میں جرأت سے لکھتے رہیئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا"

مولانا کسی کے خلاف تعصب اور نفرت کا جذبہ نہیں رکھتے تھے، بریلوی، دیوبندی، وہابی اور دوسری سیاسی گروہ بندیوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بہار کے متعدد مدرسوں کی سرپرستی کرتے، ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مزاج کی حفاظت کرنے میں ان مدرسوں نے اہم کردار انجام دیا ہے۔ مولانا ہی کی وجہ سے چمپارن امارت شرعیہ کا مضبوط علاقہ بن گیا اور مسلم لیگ کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم مولانا ہی کی وجہ سے صرف کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر اسمبلی میں آئے۔ مولانا نے اس لئے ڈاکٹر صاحب کی حمایت کی کہ امارت کے ذمہ دار حضرات یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کامیاب ہو جائیں۔

مولانا وضع و قطع میں قدیم علمار کی طرح تھے۔ جدت پسندی کی ان کو ہوا تک نہیں لگی تھی۔ لیکن سیاست میں جدت پسندوں سے زیادہ بلند اور انقلابی رجحانات رکھتے تھے۔ پاکستان کی تحریک کو انھوں نے پسند نہیں کیا۔ پاکستان

بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو جو نقصانات پہنچے اور متحدہ ہندوستان کی سعی اور کوشش میں ہندوستانی مسلمانوں نے جو ترقی کی، اس سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کا موقف صحیح تھا۔ کہتے تھے کہ ہندوستان کے فسادات میں مسلمانوں کی مجبوریاں، پاکستان بننے کی وجہ سے ہیں اور اس وجہ سے ہیں کہ مسلمان ملازمین ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، لیکن ہندوستانی لیڈروں نے متحدہ ہندوستان کی تعمیر کی جو کوششیں کیں اور نچلے طبقہ کو اٹھانے کے لئے جو اقدامات کئے، ان سے مسلمانوں کو بھی فائدے پہنچے، چنانچہ مسلمانوں کا اوپر کا طبقہ پریشانی میں ضرور پڑ گیا، لیکن پسماندہ طبقہ کافی ابھرا اور پھلا ہے، دھنئے، کنجڑے، قصاب، ٹھٹھیرے وغیرہ اقتصادی اور علمی اعتبار سے پہلے سے بہت بہتر اور عزت والے ہو گئے، جن کو زمین داروں اور انگریزی حکومت کی مشترکہ پالیسی کی وجہ سے دبایا جاتا رہا، پھر بھی مولانا فرماتے تھے کہ کانگریس کی حکومتیں فسادات کو روکنے میں مستعد نہیں ہیں۔ اسی لئے فسادات نہیں رک سکے ہیں۔

اہلِ نظر مولانا ریاض احمد صاحب کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء دین میں کرتے ہیں۔ وادیٔ علم کے ساتھ وہ وادیٔ سلوک کے راہ نورد بھی تھے، علماء کے طبقہ میں ہمیشہ ان حضرات کو مقبولیت عام کی دولت ملی ہے، جو ان دونوں صفات کے جامع ہوں۔ مولانا ریاض احمد صاحب کی ہر دلعزیزی کا راز ان کے اسی جوہر میں مضمر تھا۔

مولانا لقاء اللہ عثمانی

راقم الحروف کے اجداد حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتیؒ کی اولاد سے تھے۔ اس نسبت سے پانی پت کے لوگ ہمارے یہاں آتے رہتے تھے اور والد اور بڑے بھائی بھی پانی پت (پنجاب) جا چکے تھے، اور مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی سے مل چکے تھے۔

مولانا خلافت تحریک کے فعال رکن تھے، جب وہ خلافت کمیٹی صوبہ دہلی کے ذمہ دار کارکن تھے اور دہلی میں رہتے تھے، تو میں پہلی دفعہ دہلی گیا تھا اور بڑے بھائی کے ساتھ ان کے دفتر میں مولانا سے ملا تھا۔ میں چھوٹا تھا اور شب برات کا زمانہ تھا اس مناسبت سے مولانا نے مجھ کو ہدیہ میں پھلجھڑی دی تھی۔ پھر میں روز دفتر خلافت کمیٹی جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جامعہ ملیہ میں میں داخل کر دیا گیا، اس کے بعد سے زمانۂ دراز تک مولانا سے ملاقات نہ ہوئی۔

آزادی کے بعد لکھنؤ کانفرنس میں مولانا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بڑے بھائی ان کو یاد تھے اس لئے ان کی خیریت پوچھی، پھر بعد دادا کے مزار پر آؤ۔

ویسے تو مولانا کی پوری عمر علمی کاموں میں اور مسلمانوں کی خدمت میں بسر ہوئی لیکن آزادی کے بعد انہوں نے جو مجاہدانہ قدم اٹھایا وہ ہم سب کے لئے جب اندھیرا چھا رہا ہو شمع ہدایت ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کو غیر معمولی صلہ بھی ملے گا۔

آزادی کے بعد فسادات ہوئے تو پورا پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو گیا، جو رہ گئے وہ ہندو بن کر ٹیک رکھ کر رہے۔ ہر طرف مسلم دشمن خونخوار پھر رہے تھے: مولانا نے کہا میں تنہا رہوں گا۔ یہ زمین اگر مسلمانوں کی خون کی پیاسی ہے تو لقاء اللہ اس پیاس کو بجھانے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ مولانا اپنی لمبی داڑھی کے ساتھ، پرانے مولویانہ لباس کے ساتھ علی الاعلان نمازیں پڑھ پڑھ کر، بہادری کے ساتھ اس سرزمین پر رہے، جسے

اولیاء اللہ نے آباد کیا تھا۔ جہاں خدائے واحد و قہار کی پرستش کی دعوت دی تھی۔ جہاں آدمی آدمی کے درمیان امتیاز اور منافرت کو دور کرنے کی تعلیم دی تھی۔ مولانا نے بعض اچھے ہندوؤں کی مدد سے مسلم دشمنی کا جذبہ دور کرنے کی کوشش کی، اوقاف کی حفاظت کی۔ جو مسلمان ہندو ہو گئے تھے ان میں جرأت پیدا کر کے اور ان کو عزت دلا کر اسلام کے اعلان پر آمادہ کیا۔ جابجا جمعیۃ علماء کے دفاتر کھولے تاکہ باہر سے مسلمان آجائیں یا جو اپنے اسلام کا اعلان کریں ان کی حفاظت و خبر گیری ہو سکے اور حکام سے مدد لیں اگر اس کی ضرورت پڑ جائے۔ اسلام کا اعلان کرنے والوں کے لئے مکاتب کھولے۔ مولانا ہر دوسرے تیسرے روز دہلی آتے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر پہنچ کر اور مولانا آزاد سے مل کر مشورے کرتے، مساجد کی حفاظت کی صورتیں سوچتے، جہاں مسلمان مساجد کا انتظام سنبھالنے پر آمادہ ہو جاتے وہاں سے غیر مسلموں کو راضی کر کے ہٹا دیتے۔ ہر سال عرس کے نام پر مسلمانوں کا اجتماع بھی کرتے جس کے لے خود حکومت ہند سہولتیں دیتی۔ غرض انکی خواہش تھی کہ پنجاب پہلے کی طرح پنجاب ہو جائے اور اس کے ہر گلی کوچہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو۔ اور مسلمان چین سے رہ سکیں مولانا کی عمر بہت ہو گئی تھی۔ آخر قضا آگئی اور آخرت کا سفر اختیار کیا جو کام وہ کر رہے تھے اس کے اہتمام کے لئے کسی مرد مخلص و جری کا انتظار ہے۔ مولانا ساری زندگی جمعیۃ علماء اور کانگریس کے حامی رہے۔ اور مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

مولانا کے صاحبزادہ سے ایک بار مکہ معظمہ میں مولانا شاہ عون احمد صاحب کی وساطت سے ملاقات ہوئی تھی، وہ بے چین تھے کہ عثمانی خاندان کا کوئی فرد پانی پت کی درگاہ کو سنبھالے۔

قاضی احمد حسین

قاضی احمد حسین صاحب گیا ضلع صوبہ بہار کے ایک رئیس زمین دار سید خاندان کے فرد تھے۔ نانیہال عثمانی پیرزادوں میں تھا کمسنی میں قرآن حفظ کیا۔ تقریباً ۱۴ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندان میں کوئی بڑا آدمی نہ تھا اس لئے خود زمین داری کا نظم سنبھالا اور چھوٹے بھائی قاضی محمد حسین صاحب کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ قومی خدمت کا جذبہ شروع سے تھا۔ اپنی بستی میں ناخواندگی دور کرنے کی تحریک جوش اور جذبہ کے ساتھ چلائی۔ آغا محمد حسین صاحب جو انکی بستی کے تھے اور بعد میں پشاور کی تاجروں کے ساتھ رہ گئے تھے۔ اور پشاور ہی انتقال ہوا کہتے تھے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آگیا تھا کہ ان کی بستی میں کوئی اَن پڑھ نہیں رہا تھا۔

قاضی صاحب اپنے بعض نوجوان دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کلکتہ جاتے تھے، جہاں وہ لوگ پڑھتے تھے، وہاں انکی ملاقات بنگال کی انقلابی جماعت "جگانتر پارٹی" کے لوگوں سے ہوئی جس سے ابتدائً سبھاش چندر بوس اور ایم این رائے وغیرہ کا تعلق تھا۔ قاضی صاحب کو یہ بات بھلی لگی کہ یہ جماعت انگریزوں کے خلاف کام کرتی ہے۔ چنانچہ وہ اس پارٹی میں شریک ہو گئے اور اس کے لئے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور نئے نئے نوجوانوں کو آمادہ کر کے ان کو پستول وغیرہ خرید کر دیئے، انہی دنوں ان کے ایک عزیز ڈاکٹر قمر الدین صاحب نے جو میڈیکل کالج کے اسٹوڈینٹس تھے ان کی ملاقات مولانا ابو الکلام آزاد سے کرائی۔ مولانا مسلمانوں کی انقلابی جماعت بنانے کی فکر میں تھے۔ اس سلسلہ میں ایک اخبار نکالنے کی رائے ہوئی، چنانچہ مولانا نے "الہلال" نام کا تاریخی جریدہ نکالا۔ پٹنہ کے مشہور قدیم قومی کارکن فضل الرحمٰن صاحب مختار سابق ایم ایل سی بہار نے مجھ سے کہا اور بھی متعدد لوگوں سے کہا کہ قاضی احمد حسین کو مولانا آزاد نے پارلیمنٹ کا ممبر

اس لئے بتایا ہے کہ انھوں نے مولانا کو "الہلال" نکالنے کے لئے دس ہزار روپے دیئے تھے انھوں نے اور بھی کئی آدمیوں سے یہ کہا جن میں ایک ابو الاحد محمد نور صاحب سابق نائب وزیر بہار تھے، میں نے ان سے سن کر قاضی صاحب سے دریافت کیا کیونکہ باوجود ساتھ رہنے کے قاضی صاحب نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اقرار کیا، لیکن کہا کہ مولانا آزاد نے اس وجہ سے مجھ کو پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بنوایا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ الہلال کے اجراء میں قاضی احمد حسین صاحب نے مالی معاونت کی۔

قاضی صاحب نے بتایا کہ کسی جگہ انھوں نے گاندھی جی کی تقریر عدم تشدد پر سنی تھی وہ تقریر ان کے دل میں اتر گئی اور انھوں نے جگانتر پارٹی کو چھوڑ کر کانگریس میں شرکت کر لی۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کی انتخابی جماعت بنانے کے سلسلہ میں قاضی صاحب کے ذمہ یہ کام سپرد کیا تھا کہ وہ ایسے لائق لوگوں کا پتہ چلائیں، مولانا سجادؒ سے (جو انہی دنوں الہ آباد کا قیام چھوڑ کر گیا آ گئے تھے اور یہاں انھوں نے مدرسہ انوار العلوم قائم کیا تھا۔ اور مولانا آزاد کے اخبار الہلال کی تحریروں سے بہت متاثر تھے) قاضی صاحب کی اس موضوع پر بات چیت ہوئی۔ مولانا سجادؒ نے کہا کہ مولانا آزاد مسلمانوں کی تنظیم چاہتے ہیں تو اس کے لئے امارت شرعیہ کا نظام بہتر رہے گا، فقہ کی کتابوں میں اسکی طرف اشارے بھی ملتے ہیں اور اس کے واسطہ سے انقلاب لانا بھی نسبتاً آسان ہوگا۔ مولانا آزاد ان دنوں رانچی میں تھے، وہاں ان سے قاضی صاحب نے تذکرہ کیا مولانا آزاد نے فوراً اس رائے سے اتفاق کیا اور مولانا سجادؒ سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ قاضی صاحب نے دونوں کو ملا بھی دیا۔ کل ہند امارت کے لئے فضا سازگار نہ ہوئی اور اب تک نہ ہو سکی۔ اس لئے امارت شرعیہ بہار قائم کرنے کی رائے ہوئی۔ مولانا آزاد کی صدارت میں پٹنہ میں موتمر بلائی گئی اور شاہ بدرالدینؒ کو امیر شریعت اور مولانا سجادؒ کو نائب امیر شریعت چنا گیا۔

جب مولانا سجادؒ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے مل کر خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور محمد علی جوہر جیسے عظیم لیڈر نے جو مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے مرید تھے، اس ادارہ کو اپنے

ہاتھوں میں لیا تو قاضی صاحب نے گیا میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ اور بہت جلد اس کو گیا ضلع کا بہت مضبوط ادارہ بنا دیا۔ قاضی صاحب اس تحریک میں جیل بھی گئے، اس وقت شہر میں ان کا اتنا اثر تھا کہ یہ گرفتار کئے گئے تو گیا شہر میں مکمل ہڑتال تھی سڑکیں سنسان تھیں، بہت سے حکام بھی دفتروں میں نہیں گئے تھے، گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" مورخہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا کہ قاضی احمد حسین اور مسٹر زبیر بیرسٹر اور شری کرشن سنہا اور رانا شنکر ہندوستان کے سب سے زیادہ بے غرض اور مخلص ترین کارکن ہیں، ان کے گرفتار کر لئے جانے کے بعد صوبہ بہار اداس اور غمگین ہے۔ قاضی صاحب رہا ہوئے تو اس وقت بھی ان کے استقبال کو گیا اسٹیشن پر تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔

الہ آباد لکھنؤ کانگریس میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ مجھ کو ایسے چند آدمیوں کی ضرورت ہے جن کو اگر پھانسی پر لٹکنے کو کہا جائے تو وہ اس سے بھی پس و پیش نہ کریں۔ شاہ غلام حسین صاحب سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف نے مجھ سے کہا کہ وہ اس جلسہ میں موجود تھے اور انھوں نے دیکھا کہ پورے اجلاس میں صرف قاضی احمد حسین صاحب تھے جنھوں نے اپنا نام پیش کیا۔

قاضی صاحب وہاں سے گیا آئے اور اپنی جائیداد اپنے چھوٹے بھائی قاضی محمد حسین صاحب کے نام لکھی (اس وقت تک قاضی صاحب نے اپنی انقلابی مصروفیت کی بنا پر شادی نہیں کی تھی) اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ کیا حکم دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ مولانا شوکت علی کو دفتر خلافت کمیٹی بمبئی میں ایک مخلص آدمی کی ضرورت ہے، آپ وہاں چلے جائیں اور انکے ساتھ کام کریں۔ قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن وہ تو اپنے کو گاندھی جی کے حوالہ کر چکے تھے، اس لئے وہ بمبئی چلے گئے۔ شوکت علی صاحب نے ان کے ذمہ دفتری کام سپرد کیا جسے وہ بہت محنت سے انجام دیتے تھے، لیکن بہار کا بالخصوص گیا کا کام سرد پڑنے لگا۔ کارکنوں نے لکھا اور مولانا سجاد نے بھی کہ تم واپس آجاؤ۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ گاندھی جی مولانا شوکت علی کہیں گے جب ہی وہ واپس آسکتے ہیں چنانچہ گاندھی

جی اور مولانا شوکت علی کے پاس تار جانے لگے، گاندھی جی نے شوکت علی صاحب کو لکھا کہ تم اگر پسند کرو تو قاضی صاحب کو چھوڑ دو۔ بہار کے لوگ اپنے خواہش مند ہیں چنانچہ شوکت علی صاحب نے قاضی صاحب کو بلا کر کہا کہ مولانا سجادؒ وغیرہ کی خواہش ہے کہ تم بہار میں کام کرو، یہاں تم نے جس محنت اور خلوص سے کام کیا ہے اس جیسا کوئی دوسرا آدمی نہیں، پھر بھی کسی طرح کام چلے گا تم جاؤ" چنانچہ قاضی صاحب گیا واپس آ گئے، لیکن گیا والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مولانا سجادؒ صاحب نے ان سے کہا کہ "دفتر امارت شرعیہ میں ایک تجربہ کار آدمی کی ضرورت ہے تم امارت میں آ جاؤ تو مجھ کو بہار میں ہندوستان میں دورے کرنے میں آسانی ہوگی۔ اور دفتر امارت کی طرف سے اطمینان رہے گا" یہی نہیں بلکہ مولانا سجادؒ صاحب نے یہ بھی تحریک کی کہ مولانا نورالحسن قاضی امارت شرعیہ کی لڑکی سے ان کا نکاح ہو جائے، چنانچہ قاضی صاحب نے منظور کیا، اور ان کی شادی ہوئی اور وہ پھلواری شریف میں رہنے لگے اور امارت کے کاموں میں مولانا سجاد صاحبؒ کا ہاتھ بٹانے لگے۔ شروع میں بلا عہدہ اور بعد میں ناظم امارت شرعیہ کی حیثیت سے۔

جب برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کے آئین میں تبدیلی کی اور ہندوستان کو یہ اختیار ملا کہ اپنی قانون ساز مجلسوں کا انتخاب کرے تو قاضی احمد حسین صاحب گیا سے انتخاب میں امیدوار ہوئے اور ایک سرکاری امیدوار کو بہت زیادہ ووٹوں سے شکست دی۔

قاضی صاحب ابتدا میں رئیسوں کی طرح رہتے تھے، لیکن خلافت تحریک نے جہاں بہت لوگوں کو بدل دیا وہاں قاضی صاحب میں بھی تبدیلی آئی۔ گاندھی جی نے دھوتی پہن لی۔ مولانا محمد علی نے اپنا انگریزی لباس چھوڑ دیا۔ شروع میں کرتا پاجامہ، وہ بھی کھادی کا پہنا، پھر عربی لباس پہن لیا۔ قاضی صاحب نے بھی سادہ کھادی کا کرتہ پاجامہ پہن لیا۔ یہاں تک کہ شادی میں بھی اپنی دلہن کے لئے کھادی کے کپڑے گئے۔

بہار کاؤنسل کے ممبر بڑے لوگ ہوتے تھے، وہ موٹروں پر جاتے تھے، قاضی

صاحب بھی موٹر پر جا سکتے تھے۔ لیکن قاضی صاحب پٹنہ اسٹیشن سے ٹم ٹم پر سوار ہوئے اور کانسل ہاؤس جاتے۔ ایک بار سر سلطان نے ان کو ٹوکا بھی لیکن قاضی صاحب نامعقول اعتراضات کی کیا پرواہ کرتے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ جو سودی کاروبار کرنے والے مغلوں سے قرض لے کر شاندار محل (PALACE) بنواتے ہیں وہ نہیں سمجھ سکتے کہ سادگی میں کیا آسانی اور عافیت ہے۔

کانسل میں قاضی صاحب نے وقف بل پیش کیا۔ یہ ہندوستان میں پہلا وقف بل تھا جسے انھوں نے عبدالغنی صاحب ایم ایل سی کی مدد سے تیار کیا تھا۔ بل پیش ہوا تو صوبہ کے متولیوں نے مخالفت میں آواز اٹھائی، یہ لوگ بڑے بڑے زمیں دار تھے اور بہت مضبوط تھے۔ "امیر شریعت اول بہار نے بیان دیا کہ اوقاف کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر بل میں کوئی خامی ہے تو متولی حضرات قاضی صاحب سے مل کر اس خامی کو دور کرالیں قاضی صاحب سمجھ دار اور مخلص آدمی ہیں۔" لیکن متولیوں کا احتجاج بند نہیں ہوا۔ اور بالآخر یہ بل منظور نہ ہو سکا۔ اس کے بعد سے قاضی صاحب کا اعتماد قانون ساز جماعتوں پر سے اٹھ گیا۔ اور وہ عوام میں دینی اور سماجی کام کو ترجیح دینے لگے۔ مولانا سجادؒ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تو اس کو بھی انھوں نے پسند نہیں کیا۔ ان کو مولانا سجادؒ کسی حلقہ سے اسمبلی کے لئے کھڑا کرنا چاہتے تھے وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ انتخابات کے بعد وہ ایسے آدمی کو پارٹی لیڈر بنائیں جو ان کا خاص آدمی ہو اور تجربہ کار بھی اس لئے ان کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں، لیکن قاضی صاحب نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اسمبلیوں کے ذریعہ کسی مفید کام کی امید نہیں رکھتے جب انگریزی دور کے آخر میں انتخابات ہو رہے تھے تو کانسل کی ممبری کےلئے راجندر پرشاد نے ان سے کہا اور کچھ دنوں تک ایک جگہ ان کے لئے خالی رکھی لیکن جب وہ راضی نہ ہوئے تو یہ جگہ شاہ عزیر منعمی صاحب کو دی گئی۔ البتہ بہار زلزلہ کے موقعہ پر راجندر پرشاد نے جو کانگریس ریلیف کمیٹی بنائی اس میں انھوں نے قاضی احمد حسین صاحب کو رکن بنایا اور قاضی صاحب نے مولانا سجادؒ اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ زبردست

کام کیا۔ یہ لوگ اپنے سر پر ملبہ اٹھاتے اور پھینکتے تھے۔

ڈاکٹر سید محمود نے وزیر ہونے کے بعد اسمبلی میں اوقاف کے لیے ایک مسودہ بل پیش کیا اور اس پر غور کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی اس میں قاضی احمد حسین صاحب عبدالغنی صاحب، مولانا سید منت اللہ صاحب وغیرہ کو رکھا۔ کمیٹی کا اجلاس رانچی میں ہوا۔ قاضی صاحب نے خط لکھ کر مجھ کو بلا لیا تھا تاکہ میں ان کاموں میں ان کی مدد کروں جن میں انگریزی زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ ایک دفعہ تو یہ بل پاس ہو ہی جانا چاہیئے، چاہے جیسا ہو۔ چنانچہ کمیٹی نے یہ بل منظور کر لیا۔ اور پھر اسمبلی سے بھی منظور ہو گیا۔ وقف بورڈ بنا تو اس کے صدر یسّٰے صاحب بیرسٹر ہوئے۔ ممبروں میں قاضی صاحب کو بھی رکھا گیا تھا۔ یسّٰے صاحب کی رائے سے قاضی صاحب دفتر کے روزمرہ کاموں کی نگرانی کرنے لگے، لیکن برصغیر ہند میں رشوتوں کا جو زور ہے اس سے وقف بورڈ کا دفتر بچا ہوا نہ تھا۔ اس لئے کام قاضی صاحب کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا، انکی بدنامی بھی ہو رہی تھی۔ آخر کئی برس کی کوشش کے بعد قاضی صاحب نے وقف بورڈ سے اپنی دلچسپی ختم کر دی۔

وقف بورڈ کے علاوہ قاضی صاحب دو کام کر رہے تھے۔ ایک امارت شرعیہ کی نظامت اور دوسرے تبلیغی جماعت کی مدد۔ خود جتھے لے کر دیہاتوں میں جاتے تبلیغی جماعت انھیں بہت پسند تھی۔ ہر مسلمان نوجوان کو اس کے کام کی ترغیب دیتے۔ تعجب سے کہتے کہ مولانا سجاد اس قدر ذہین آدمی تھے۔ مفید لوگوں پر ان کی نظر بہت جلد پڑتی تھی۔ وہ مولانا الیاس صاحبؒ سے کیوں نہیں ملے۔

ایک زمانہ میں جب میرا قیام دیہات میں تھا۔ اور میں کاشتکاری کر رہا تھا، دیکھا کہ قاضی صاحب ٹمٹم سے اتر رہے ہیں، تعجب اور خوشی کے ساتھ لپک کر ان کے قریب پہنچا۔ کہنے لگے میں تمہارے پاس ہی آیا ہوں، کانسل آف اسٹیٹ (راجیہ سبھا) کا انتخاب ہے۔ "تم دہلی مولانا آزاد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو"۔ میں نے کہا "اب تک تو

آپ کانسلوں میں جانے پر راضی نہیں تھے۔ آپ نے اپنی رائے کیوں بدل دی" کہنے لگے "میں تبلیغی جماعت لے کر دیہات جاتا ہوں تو پولیس مجھ کو تنگ کرتی ہے۔ کوئی کہتا ہے مسلم لیگ کا نیشنل گارڈ ہے، کوئی کہتا ہے کہ حیدر آباد کی اتحاد المسلمین کا آدمی ہے۔ حتّٰی کہ سکریٹریٹ کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی پولیس نے میرے خلاف رپورٹ بھی دی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ "ایم پی کانگریس" لگ جائے گا تو پولیس والے تنگ نہیں کریں گے"۔ قاضی صاحب نے کہا کہ میں شری کرشن سنہا سے بھی ملا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ سنا ہے میرے خلاف اس طرح کی رپورٹ ہے۔ آپ اچانک کسی جگہ جہاں میرا تبلیغی دورہ ہو پہنچ جائیں اور دیکھیں میں کیا کرتا ہوں" شری کرشن نے جواب دیا کہ "قاضی صاحب، ہمارے ملازمین اور حکام انگریزی دور کے ہیں۔ ان کا ذہن نہیں بدلا ہے۔ الٹی سیدھی اطلاعیں دیتے رہتے ہیں۔ میں ان پر اعتبار نہیں کرتا اگر ان پر اعتبار کرتا تو آپ سب حضرات جیلوں میں ہوتے"۔

میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ تو خود مولانا آزاد کو لکھ سکتے ہیں" کہنے لگے اپنی ضرورت کے لئے میں مولانا آزاد کو نہیں لکھ سکتا" چنانچہ میں دہلی گیا۔ مولانا کے دولت کدہ پر پہنچا۔ مولانا آزاد کے سکریٹری اجمل خاں نے مجھ کو دیکھ کر کہا کہ جب لڈو تقسیم ہو رہے تھے تب آپ کہاں تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میں لڈو لینے نہیں آیا ہوں میں تو قاضی احمد حسین صاحب کے لئے آیا ہوں۔ وہ کانسل آف اسٹیٹ کے ممبر بننا چاہتے ہیں۔ مولانا آزاد کی موٹر ان کو سکریٹریٹ لے جانے کے لئے تیار تھی۔ اجمل خاں فوراً اندر گئے اور مولانا آزاد کے ساتھ واپس آئے۔ میں نے مولانا کو سلام کیا، تو مولانا نے فرمایا کہ "مجھ کو اجمل خاں سے معلوم ہو گیا ہے کہ قاضی صاحب کو میرا سلام کہئے گا اور کہئے گا کہ جو اس کا موقعہ اور محل ہے اس وقت میں خیال رکھوں گا"۔ اس کے بعد میں واپس ہو گیا۔ جب بہار کانگریس نے قاضی صاحب کا نام نہیں بھیجا، بلکہ جعفر امام صاحب سابق صدر بہار مسلم لیگ اور مظہر امام صاحب سابق انچارج نیشنل گارڈ

مسلم لیگ کے ناموں کی سفارش کی تو چونکہ وقت تھا میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی مجلس عاملہ کے اجلاس سے پہلے مولانا آزاد سے ملنے دہلی چلا گیا مولانا نے پوچھا کہ قاضی صاحب کے نام کی سفارش کیوں نہیں ہوئی۔ میں نے جواب دیا کہ بہار کانگریس کے صدر نے کہا کہ وہ قاضی صاحب کو نہیں جانتے ہیں۔ مولانا آزاد نے فرمایا کہ "صوبائی کانگریس کا صدر اپنے صوبے کے پرانے قومی کارکنوں کو نہ جانے تو یہ اس کا نقص ہے" یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو نظرانداز کر دینے اور ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

میں دہلی کے ایک ہوٹل میں شام کے وقت بعض کانگریسی ممبروں سے بات کر رہا تھا کہ خبر ملی مولانا آزاد نے مجلس عاملہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کسی نام کو بدلوائے بغیر قاضی صاحب کا نام کانسل آف اسٹیٹ (راجیہ سبھا) کی ممبری کے انتخاب کے لئے منظور کرا لیا اور ان کی بہت تعریف کی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمود صاحب نے قاضی صاحب کے نام کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ امارت شرعیہ اور وقف بورڈ کی نگرانی کرتے ہیں ان کے دہلی چلے آنے سے ان اداروں کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن شری کرشن سنہا نے ڈاکٹر صاحب کو زیادہ بولنے سے یہ کہہ کر منع کیا کہ اس سے مولانا آزاد کی مخالفت ہو گی۔ اب قاضی صاحب کانگریس کے ممبر ہو گئے۔ انھوں نے مجھ کو بار بار خط لکھا کہ مسلمانوں میں یوں ہی مخلص کارکنوں کی کمی ہے اگر تم لوگ قومی کام چھوڑ کر اپنے ذاتی کام میں لگ جاؤ گے تو مسلمانوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ قاضی صاحب نے زور دیا کہ میں امارت شرعیہ میں آجاؤں۔ مولانا شاہ قمر الدینؒ، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا قاضی نور الحسنؒ پہلے ہی مجھ سے اس کی فرمائش کر چکے تھے۔ بہاری کاشتکاری بھی ناکام ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں امارت شرعیہ پھلواری شریف آگیا۔ قاضی صاحب نے مجھ کو معین ناظم اور ایڈیٹر "نقیب" کے عہدے دیئے۔

اب دہلی میں زیادہ قیام کی وجہ سے قاضی صاحب امارت شرعیہ کے کاموں کی پوری نگرانی نہ کر سکے اور بہار میں تبلیغی دورے بھی ان کے کم ہوتے گئے۔ امارت کا کام

وہ زیادہ تر مجھ پر چھوڑتے گئے۔ ایک روز کہنے لگے "میں نے مولانا سجادؒ کو خواب میں دیکھا کہہ رہے تھے تم نے امارت کا کام چھوڑ دیا۔ پورے ہندوستان میں امارت قائم کرو۔"

آخر عمر میں قاضی صاحب کو ہندوستان کی قدیم اقوام اور اچھوتوں کی بہت فکر ہوگئی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی ادارہ قائم کیا جاتا جو ان اسباب وعلل کا کھوج لگاتا جن کی بناء پر اونچے ذات کے ہندو ان کو سماج سے گرانے میں کامیاب ہوئے تاکہ ان کو دور کرکے انھیں ایک بار پھر ملک کا باعزت رکن بنایا جاسکے، وہ اس کام کے لئے روپے بھی لگانے کو تیار تھے۔ وہ ڈراویڈکازگم اور سوشلسٹ سماج اور اچھوتوں کے نمائندوں سے ملے بھی۔ ان کی دہلی کی قیام گاہ پر یہ لوگ آتے بھی تھے۔ ان کے علاوہ سوشلسٹ، کمیونسٹ کانگریسی مسلمان، جمعیۃ علماء، جماعت اسلامی تبلیغی جماعت، کے کارکن آتے، حتی کہ صوفی نذیر احمد بھی ملتے۔ جامعہ ملیہ کے بھی بعض اصحاب آتے۔ مشہور انقلابی راجہ مہندر پرتاپ بھی تقریباً روزانہ حاضری دیتے قاضی صاحب کو یہی فکر تھی کہ ان مظلوموں کے حالات معلوم کئے جائیں کہ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور کس طرح ان کو اوپر اٹھایا جائے۔ قاضی صاحب کو اونچے ذات کے ہندوؤں پر اعتماد نہ تھا کہ وہ خلوص سے ان کو اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ کہتے تھے جواہر لال وغیرہ چند لوگ ہیں جو سماج میں اچھوتوں کو مساوی درجہ دینے کے خواہش مند ہیں۔ اور ان کے رعب سے کچھ کام ہو رہا ہے۔ انکی آنکھیں بند ہوئیں تو اچھوتوں پر ظلم شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ دیہاتوں میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو امارت اور تبلیغی جماعت سے وابستہ رہنا چاہیئے اور اچھوتوں کو اٹھانے میں مدد کرنی چاہیئے کہ وہ ملک کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی افادیت بھی ان لوگوں کی سمجھ میں آئے گی جو مسلمانوں کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب ہندو مسلم اتحاد کو بھی

ناگزیر سمجھتے تھے۔

کانسل آف اسٹیٹ (راجیہ سبھا) کی ممبری کے انتخاب کا دوسرا موقعہ آیا تو اس بار مولانا آزاد نے سری کرشن سنہا وغیرہ سے ان کے نام کی سفارش کی چنانچہ صوبائی کانگریس پارلیمنٹری بورڈ سے جو نام مرکز میں منظوری کے لئے گئے ان میں قاضی صاحب کے نام ساتھ یہ سفارش تھی کہ یہ نام کسی صورت میں نہیں بدلا جاسکتا غالباً یہ پہلی غلطی کی تلافی تھی۔ اس کے بعد کانگریس پارٹی کے چیف وھپ نے پارٹی ممبروں کو یہ حکم دیا کہ پالنگ (ووٹ دینے) میں قاضی صاحب کو فرسٹ پریفرنس (پہلی ترجیح) دیں۔ قاضی صاحب کے نام کی تحریک کمیونٹی پروجیکٹ کے مشہور لیڈر تیاگی جی، نول پرشاد وھپ، احمد محمد نور صاحب ڈپٹی وزیر اور سید محمد عقیل صاحب بہار شریف نائب وزیر حکومت بہار کی طرف سے کی گئی تھی۔

ان کے دوسری بار ممبر بننے سے پہلے مولانا آزاد کا انتقال ہوگیا۔ قاضی صاحب بھی دوبارہ ممبر ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد چل بسے۔ لیکن مسلمانوں اور اچھوتوں کے لئے ان کی بے چینی آخر وقت تک رہی۔ آخر میں مجھ سے فرمایا کہ "روپے کا نظم کر دیا جاتا ہے تم کسی اچھے تاریخ داں کو ساتھ رکھ لو اور اس کام کو کرو"

قاضی صاحب نے راجندر پرشاد کو ہند و مسلم اتحاد پر ایک خط میں زور دیا تھا لیکن بقول ڈاکٹر محمود ہندو لیڈر شپ ہند و مسلم اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

مجھ کو قاضی صاحب کی اس دور میں جبکہ وہ پختہ کار، دوراندیش اور تجربہ کار ہو چکے تھے، صحبت نصیب ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جن کی مکمل سوانح عمری عامۃ الناس کے لئے مفید ہوگی، چونکہ اب مجھ سے زیادہ ان کے حالات سے واقف کوئی دوسرا نہیں اس لئے سوانح کی ترتیب کا کام مجھ پر قرض ہے، دیکھئے یہ قرض کب ادا ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کی اہلیہ آزادی سے پہلے انتقال کر چکی تھیں، کوئی اولاد نہ تھی۔

پارلیمنٹ کے جو روپے ملتے وہ یا تو ہندو مسلم مخلص کارکنوں میں صرف ہوتے یا مستحق غریب اعزہ اور طلبہ میں۔ اس کے لئے وہ ایک ماہ پہلے بجٹ بناتے۔ اچانک کوئی امداد کا خواہاں ہوتا تو معذرت کرتے اور کہتے اگلے ماہ میں ممکن ہے۔

قرآن کی تلاوت بہت پابندی سے کرتے تھے۔ بے سمجھے تلاوت نہیں کرتے تھے ہمیشہ ترجمہ کے ساتھ تلاوت کرتے تھے اور کسی ایک ترجمہ پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ مختلف ترجموں کو سامنے رکھتے اور ملا ملا کر پڑھتے، کوئی آجاتا تو اس مطالعہ میں اس کو بھی شریک کرتے اور اپنی رائے دیتے اور اس کی رائے لیتے۔

اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی خوب دی تھی۔ گھنٹوں بولتے رہتے اور کام کی باتیں کہتے ایسے دلچسپ انداز سے بولتے کہ سننے والا گھبراتا نہیں۔ مجھ سے عقیل وکیل صاحب سابق نائب وزیر بہار نے کہا کہ قاضی صاحب کو یہ قوت تقریر اللہ نے بہت ابتدا سے دی تھی۔ ان کی ملاقات قاضی صاحب سے حسن تقریر کی بدولت ہوئی۔ انھوں نے بیان کیا کہ وہ کلکتہ میں پڑھتے تھے۔ ہوسٹل کے جس کمرہ میں وہ رہتے تھے اس کے پڑوس میں گیا کے کچھ طالب علم رہتے تھے۔ قاضی صاحب آتے تو ان کی آواز وہ سنتے اور حیرت میں ہوتے کہ ایک شخص مسلسل گفتگو کر رہا ہے اور سب خاموش سن رہے ہیں۔ گفتگو اتنی دلچسپ کہ اپنا سب کام چھوڑ کر سننے کو جی چاہتا۔ آخر نہیں رہا گیا اور میں ان سے ملنے برابر کے کمرے میں گیا۔ لوگوں نے قاضی صاحب سے تعارف کرایا۔ قاضی صاحب کے تربیت دیئے ہوئے بعض عالم بہار میں بہت اچھے مقرر ہیں۔

قاضی صاحب نے چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی امارت کی طرف سے لکھی ہیں مثلاً رسالہ تنظیم امارت، رسالہ تنظیم زکواۃ، ایمان کی کتاب، عبادت کی کتاب، اخلاق کی کتاب، دارالقضا میں درخواست بھیجنے کے لئے رہنمائے دارالقضا۔ لیکن کسی پر قاضی صاحب کا نام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد ان کے عقیدہ پر بھی ایک کتاب "میرا عقیدہ" کے نام سے اپنے خرچ سے اور اپنی طرف سے شائع کی جس میں مولانا کے خطوط عکسی فوٹو کے ساتھ موجود ہیں۔ سیاسی اختلاف کی بنا پر مولانا کے عقائد کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا

اس کتاب سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

مولانا سجادؒ اور مولانا عبدالحکیمؒ کے انتقال کے بعد قاضی صاحب نے چاہا کہ ان کا قائم کیا ہوا مدرسہ انوارالعلوم ایک مثالی مدرسہ ہوجائے۔ انھوں نے اس کا اہتمام اپنے ہاتھوں میں لیا اور اچھے اساتذہ کی تلاش شروع کی، جو مدرسہ کے پرانے کارکن تھے، ان کو یہ بات پسند نہیں آئی ان کو اپنا مستقبل خطرہ میں محسوس ہوا۔ اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے مل کر جن کا شہر میں اثر تھا مدرسہ پر قابض ہوگئے۔ قاضی صاحب پہلے تو لڑنا چاہتے تھے، پھر اپنے چھوٹے بھائی کے مشورہ سے خاموش ہوگئے اور مدرسہ ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیا۔

قاضی احمد حسین صاحب نے ساری زندگی ملت کی خدمت میں گذاری۔ وہ خلافت تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ مولانا الیاس صاحب کی تبلیغی تحریک کا کام کرتے اور اپنا وقت دیتے اور دیہاتوں میں جماعتیں لے کر جاتے، امارت شرعیہ کی تاریخ میں مولانا سجادؒ کے بعد سب سے زیادہ مخلص اور فعال کارکن کوئی ان سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ انہوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس ادارہ کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اپنا سرمایہ اس ادارہ پر خرچ کیا اور اس سے کوئی منفعت نہیں حاصل کی۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور پابندی کے ساتھ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے کاموں کو اپنا کام سمجھتے اور اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ جماعت اسلامی اور دوسری اہل فکر کے اہل علم وفکر سے گہرے تعلقات تھے۔ دعوت کے ایڈیٹر مسلم صاحب برابر ان سے ملنے کے لئے آتے دہلی میں ان کی رہائش گاہ ساؤتھ اوینیو میں تھی جہاں پارلیمنٹ کے ممبر رہتے ہیں۔ جب وہ دہلی میں ہوتے تو ان کا گھر مسلمانوں کے اہل فکر ونظر کا مرکز بنا رہتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ہو، قاضی صاحب کی رائے اس میں بہت اہم سمجھی جاتی۔ ان کی بصیرت اور تجربہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے۔ وہ ہر ملی کام میں پیش پیش ہوتے اور اس کے ساتھ تعاون کرتے۔ قرآن ہمیشہ پڑھتے اور مسلمانوں کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین کرتے۔ کسی شخص میں قرآن فہمی کی طلب پاتے اور کتابیں خریدنے کی اس میں مالی استطاعت نہ ہوتی تو اپنی پسندیدہ تفسیر کی کتابوں کا پورا سٹ اسے خرید کر دیتے۔ خود ان کا دینی کتابوں کا

مطالعہ بہت اچھا تھا۔ اردو زبان میں مستند علمائے دین اور اہل علم کی کتابیں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں۔ ہر کام کی کتاب جو شائع ہوتی اسے ضرور منگاتے اور اس کا مطالعہ کرتے۔ ان کا ذاتی کتبخانہ جو ان کے گھر پر تھا، بہت عمدہ تھا۔ بہترین اور منتخب کتابیں اس کتب خانہ میں موجود تھیں۔ چند سال پہلے یہ کتب خانہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ضم کر دیا گیا۔ وہ اگرچہ کانگریس کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کے ممبر تھے لیکن ان کا سارا وقت دین و ملت کے کاموں کے لئے وقف تھا۔ دن ملاقاتوں میں گذرتا، راتیں مناجاتوں میں گذرتیں۔ صبح کی نماز میں موجود تمام لوگوں کو بٹھا کر قرآن پڑھتے اور تفسیر سناتے۔ سادہ زندگی گذارتے۔ صحت خراب رہتی۔ دمہ کا شدید عارضہ تھا لیکن کاموں سے نہ تھکتے۔ اسی مرض میں اپنے وطن گیا میں انتقال ہوا۔ محبت رسولؐ کی کیفیت ایسی طاری تھی کہ موت کے دروازہ پر پہنچ کر اور شدید کرب اور تکلیف کی حالت میں بھی وفات کے وقت آنحضرتؐ کی وہ کیفیت یاد رہی جو سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ برتن میں پانی مانگا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اپنے چہرہ پر پھیرتے۔ موت کے وقت اس سنت پر عمل کرنا بہت کم لوگوں کے نصیب میں آیا ہوگا۔

انتقال سے پہلے مرض الموت کی حالت میں آخری خط انہوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام لکھوایا تھا۔ اور یہ خط ہندوستان میں اچھوتوں پر ظلم و ستم کی تاریخ لکھنے اور اچھوتوں میں اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی ضرورت سے متعلق تھا۔ آخر عمر میں وہ اس کام کے لئے بے چین تھے اور ملت کے لئے اسے بے حد ضروری اور مفید کام سمجھتے تھے اور بعض مسنون دعاؤں سے اس کام کے ضروری ہونے پر استدلال کرتے۔ مسلمان رہنماؤں کو اس کام کی طرف توجہ دلاتے اور اس کی اہمیت سمجھاتے انہوں نے اس کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے ہندوستان کے اچھوت لیڈروں سے رابطہ قائم کیا۔ ڈراوڈ کازگم (جنوبی ہندوستان کی اچھوتوں کی تحریک) کی معاونت کی بعض ضروری لٹریچر جو مل سکا اسے تقسیم کرایا۔ ان کے انتقال کے تقریباً ایک چوتھائی صدی کے بعد میناکشی پورم وغیرہ میں قبول اسلام کے واقعات سامنے آئے۔ ان واقعات سے بھی قاضی صاحب کی دور اندیشی اور بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور ان کے مشن کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاضی صاحب غیر مسلم اچھوت لیڈروں کے ذریعہ اس مشن کو چلانا چاہتے تھے اور مسلمان رہنماؤں کو اچھوتوں کی قدیم تاریخ مرتب کروانے کی طرف توجہ دلا رہے تھے۔

قاضی صاحب کے پیشِ نظر دوسرا کام جو دراصل اسی مشن کا ایک جزو تھا وہ ہندی زبان میں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اسلام کے تعارفی لٹریچر کی اشاعت تھا۔ انہوں نے اپنی لکھی ہوئی بعض کتابوں (ایمان کی کتاب اور عبادت کی کتاب) کا ترجمہ کرایا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بہت سے اداروں نے اس ضروری کام کی طرف توجہ دی ہے لیکن ابھی غیرمسلموں کے ذہن اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لٹریچر تیار نہیں ہوا ہے۔ کچھ اردو کتابوں کو جو مسلمانوں کے لئے تھیں ہندی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور ان کتابوں کی اشاعت بھی غیرمسلموں میں پورے طور پر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضروری کام ہے جس کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

قاضی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد اور دوستی کی بھی کوششیں کیں۔ ہندو لیڈروں کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ وہ اس کام کو بھی ایک ضروری کام سمجھتے تھے۔ وہ خود بھی غیرمسلموں کے ساتھ تعلقات قائم کرتے تھے اور ملنے والے مسلمانوں کو بھی اس جانب توجہ دلاتے۔ یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی جن کے ذہن تعمیری پروگراموں سے خالی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندو مسلم منافرت کا ماحول نہ ملک کے لئے مفید ہے اور نہ ملت کے لئے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ان کے انتقال کے بعد مجلس مشاورت قائم ہوئی اور اس نے ملک میں خیرسگالی کے دورے کئے اور اسی جذبہ کے ساتھ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے پیامِ انسانیت کی تحریک شروع کی اور جسے وہ اپنے رفقاء کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

ملت کو قاضی احمد حسین جیسا مخلص، دردمند، صاحب بصیرت اور صاحبِ فراست انسان آسانی سے نہیں ملے گا۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے اور بلند درجات عطا فرمائے۔

ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی

ڈاکٹر زین العابدین صاحب مرحوم کا خاندان گیا کے موضع بسیہگڑہ میں مقیم تھا اور علمی اور دنیادی لحاظ سے اپنے ضلع میں بااثر تھا۔ ان کے خاندان نے علم دین کی علم طب کی، اور اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے، ان کے اقارب میں شاہ وارث علی اشکی اپنے بھانجے الف حسین فریاد کے شاعری میں استاذ تھے اور فریاد مشہور شاعر شاد عظیم آبادی کے استاذ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے ماموں حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی صوبہ کے مشہور شاعروں میں گزرے ہیں۔ انھوں نے اور ان کے چھوٹے بھائی شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب نے ندوہ کی تحریک میں حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا ڈپٹی حسین علی صاحب علم طب کے بڑے ماہر تھے، ان کی کتاب مجربات حسینی جو ڈاکٹر صاحب کے والد نے چھپوائی ہے، مجربات پر عمدہ کتاب ہے۔ ڈپٹی صاحب نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لئے اپنی بستی میں ایک اسکول بھی کھولا تھا۔ راقم کے والد صاحب نے اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی اور ہمارے دادیہال میں والد پہلے آدمی تھے جنھوں نے انگریزی پڑھی۔ والد کے چچا نے بھی دینیات اور تصوف کی تعلیم ڈپٹی صاحب سے لی تھی۔ ڈپٹی صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ باقر علی فارسی، کے بہت اچھے شاعر تھے اور غالب دہلوی کے شاگرد تھے والد کے بہنوئی جو چچا زاد بھائی بھی تھے، باقر کے تلامذہ میں تھے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۳۱۶ھ میں پیدا ہوئے، یہ چند ماہ کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا، ان کی بڑی بہن جو راقم الحروف کی ماں تھیں ان کو اور بقیہ بھائی اور بہنوں کو لے جا کر اپنی خالہ کے یہاں "نورہ" ضلع پٹنہ چلی گئیں۔ ان کے خالو جسٹس شرف الدین مرحوم تھے جو صوبہ بہار کے پہلے مسلمان جج تھے اور قومی و مذہبی کاموں

میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ گاندھی جی کے پہلے کی کانگریس کے فعال رکن تھے۔ یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ اور انجمن اسلامیہ پٹنہ انکی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔

راقم الحروف کی والدہ اور ان کے سب بھائی بہن جسٹس شرف الدین کے یہاں بہت آرام سے رہے، ان کی دیکھ بھال بہت اہتمام سے ہوئی۔ آخر عمر تک والدہ مرحومہ (ڈاکٹر صاحب کی بڑی بہن) اپنی خالہ اور خالو کو بہت محبت سے یاد کرتی تھیں۔ اور رو رو کر ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔

والدہ کی شادی ہوئی تو وہ ڈاکٹر صاحب کو اور چھوٹی بہن کو جو ڈاکٹر صاحب سے دو سال بڑی تھیں لے کر اپنے سسرال سملہ ضلع گیا چلی آئیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کی تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں ہونے لگی۔ جب ڈاکٹر صاحب اس قابل ہوئے کہ تعلیم کے لئے باہر بھیجے جا سکیں تو شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب کی رائے سے تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھیج دیئے گئے۔

ندوہ میں ڈاکٹر صاحب کا اور سید سلیمان ندوی صاحب کا پڑھنے کا زمانہ ایک تھا۔ سید صاحب ایک درجہ اوپر تھے اور ڈاکٹر صاحب ایک درجہ نیچے، چونکہ پڑھنے کا زمانہ ایک تھا، دونوں بہار کے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ماموں ندوہ تحریک کے زبردست حامی تھے اس لئے سید صاحب سے ڈاکٹر صاحب کے تعلقات گہرے ہوئے۔ مجھ کو سید صاحب ایک قومی کارکن کی حیثیت سے جانتے تھے، ان کو یہ علم نہیں تھا کہ میں ڈاکٹر زین العابدین صاحب کا بھانجا ہوں۔ جب ان کو بہت زمانہ کے بعد علم ہوا تو انھوں نے شکایت کی، یہ بات میں نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ فرمایا کہ قومی کارکن تو یاد نہیں رہتے ہیں لیکن اس تعلق کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ بسلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسے عزم کا آدمی نہیں دیکھا۔ پڑھنے کے زمانہ میں کہتے تھے کہ وہ یورپ اور امریکہ جائیں گے، ہم ہنستے تھے کہ ایک یتیم لڑکا جو مدرسہ میں پڑھتا ہے، یورپ اور امریکہ جانے کا خواب دیکھ رہا ہے لیکن وہ جن باتوں کا ارادہ کئے ہوئے تھے وہ سب

کرکے رہے۔ ڈاکٹر صاحب ندوہ میں تھے تو طلبہ کا ایک وفد کسی قومی کام سے حیدرآباد دکن گیا تھا جہاں حسن خدمت کے صلہ میں ڈاکٹر صاحب کو نظام نے تمغہ عطا کیا تھا۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب کی خالہ کے لڑکے، دونوں ماموؤں کے لڑکے یورپ سے بیرسٹری پڑھ کر آگئے تھے۔ دو ماموں زاد بھائی امریکہ میں پڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے ساتھ بچپن گزارا تھا، ان کے ساتھ کھیلے کودے تھے اس لئے ان میں بھی شوق تھا کہ وہ یورپ جائیں، لیکن اس زمانہ میں یورپ جانا بڑے گھر والوں ہی کے لئے ممکن تھا۔

ڈاکٹر صاحب ندوہ سے ۱۹۱۷ء میں فارغ ہوئے تو ان کے چچازاد بھائی کی لڑکی سے ان کی شادی کردی گئی جو خود بھی یتیم تھیں۔ لیکن یہ شادی ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ ان پر یورپ اور امریکہ جانے کا شوق غالب تھا۔ وہ اپنے ہم عمر رشتہ داروں سے کم تر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ ان کو خیال ہوا کہ ابھی ان کی اہلیہ کو تکلیف ہوگی، لیکن جب وہ پڑھ کر واپس ہونگے اور ان کی اہلیہ کو زیادہ آرام میسر ہوگا تو وہ تکلیف بھول جائیں گی لیکن ان کو یہ نہیں اندازہ ہوا کہ وہ تھوڑی پونجی کے ساتھ یورپ، امریکہ جاکر جبکہ ہندوستان میں کوئی مدد بھیجنے والا نہ ہو، خود پریشانی میں پڑ جائیں گے۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب کسی طرح نظم کرکے لندن پہنچ گئے۔ ندوہ میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی لیکن اتنی انگریزی ان کے لئے کافی نہیں تھی اس لئے انھوں نے لندن میں قیام کرکے اپنی انگریزی کی استعداد بڑھائی۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں وہ اٹلی چلے گئے، وہاں انھوں نے رومن کیتھولک مذہب پر ریسرچ کا کام کیا۔ ڈی۔ ڈی (Dr. of Divinity) کی ڈگری لی۔ پوپ سے ملے جس نے ان کو "بک۔ آف انکشٹ" کا تحفہ پیش کیا

اٹلی سے مالی مجبوریوں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب آگے نہ بڑھ سکے اور وہاں سے ہندوستان واپس آئے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں کام کرنے لگے، لیکن جلد ہی پھر یورپ روانہ ہوگئے۔ برلینز اسکول آف لنگویجز میں عربی اور اردو کے استاد ہوگئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے گلاسگو یونیورسٹی میں مذہب اور انسانیت پر لکچر دیا۔ ڈاکٹر میوگر نے انگلستان میں جو بین الاقوامی فیلولوجی سوسائٹی بنائی تھی، اس کے ممبر رہے، پھر کچھ عرصہ

کے بعد امریکہ گئے اور ۱۹۲۲ء میں فورڈ اسکول آف ٹکنالوجی می چی گان سے گریجویشن کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی امریکہ میں پڑھنے کے علاوہ دوسری مذہبی اور سیاسی سرگرمیاں بھی رہیں انکی کوشش سے امریکہ میں سو سے اوپر آدمی مسلمان ہوئے تھے اس کا تذکرہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے جلسۂ ابنائے قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خطبۂ استقبالیہ میں اشارۃً کیا ہے۔ وہ بیک وقت عیسائیت کے اسکالر، ڈاکٹر، لسانیات کے ماہر، ٹکنولوجی کے گریجویٹ، ممتاز عالم دین، مبلغ اسلام تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے امریکہ میں ایک انگریزی رسالہ بھی "لائٹ" کے نام سے ڈاکٹر سید حسین کی سرپرستی میں نکالا تھا جو ان دنوں امریکہ میں تھے۔

ڈاکٹر سید حسین خلافت اور کانگریس کے ممتاز کارکنوں میں رہے ہیں ان کے حالات اس کتاب میں موجود ہیں۔ ان کے والد پٹنہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ اور جسٹس شرف الدین کے دوستوں میں تھے اس تقریب سے امریکہ میں دونوں سے ملاقات ہوئی اور دونوں کانگریس اور آزادئ ہند کے مطالبہ کو امریکہ میں مقبول بنانے کے لئے کام کرتے رہے

۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر زین العابدین صاحب امریکہ میں بورڈ آف فارن مشن کے ٹرسٹی ہوئے۔ نیویارک اور می چی گان میں "المعین لاج" کی بنیاد رکھی، ڈی ٹرائیٹ میں ایکسپورٹ، امپورٹ ایجنسی قائم کی۔ ڈی ٹرائیٹ میں امریکی ایشیاٹک سوسائٹی بھی بنائی۔

شروع میں ڈاکٹر صاحب اپنے اخراجات کے لئے امریکہ میں ٹیوشن کرتے تھے۔ ہندوستانی مزدور ان سے انگریزی پڑھنے آتے تھے۔ مشہور کمیونسٹ کامریڈ شمس الہدیٰ جنھوں نے میرٹھ مقدمۂ سازش میں سزا پائی تھی، انکے شاگردوں میں تھے، انھوں نے امریکہ ہی میں ان سے انگریزی پڑھی تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے دوکانوں میں سیلس مین (SELES MAN) کی حیثیت سے کام کیا، پھر اپنی تجارت کا ارادہ کیا، ان کے ایک ماموں زاد بھائی ہندوستان آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ وہ اتنا کما لیتے ہیں کہ ان کا خرچ چل جاتا ہے، یا اپنی اہلیہ کو کبھی کبھی بھیج دیتے ہیں، ان کے پاس ہندوستان واپس

آنے کا خرچ نہیں بچتا چنانچہ اس کا نظم کیا گیا۔ اور وہ ہندوستان بارہ برسوں کے بعد ۱۹۲۸ء میں واپس آئے۔ ہندوستان میں اس وقت نمک ستیہ گرہ چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی تائید وحمایت کی۔ لکھنؤ میں کل ہند نیشنلسٹ مسلم کانفرنس ڈاکٹر انصاری نے طلب کی تو یہ اس میں شریک ہوئے اور اس کی گیا کی شاخ کے جنرل سکریٹری ہوئے۔

اس زمانہ میں ہندوستان میں عموماً ان ہی ہندوستانیوں کو نوکریاں ملتی تھیں، جو انگلستان کے پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب امریکہ سے آئے تھے اس لئے ویسے بھی توقع کم تھی کہ ان کو اعلیٰ سرکاری ملازمت ملے، دوسرے اپنے رجحانات کی بنا پر وہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ برطانوی حکومت کی ملازمت کریں۔ ان کے دو ماموں زاد بھائی مسٹر محمود، اور مسٹر مصطفیٰ امریکہ سے آئے اور ان کو باوجود کوشش کے نوکری نہیں ملی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے خواہش کی کہ اپنی جائیداد بیچ کر موٹر کا کارخانہ کھولیں لیکن اس زمانے میں زمین داری کا زور تھا، ان کا خاندان یا زمین دار تھا یا نوکر پیشہ، تجارت سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے اسکی اہمیت بھی نہ تھی۔ اسی لئے جائیداد بیچنے کی مخالفت ہوئی، خریدار ڈرے کہ ان کے عزیز پولیس افسر ہیں ان کی ناراضگی مول لینا ٹھیک نہیں اس لئے کسی نے ان کی جائیداد نہیں خریدی۔ انہی دنوں مدرسہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل کی جگہ تھی جو ایک سرکاری مدرسہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ماموں شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب نے ان سے کہا کہ اس میں درخواست دے دو۔ مسٹر عزیز وزیر تعلیم بہار (حافظ صاحب کے برادر نسبتی) کے ذریعہ سے کام ہو جائے گا اور انشاء اللہ تم پرنسپل ہو جاؤ گے، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ میں سرکاری نوکری تو نہیں چاہتا لیکن آپ کا حکم ہے تو درخواست دے دوں گا چنانچہ انھوں نے درخواست دے دی لیکن جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے' پبلک سروس کمیٹی نے تین تین بار ڈاکٹر صاحب کا نام منظور کیا اور ہر بار مسٹر عزیز نے ان کا نام مسترد کر دیا آخر میں بہار کے ایک دوسرے ندوی عالم شاہ معین الدین صاحب ندوی پرنسپل بنائے گئے۔ ان کی مشہور کتاب "خلفاء راشدین" ہے جو دار المصنفین سے چھپی ہے۔ اس موقعہ پر بیچارے ڈاکٹر صاحب پر قادیانی ہونے کا الزام بھی لگایا گیا جبکہ انھوں نے فوراً

تردید کی اور لکھا کہ میں مسلمان ہوں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتا ہوں، فقہی مسلک حنفی ہے اور تصوف میں سلسلہ سہروردیہ کی شاخ فردوسیہ سے منسلک ہوں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمارے برادر نسبتی عبدالصمد صاحب مرحوم کی طلب پر دہلی چلے گئے جہاں ان کا دواخانہ تھا اور انکی تجارت میں ان کا ہاتھ بٹایا، لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی اتنی چھوٹی تجارت میں زیادہ عرصہ تک خود کو مشغول نہیں رکھ سکتے تھے، اس لئے سال بھر سے زیادہ عرصہ کے بعد اپنی اہلیہ کے ساتھ گیا واپس آ گئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کو بلا لیا اور ان کے ذمہ جامعہ کے مالی استحکام کا کام سپرد ہوا۔ ان کا مرکز کلکتہ قرار پایا، ڈاکٹر صاحب نے کلکتہ سے ملیشیا تک کا سفر کرکے جامعہ کے لئے کثیر رقم جمع کی۔ اس کے بعد وہ جامعہ نگر دہلی چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب ندوۃ العلماء اور یورپ اور امریکہ کی مختلف ڈگریاں لینے کے بعد کچھ عرصہ جامعہ سے وابستہ رہے۔

مدرسہ صولتیہ سے ذاکر صاحب کے پاس خط آیا کہ ایسا استاذ دیجئے جو عربی بھی جانتا ہو اور جدید طریقۂ تعلیم سے بھی واقف ہو۔ جامعہ میں اس وقت جو عربی جاننے والے اساتذہ تھے وہ جدید طریقۂ تعلیم سے واقف نہیں تھے اور جو جدید طریقۂ تعلیم سے واقف تھے وہ عربی نہیں جانتے تھے۔

امریکہ کے دوران قیام میں جب ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو ہندوستان آنے میں رکاوٹ ہوئی تو چلتے چلتے انھوں نے بچوں کی تربیت کی ٹریننگ بھی امریکہ میں لے لی تھی، اسلئے ذاکر صاحب نے پوچھا کہ آپ مکہ مکرمہ جائیں گے، ڈاکٹر زین العابدین صاحب فوراً راضی ہو گئے اور اس طرح اس جہاں گرد اور جہاں نورد اسکالر اور جدید و قدیم کے جامع عالم دین کی آخری قیام گاہ متعین ہوئی۔

جب ڈاکٹر زین العابدین کم سن تھے اور والد مرحوم کے ساتھ تھے تو ہمارے قریہ میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی، پڑھے لکھے حضرات بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ غریب اور جاہل رہ گئے تھے حکیم اور ڈاکٹر آنے سے ڈرتے تھے۔ والد نے مریضوں کا علاج شروع کیا اور ہومیوپیتھک دوائیں دینے لگے، کافی مریض شفایاب ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی آنکھوں سے ہومیوپیتھک دواؤں کی تاثیر دیکھی۔ پھر جب امریکہ سے آئے اور اپنی جائداد بیچنے کے سلسلہ میں اپنے قریہ

پیریبگہ میں ان کا قیام ہوا تو ان کے منجھلے بھائی شاہ خیرالدین صاحب کے یہاں دو حادثے ہو گئے تھے جو باقاعدہ ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے، انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں غم غلط کرنے باہر جا رہا ہوں، مریض آئیں تو واپس نہ کرنا، دوائیں موجود ہیں اور کتابیں موجود ہیں، تم پڑھے لکھے آدمی ہو کتابیں دیکھو اور دوائیں دو، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اس پر عمل کیا اور ان کو ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے دلچسپی ہو گئی، خاندان میں چونکہ علم طب یونانی کا رواج کئی پشتوں سے آ رہا تھا، اس لئے یہ لکھنؤ کے دوران قیام میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے اساتذہ اور طلبہ سے بھی ملتے رہتے تھے اور ان سے امراض وغیرہ کے بارے میں کافی واقفیت حاصل کی تھی۔ نباضی بھی سیکھی تھی، قارورہ دیکھنا بھی سیکھا تھا چنانچہ انھوں نے انگریزی میں ہومیو پیتھک کتابیں منگائیں ان کا مطالعہ کیا اور جہاں رہے جسکو ضرورت ہوئی اپنی بیگ سے دوا نکال کر بلا معاوضہ دے دی، ضروری دوائیں وہ اپنی بیگ میں رکھتے تھے۔ ریل پر بس پر ملنے والوں کے یہاں جہاں گئے ان کا بیگ ساتھ رہتا اور یہ مفت دوا دیتے رہتے تھے، چنانچہ جب یہ مدرسہ صولتیہ مکہ آئے تو ان کو کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرصت کے وقت حرم میں بیٹھ کر لوگوں کا مفت علاج کرنے لگے۔ بمبئی کے بعض تاجروں نے بھی ثواب میں شریک ہونے کے لئے ان کو کافی دوائیں بھیجیں، جب انھوں نے مدرسہ صولتیہ چھوڑا تو معاوضہ لے کر علاج کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ نے خوب برکت عطا فرمائی، کافی دولت کمائی، اپنے بچے کو ایم بی بی ایس کی تعلیم دی، سب بیٹے بیٹیوں کی شادی کی، مکہ معظمہ میں طویل وعریض مکان بنایا اپنے وطن کے لوگوں سے دل برداشتہ تھے ہی اس لئے جب ان کو سعودی عرب کی شہریت دی گئی تو انھوں نے قبول کر لی، یہاں ایلو پیتھک علاج کے سوا اور کسی علاج کی اجازت نہیں ہے، لیکن غریب سے لے کر امیر تک نے ان کے علاج کا تجربہ کر لیا تھا اور ان کو طبیب حاذق پایا تھا، اس لئے ان کو خصوصی اجازت مل گئی، ڈاکٹر صاحب کو دعوتوں کا شوق پہلے سے بھی تھا، اللہ تعالیٰ نے فراخدلی دی تو ان کا دسترخوان کافی وسیع ہو گیا تھا خصوصاً جمعہ کو بہت حضرات ان کے دسترخوان پر ہوتے اور پر تکلف کھانا

کھلاتے تھے، حاجیوں کی بھی خدمت کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کا ذوق بھی بہت تھا، ہندوستان میں تھے تو وہاں بھی ان کے پاس بڑا کتب خانہ تھا، مکہ آئے تو یہاں بھی کتابیں اور رسالے منگواتے رہے اور مطالعہ کرتے رہے۔ اس لئے ان کی معلومات تازہ رہتیں اور وہ علم کے قافلہ میں پیچھے نہیں رہتے

ڈاکٹر صاحب خوش حالی میں اپنے غریب رشتہ داروں کو نہیں بھولے، ہر ماہ ان کو روپئے بھیجتے اور مکہ والوں کی خدمت بھی کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہر آدمی سے اخلاق سے ملتے، چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، مزدور ہو یا افسر، جاہل ہو یا پڑھا لکھا، سب سے اخلاق سے ملتے تھے، سب کا اکرام کرتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ دربان ان کے پاس آیا تو وہ کھڑے ہو گئے، مصافحہ کیا، بٹھایا، پان بنا کر دیا خیریت پوچھی پھر پوچھا کیا کام ہے، کیسے آئے ہو۔ اسی سبب سے ڈاکٹر صاحب جہاں رہے بہت مقبول رہے، گیا میں بھی لوگ کثرت سے ان کے پاس آتے جیر گیا تو وطن ہی تھا۔ دہلی میں رہے تو عوام اور خواص کافی ان سے متعارف ہو گئے تھے۔ یہی حال کلکتہ میں ہوا جب مکہ معظمہ آئے تو یہاں بھی غریب مکہ سے لے کر امیر مکہ تک ہر شخص ان سے واقف تھا۔ کوئی ایسا آدمی مجھ کو مکہ میں نہیں ملا جو یہ کہتا کہ میں ڈاکٹر صاحب کو نہیں جانتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب محنتی بھی بہت تھے۔ کسی وقت آرام نہیں کرتے، سوائے رات کے۔ کہتے مشغلہ بدل دینے کا نام آرام ہے، مہمان آتے تو اس وقت بھی کام کرتے رہتے اور بات کرتے رہتے۔ سویرے سوتے تھے، سویرے اٹھ جاتے تھے۔ صبح کو سوتا دیکھ کر بہت ناراض ہوتے تھے۔ مہمان کو بھی پہلے روز بخش دیتے تھے، دوسرے روز زبردستی اٹھا دیتے تھے، تیسرے روز بہت ناراض ہوتے تھے، کہتے تھے جو قوم صبح کو سوتی ہے، وہ دنیا کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی۔ ضرورت سے زیادہ سونا وقت کی ناقدری ہے اور وقت کی ناقدری کر کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر صاحب امریکہ گئے تو میں بہت چھوٹا تھا۔ اس لئے وہ واپس ہوئے تو میں ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ ان کے آنے کی خبر ملی تو میں والد صاحب اور بھائیوں

کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے اسٹیشن گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو نہیں پہچانا بہر حال تعارف ہوا۔ اسکے بعد وہ بیربگہ گئے جہاں انکی اہلیہ تھیں پھر واپس ہوئے تو والدہ سے ملنے گئے جو اپنے قریہ سملہ ضلع گیا میں مقیم تھیں۔ وہاں تقریباً ہر گھر میں انکی دعوت ہوئی۔ ایک روز ہمارے چچازاد بھائی نے پاچک (چورن) بھیجا چونکہ وہ مجنون تھے اور کسی وقت بھی ہوش میں نہیں رہتے تھے اس لئے میں نے کاغذ کی پڑیا کو یہ کہہ کر پھینکنا چاہا کہ "سید بھائی نے پاچک بھیجا ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا "نہ پھینکو مجھ کو ضرورت ہے لاؤ" میں نے کہا "پاگل ہیں معلوم نہیں کیا بھیج دیا ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ریسرچ ہوا ہے کہ پاگلوں کو کشف ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں پاچک ملتا تو کھاتے کیونکہ ہر جگہ روغن دار کھانا مل رہا ہے۔ ان کو ضرور کشف ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر اتنا یقین تھا کہ انھوں نے مجھ سے باصرار لے کر دوا کھالی۔ والد نے سنا تو کہا تو بات معقول معلوم ہوتی ہے جس کا دل جتنا زیادہ دنیا سے بے تعلق ہوگا اسی قدر اس کو کشف ہوگا۔ پاگل چونکہ ہوش میں نہیں رہتے، دنیا کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو کشف ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب ندوی تھے اور ان میں ندویت کی غیرت بھی تھی۔ جب سید سلیمان ندوی صاحب مولانا اشرف علی صاحب سے مرید ہوئے تو انھیں یہ بات ناگوار گزری کیونکہ وہ سید صاحب کو سب سے بڑا ندوی سمجھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرے اداروں کے اکابر کے مقابلہ میں سید صاحب کا درجہ دوسرا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسرے اداروں کے علمار کا احترام نہیں کرتے تھے۔

غیر ندویوں میں وہ مولانا آزاد، مولانا سجاد صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب کے مداح تھے۔ خانقاہوں میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو پسند کرتے تھے۔ والد صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ بہنوئی نہیں، باپ ہیں۔ والد کسی بات کو ناپسند کرتے تھے تو ان کے سامنے اس کام کو کبھی نہیں کرتے تھے، والد بھی ان کو بیٹے کی طرح مانتے تھے، ڈاکٹر صاحب جب تک بیربگہ میں رہے، والد صاحب ہر

ہفتہ ان کے پاس جاتے اور انکی خیریت پوچھتے۔

ڈاکٹر صاحب میں اپنے بھائی بہنوں کی طرح صفائی بہت تھی۔ یہ وصف شاید جسٹس شرف الدین صاحب کے گھر سے ان لوگوں کو ملا تھا۔ گھر اور کپڑوں کی صفائی پر بہت محنت کرتے تھے، ہفتہ میں ایک روز پورے گھر کو باقاعدہ سجایا جاتا۔ صفائی کا یہ غیر معمولی اہتمام عزیزوں میں بہتوں کو کھل جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بہن البتہ اپنے سسرال میں اس صفائی کی وجہ سے مقبول ہوئیں، کیونکہ ہمارے خالو ڈپٹی فضل الرحمٰن صاحب کے یہاں بھی پہلے سے صفائی بہت تھی۔ نظافت اسلام کی تعلیم ہے لیکن مسلمانوں نے اس تعلیم کو فراموش کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا خاندان صوفی بھی تھا۔ لیکن دادا کے بعد سے بیعت کرنے کا شغل نہیں رہا تھا، انکے والد صاحب کو اجازت تھی۔ یہ اجازت انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کو مرید کرکے دے دی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب کو امریکہ سے آنے میں دیر ہوئی تو ان کے بڑے بھائی کو شک ہوا کہ شاید کسی رنج کی وجہ سے امریکہ چلے گئے ہیں اور نہیں آ رہے ہیں، اس لئے ڈاکٹر صاحب کو لانے کے لئے وہ امریکہ گئے۔ لیکن وہاں کی مٹی کھینچ کر لے گئی تھی، بیمار پڑے اسپتال میں داخل ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو مرید کرکے خاندان کے سلسلہ کی اجازت دی۔ انکے بڑے بھائی بیمار ہوئے تو جو روپے لے گئے تھے وہ انھوں نے اپنے نام سے بنک میں رکھ دیئے ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر صاحب کو یہ رقم نہیں ملی، کیونکہ بھائی ہونے کا ثبوت نہ تھا

ڈاکٹر عبدالسبحان صاحب ان کے دادا سے مرید تھے، ان کے دادا، اور ڈاکٹر صاحب کے دادا، ماموں زاد، پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ڈاکٹر عبدالسبحان صاحب ایلوپیتھک ڈاکٹر تھے اور طب یونانی بھی حکیم اجمل خاں صاحب کے والد صاحب سے پڑھی تھی۔ بہر حال اس نسبت سے ڈاکٹر عبدالسبحان صاحب کے لڑکے مولانا حکیم طٰہٰ ندوی سابق استاد مدرسہ شمس الہدیٰ جن کو عربی زبان وادب میں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ مل چکا ہے، خواہش مند ہوئے کہ خاندان کے سلسلہ کی اجازت ان کو دی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ان کو اجازت دے دی۔ مولانا طٰہٰ صاحب عربی، فارسی

اور اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک اردو نظم ڈاکٹر صاحب پر لکھی ہے جو اس مضمون کے آخر میں درج ہے۔

ڈاکٹر صاحب جس طرح کسی کا تعارف کراتے وہ بھی ایک فن تھا۔ تعارف کرانے میں علمی اور اخلاقی خوبیاں بتاتے، کوئی سماجی تعلق ہوتا تو اس کو بھی بتلاتے، آخر میں اپنا تعلق بتاتے۔ ایک بار کسی صاحب سے ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف کرایا، سب سننے کے بعد انھوں نے کہا آپ اتنا کہہ دیجیے کہ میرے بھانجے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا میرے نزدیک انسان کی خصوصیات زیادہ اہم ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر تعارف ہونا چاہیئے۔ رشتہ زیادہ اہم نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے جہاں رہو، وہاں کی تہذیب میں انتشار مت پیدا کرو جو سب پہنیں وہ تم پہنو، جو سب کریں وہ تم کرو۔ صرف ناجائز اور حرام چیز سے پرہیز کرو۔ اس سے ماحول میں اجنبیت پیدا نہیں ہوگی، بلکہ قربت اور محبت بڑھے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب امریکہ میں کوٹ اور پتلون پہنتے تھے، ہندوستان آئے تو ایک ہفتہ کے اندر کرتہ، پاجامہ، شیروانی اور ٹوپی پہن لی۔ سعودی عرب گئے تو عربی کرتہ عبا، عقال اور رومال زیب تن کر لیا۔ ملنے جلنے کے بارے میں کہتے کہ جس کو تم برا سمجھتے ہو وہ آجائے تو اس سے بھی اخلاق سے ملو۔ اس معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو، جب ہی تم اسکی اصلاح بھی کر سکتے ہو، ورنہ وہ نفرت کا جواب نفرت سے دے گا۔

کلکتہ میں میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تقریباً سات برس رہا، اس زمانے میں ان کے اخلاق و عادات و زندگی گزارنے کے طریقوں سے متاثر ہوا۔ اور میری غلط عادتوں کی اصلاح ہوئی اس لیے میرے دل میں خاص طور پر ان کے لیے شکر و احسان کا جذبہ ہے۔

کئی واقعات ایسے پیش آئے جن سے ڈاکٹر صاحب کی قوتِ حافظہ کا اندازہ ہوا۔ کلکتہ میں جمعیۃ علماء کا اجلاس ہو رہا تھا، ڈاکٹر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اجلاس کے روز پہنچے، میری نسبت پوچھا کہاں ہیں، لوگوں نے بتایا کہ جمعیۃ علماء کے اجلاس

میں مشغول ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً جلسہ میں آئے جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کی پیٹھ دروازہ کی طرف تھی اور جن کا منہ ڈائس کی طرف تھا، ڈاکٹر صاحب نے پیٹھ کی طرف سے ان کو دیکھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے تکلفی سے کہا "بہت زمانہ سے بھاگا ہوا تھا آج پکڑا ہے"۔ وہ صاحب تعجب سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ بے تکلف آدمی کون ہیں لیکن پہچان نہیں سکے، پھر ڈاکٹر صاحب نے ان کو بتایا کہ وہ ندوہ میں ان کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیس برس کے بعد ان کو دیکھا تھا جبکہ وہ جوانی کے زمانے سے نکل کر ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طرح کے کئی واقعات دیکھنے میں آئے ہمارے دادیہال کے لوگ بہت بھولتے ہیں اس لئے ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ حافظہ مضبوط کس طرح ہوتا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ قرینہ سے رہنے سے ہوتا ہے۔ گھر میں ہر چیز کی جگہ مقرر کرو، جہاں پر سے کوئی چیز اٹھاؤ، پھر وہیں پر اس کو رکھو۔ جگہ صاف ستھری رکھو تاکہ تلاش کرنے میں آنکھوں کو اور دماغ کو ناگواری نہ ہو۔ جس کو دیکھو اس کی آنکھوں کا حلقہ غور سے دیکھو تو اس میں تبدیلی بہت کم ہوتی ہے۔

کلکتہ میں ان کی تنخواہ بہت معمولی تھی۔ وہ ایک ضروری رقم اہلیہ کو بھیجتے، باقی اپنے رشتہ کی بیواؤں اور یتیموں کو بھیجتے۔ میں نے ایک روز کہا کہ آپ کو خود روپیوں کی ضرورت ہے آپ دوسروں کو بھیج دیتے ہیں اگر سب روپے گھر بھیجنا نہیں چاہتے تو لیما ندہ رکھئے، کہنے لگے روپے رہتے نہیں ہیں، جو خیر میں خرچ ہو جائے وہ پس انداز ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں ایثار، اور غریبوں و تنگ دستوں کی خبر گیری کی خصوصیت نمایاں تھیں، تنگی اور کشائش دونوں حالتوں میں وہ فیاض اور فراخ دل تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے ہندوستان میں تو بار بار ملنا ہوا۔ کلکتہ میں بھی ایک ساتھ رہے۔ لیکن مکہ آ گئے تو صرف دوبارہ ملاقات ہوئی جب وہ ہندوستان آئے۔ سنا کہ آخر عمر میں صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور حافظہ پر بھی اثر پڑ گیا تھا۔ بہتر برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکے رئیس زین العابدین جو ایم بی بی ایس ہیں مکہ میں مطب کرتے ہیں، ماشاء اللہ کامیاب ہیں اور دو لڑکیاں چھوڑیں سب کی اپنی زندگی میں شادی کر دی۔

دوسری بیوی سے جو مکہ کے ایک نیم عرب خاندان میں ہوئی تھی۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا۔ بڑی لڑکی راقم الحروف کی بہو ہے۔ دوسری کی شادی ایک سیدیہ دار خاندان کے لڑکے سے ہوئی ہے، جن کے اجداد ترکی عہد میں حرم کے حنفی مصلی کے امام تھے۔ لڑکا کالج میں اور چھوٹی لڑکی ثانویہ میں پڑھ رہی ہے۔ میری بہو بھی مکہ میں ایک اسکول میں معلمہ ہے۔

میں کلکتہ میں سیاسی کاموں میں بہت مشغول تھا تو وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سیاسی اور مذہبی مسلک میں ہم دونوں ایک تھے، لیکن کہتے تھے پڑھنے کے زمانے میں اتنی مشغولی ٹھیک نہیں ہے، لیکن میری نظروں میں ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رہا مطالعہ تو اس میں شروع میں کوئی کمی نہیں رہی، بعد میں مطالعہ کے مواقع کم ملے۔

کلکتہ جانے سے پہلے میں نے گیا میں جمعیۃ الطلبہ قائم کی تھی۔ مقصد دو تھے ایک مقصد یہ تھا کہ عربی اور انگریزی طلبہ میں جو دوری ہے، وہ ختم ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلم طلبہ میں انگریزی حکومت کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مکان دفتر کے لئے دے دیا تھا اور اپنی لائبریری استفادے کے لئے۔ جب گیا چھوڑ کر چلنے لگے تو ہم تینوں بھائیوں سے فرداً فرداً یہ کہہ کر گئے کہ اپنی لائبریری تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں، لیکن کوئی بھائی بھی گھر پر برابر نہ رہ سکے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی حفاظت بھی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر صاحب نے مکہ سے آکر اپنے کتب خانہ کا حال دیکھا تو بہت افسردہ ہوئے۔ اس قلق کا اظہار انھوں نے کئی آدمیوں سے کیا۔

اب حکیم طٰہٰ صاحب کی نظم پڑھئے جو انھوں نے ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی کی وفات پر کہی تھی۔ ؎

چرخ عرفاں کے ستارے شاہ زین العابدینؒ

۲۹۰۶

ہادی و رہبر ہمارے شاہ زین العابدین

صاحب عزم صمیم مرد حق عالی ہمم

بود مردے پختہ کارے شاہ زین العابدین

اپنی ہمت سے وہ یورپ اور امریکہ گئے

کوہ ہمت را وقارے شاہ زین العابدین

ندویوں میں اک مقام خاص کے مالک بنے

چوں ستونے استوارے شاہ زین العابدین

درسگاہ مولیہ کے معاون وہ رہے

در رہ دیں کردگارے شاہ زین العابدین

خاندانی طب کے ماہر ہومیوپیتھک کے بھی

مرکب طب را سوارے شاہ زین العابدین

بیسیوں حج کی سعادت پاکے مکہ میں رہے

خلد رضواں را بہارے شاہ زین العابدین

اپنے مال مکتسب سے وہ مجاہد بھی رہے

تھے ولی حق کے پیارے شاہ زین العابدین

عالم دین متین مرد مجاہد، مرد مومنے

ملک دیں راشہ پارے شاہ زین العابدین

عابد و زاہد ولی کامل و در راہ حق

جاں نثارے جاں سپارے شاہ زین العابدین

ڈاکٹر صاحب حرم میں پانچ وقت کی نماز میں شریک رہتے، تہجد کے پابند تھے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔ (آمین)

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

میری کتاب کو مرتب ہوئے سال بھر گذر چکے تھے اور اب اس کی کتابت ہو رہی تھی کہ ۱۲ ار شعبان ۱۴۰۴ھ کو مولانا قاری مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ فرماتے تھے کہ وہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح ان کی عمر ۸۳ برس کی تھی۔

دو برس سے زیادہ ہوئے کہ مولانا پر اس وقت فالج کا حملہ ہوا جب وہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے جشن کی صدارت کر کے واپس ہو رہے تھے۔ مولانا اس طویل عرصہ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ یہ اطلاع ملی کہ مولانا کو مرض سرطان کی شکایت ہو گئی ہے۔ میں ہندوستان آیا تو سب سے پہلے مولانا کی عیادت کو گیا۔ مولانا ان دو شدید مرضوں میں مبتلا، لیٹے لیٹے سبھوں کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی کا ذکر کیا اور کہا کہ ان سے ملنے کلکتہ جاؤ۔ میں نے معذرت کی کہ اس ضعیفی میں سفر کی صعوبت برداشت نہیں ہوتی تو کہنے لگے کہ دہلی سے بہت آرام دہ گاڑیاں ہیں پھر میرے لڑکے سے کہا کہ مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کا خط آیا ہوا ہے۔ میری خیریت دریافت کی ہے کسی روز آجاؤ اور جواب لکھ دو۔ عربی میں جواب دینا ہے۔ میں تو مرض کی وجہ سے کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔

مولانا نے دیوبند میں تعلیم پائی۔ وہیں مدرس ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن ؒ کے اسکول سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انقلابی رجحانات رکھتے تھے۔ جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے دیوبند سے مولانا انور شاہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ کو نکالا، تو مولانا موصوف بھی ان میں شامل تھے۔ یہ تمام نکلے ہوئے علماء ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے اور وہاں پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مفتی صاحب مرحوم بھی ڈابھیل

میں مدرس تھے۔ جب سردار پٹیل نے کسان ستیہ گرہ شروع کی تو انہوں نے اس کی حمایت کی۔ پھر وہ کلکتہ تشریف لائے اور کولوٹولہ مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔

کلکتہ کے پنجابیوں نے ایک تبلیغی ادارہ قائم کیا اور ان کو ایک عالم دین کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے مولانا آزاد سے مشورہ کیا تو مفتی صاحب کی تحریک پر ہی مولانا آزاد نے کہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو بلا لیا جائے۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تشریف لائے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن دونوں نے ایک ساتھ دیوبند میں تعلیم پائی تھی ایک ساتھ دیوبند میں دونوں مدرس ہوئے تھے۔ ایک ساتھ دونوں ڈابھیل گئے تھے۔ اب کلکتہ میں بھی دونوں کا ساتھ ہو گیا۔ دن کا کافی وقت دونوں ایک ساتھ گذارتے تھے۔ حالانکہ دونوں کی قیام گاہیں علیحدہ تھیں لیکن باہمی محبت کی وجہ سے دونوں بہت کم ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے تھے۔ ہر وقت دونوں کا ساتھ رہنا اور دونوں کے ناموں کے آخر میں لفظ رحمٰن کا ہونا ایسی باتیں تھیں کہ لوگ ان کو سگے بھائی سمجھتے تھے۔ بتایا جاتا کہ ایک کا وطن دیوبند ہے اور دوسرے کا سیوہارہ ضلع مراد آباد، ایک عثمانی ہیں اور دوسرے صدیقی لیکن لوگ یقین نہیں کرتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ کسی مصلحت سے یہ سگے بھائی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

میرا قیام ان دنوں کلکتہ میں تھا۔ یہ زمانہ غالباً ۳۶ء کا تھا۔ میں شام کو ٹہلنے کی غرض سے کلکتہ میدان جایا کرتا تھا۔ دیکھتا تھا کہ یہ دونوں حضرات گھاس پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس وقت مفتی صاحب کو نہیں پہچانتا تھا۔ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس گیا میں شریک ہوئے تھے۔ جس کی صدارت ان کے چچا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کی تھی۔ لیکن میں نے اس وقت ان کو نہیں دیکھا تھا۔ بڑے بھائی مرحوم سے صرف ان کا نام سنا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ایک بار گیا میں دیکھا تھا۔ دل میں سوچا کہ یہ تو حفظ الرحمٰن صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دوسرے صاحب کون ہیں۔ میں الیٹ ہاسٹل کلکتہ میں رہتا تھا کولوٹولہ سے دور، ایک روز کولوٹولہ مسجد پہنچ گیا تو دیکھا مفتی صاحب تقریر فرما رہے ہیں۔

ایک روز مولانا آزاد کے مشورہ سے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے پاس سرکلر بلڈنگ گیا۔ اس کی تفصیل مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے عنوان کے تحت آچکی ہے دیکھا کہ مولانا کے ساتھ مفتی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں مفتی صاحب سے اچھی طرح تعارف ہوا اور جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کلکتہ چھوڑ کر چلے گئے تو مفتی صاحب سیاسی سرگرمیوں میں ہمارے معاون رہے۔ جب کبھی مفتی صاحب کو کہیں لے جانا ہوا انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا اس کے بعد مفتی صاحب بھی کلکتہ چھوڑ کر چلے گئے اور انہوں نے دہلی میں ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی وہ آخر عمر تک اسی ادارے کو چلاتے رہے۔

اب مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا پھر ساتھ ہوگیا۔ مولانا ندوۃ المصنفین کے سلسلہ میں مفتی صاحب کی مساعدت فرماتے اور مفتی صاحب جمعیۃ العلماء کے کاموں میں مولانا کا ہاتھ بٹاتے۔ ایک زمانہ آیا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد میاں ہی جمعیۃ العلماء ہند کی کشتی کو چلانے والے سمجھے جاتے تھے۔ اور مفتی صاحب کو جمعیۃ علماء ہند کا دماغ قرار دیا جاتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد مولانا محمد میاں کی خواہش تھی کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو جمعیۃ علماء ہند کا صدر بنا دیا جائے لیکن ان کی یہ خواہش پارٹی بازیوں کی نذر ہو گئی۔

جب ہندوستان میں مسلم مخالف فسادات نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو ڈاکٹر سید محمود نے کہا کہ ہندو قیادت ہندو مسلم اتحاد اور دوستی پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے اس لئے مسلم قیادت کو چاہئے کہ یہ کام اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ ڈاکٹر صاحب کی پکار پر مسلم لیگ، جماعت اسلامی، امارت شرعیہ، خلافت کمیٹی جمعیۃ علماء ہند کا ایک بازو، تبلیغی جماعت سے قریب بعض علماء جیسے مولانا منظور نعمانی اور مولانا علی میاں، اور بعض دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتیں جمع ہوئیں اور سبھوں نے مل کر کل ہند مجلس مشاورت کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر محمود صاحب اس جماعت کے صدر ہوئے اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نائب صدر۔ اس جماعت نے ملک کے طول و عرض کا دورہ بھی کیا بعض بڑے اجتماعات میں گاندھی جی کی پوتیاں بھی شریک ہوئیں جب ڈاکٹر صاحب نے مجلس مشاورت کو چھوڑا تو مفتی صاحب اس کے صدر ہوئے اور آخر

وقت تک اس کا صدر رہنا مفتی صاحب کی چند بہترین خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مفتی صاحب میں مخالفتوں کو برداشت کر لینے کی قوت و صلاحیت تھی۔ مخالفوں کی اچھی باتوں کی قدر کر سکتے تھے۔ علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ مخالف بھی جھک جاتے تھے۔ طبیعت ایسی معتدل پائی تھی اور دل اس طرح کا محبت سے بھرا ہوا پایا تھا کہ کسی پر آپ کی قیادت شاق نہیں گذرتی تھی اور سب آپ کو اپنا شفیق بھائی سمجھتے تھے۔ ان میں گروہی تنگ نظری تو نام کو نہیں تھی۔

مولانا بہت کم لکھتے تھے لیکن جو لکھتے تھے اس میں بڑی شگفتگی ہوتی تھی۔ ان کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "منار صدا" کے نام سے ندوۃ المصنفین سے شائع ہو چکا ہے۔ تقریر موثر، مدلل اور عالمانہ ہوتی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نادر اور قیمتی کتابوں کا ایک بڑا کتب خانہ ان کے پاس تھا۔ سیاسی بصیرت بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ جب جے پرکاش نرائن نے مختلف اور متضاد ہندوؤں کو جمع کر کے اندرا گاندھی کے مقابلہ میں ان کو صف آرا کیا تو اس وقت مفتی صاحب نے بیان دیا تھا کہ مختلف خیالات والی پارٹیوں کا سیاسی اتحاد دیرپا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت مولانا کے بعض دوستوں نے بھی اس بیان کو پسند نہیں کیا تھا۔ لیکن کتنا سچا تھا یہ بیان۔ بعد کے واقعات نے مفتی صاحب کی سو فی صد تصدیق کی۔ اسی طرح انقلاب ایران کے بعد مخالفوں کو تختہ دار پر چڑھایا جانے لگا تو مفتی صاحب نے بیان دیا کہ اسلامی انقلاب کے حامیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و درگذر کی مثالوں سے سبق لینا چاہیئے۔ یہ بیان بھی انقلاب ایران کے بعض حامیوں کو اس وقت پسند نہیں آیا تھا لیکن ان میں سے بعض کو اب دیکھتا ہوں کہ وہ قائدین ایران کی معاف نہ کرنے والی سخت پالیسی کو ناپسند کر رہے ہیں اور نقصان تو اس سے ایران کے اسلامی انقلاب کے حامیوں کو شدید پہنچا۔ اور بدلہ لینے کے چکر نے کتنے علماء اور مجتہدین کا کام تمام کر دیا۔

مفتی صاحب نے اپنی یادگار "ندوۃ المصنفین" کی شکل میں چھوڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو کامیابی کے ساتھ چلائے۔ اس ادارہ سے متعدد معیاری اسلامی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کا ثواب انشاء اللہ مفتی صاحب کو ملتا رہے گا۔ کاش مجلس مشاورت کے لئے بھی کوئی صدر اہل و اہم مل جائے جو ڈاکٹر محمود صاحب کی تمنا کو پورا کر سکے۔

کلکتہ میں مولانا سے جو ربط شروع ہوا وہ آخر وقت تک رہا۔ مولانا ہر وقت اس حقیر کے کام آتے رہے۔ وہ اس کی ضرورتیں معلوم کرتے رہتے تھے۔ جب کبھی اس کو کوئی ضرورت پیش آجاتی اور مولانا اس کو جان لیتے تو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ان سے کہوں بھی مولانا خود ہی اس کام کو انجام دے دیتے تھے۔ مفتی صاحب کا احسان یک طرفہ ہی رہا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بدلہ دے۔ آمین

مولانا مجلس مشاورت اور ندوۃ المصنفین کے علاوہ بھی متعدد اداروں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ، مجلس شوریٰ ندوۃ العلماء، دار المصنفین اعظم گڈھ وغیرہ۔

مفتی صاحب کے ساتھ ۴۴ سالہ طویل تعلقات کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ کوئی چیز کھوگئی ہے۔ جب کبھی دہلی آتا تو ایک وقت کھانے کے لئے مفتی صاحب کا مہمان ضرور رہتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت سے نوازے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ آمین

مجھ کو نہیں معلوم کہ مفتی صاحب غیر ملکوں میں کہاں کہاں گئے تھے۔ ان کے سودی عرب اور روس کے سفر کو جانتا ہوں۔ وہ دونوں ہی ملکوں کی تعریف کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا کہیں میونسپلٹی کے جمعدار کی حیثیت سے نہیں جاتے تھے۔ وہ اس لئے جاتے تھے کہ وہاں کی اچھی باتیں معلوم کریں۔ اور ان کو اپنے وطن والوں کے لئے بہترین تحفہ بنا کر لائیں۔

بادش بخیر جب مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی جگہ مولانا حسین احمدؒ جمعیۃ العلماء کے صدر ہوئے تو بعض لوگ نہیں جاننے کی وجہ سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی جماعت کو مطعون کرنے لگے حالانکہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ہٹنا ایک خاص ضرورت کے تحت تھا اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی فرق نہیں کیا گیا تھا۔ وہ صدارت چھوڑنے کے بعد بھی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ مولانا احمد سعید صاحب جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر ہوئے جو مفتی صاحب کے خاص آدمی تھے۔ ان کے دوسرے خاص آدمی مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور مفتی اعظم دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے صدر ہوئے۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ مسلم لیگ کا جب زور ہوا اور عامۃ المسلمین کو علماء کے خلاف مشتعل کیا گیا تو جمعیۃ کے

ارباب حل وعقد کی خواہش ہوئی کہ جمعیۃ العلماء کی صدارت پر ایسے آدمی کو لایا جائے جو نسبتاً زیادہ وقت دے سکتا ہو چنانچہ مفتی اعظم نے صدارت چھوڑ دی۔ مولانا حسین احمدؒ صدر ہو گئے۔

ایک حدیث ہے کہ انسانوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو انسانوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ مفتی صاحب اس حدیث کا عملی نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ملی و دینی خدمات کو قبول فرمائے۔ اور ان کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

چند اور اہلِ علم و تعلق

اور

برادرانِ وطن

ڈاکٹر سیّد حسین

ڈاکٹر سید حسین اصلاً بنگالی تھے۔ ان کی بہن فضل الحق سابق وزیراعظم بنگال، ڈاکٹر حسان سہروردی کی بیوی تھیں۔ ان کے والد پٹنہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے اس وقت مسٹر شرف الدین بیرسٹر پٹنہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور دونوں میں گہرے تعلقات تھے۔ سید حسین نے علی گڑھ میں تعلیم پائی پھر پنڈت موتی لال نہرو کے ایک انگریزی ہفتہ وار میں کام کرنے لگے۔ موتی لال کے ساتھ رہ کر ان کی انگریزی کی استعداد بنی۔ ان کی انگریزی کی صلاحیت جواہر لال ہی کی طرح تھی۔ اور انگریزی خطابت میں تو ہندوستان میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ میں نے سید حسین کی جو تحریریں پڑھی ہیں ان میں میں نے اسی طرح کی بلاغت اور شعریت محسوس کی جس طرح کی بلاغت اور شعریت ٹیگور کی تحریروں میں ملتی ہیں۔

انہوں نے الہ آباد کے زمانۂ قیام میں خلافت تحریک اور کانگریس میں نمایاں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی بھی موتی لال نہرو کی بیٹی وجے لکشمی سے ہونے والی تھی لیکن موتی لال نہرو نے ان کو اس لئے ایسا کرنے سے روک دیا کہ انگریز اور ان کے حامی اس واقعہ کو بہانہ بنا کر ہندؤں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کریں گے۔

محمد علی جوہر نے جب خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تو پھر ان کے ساتھ تھے لیکن بجائے واپس آنے کے یہ امریکا چلے گئے۔ کلی فورنیا یونیورسٹی میں ایشیا کی تاریخ کے پروفیسر ہو گئے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی حاصل کی لیکن آخر دم تک مجرد زندگی گذاری۔

سید حسین نے انڈین نیشنل کانگریس اور اس کی آزادی کی تحریک کی حمایت میں امریکا میں خوب دورے کئے اور بکثرت جلسوں کو خطاب کیا۔ ایک اچھے مقرر ہونے کی وجہ سے ان کی

تقریروں کو سننے کثرت سے لوگ آتے تھے اور جلسوں میں بڑا مجمع ہوتا تھا۔ یہ بات مجھ کو زین العابدین صاحب عثمانی ندوی نے بتائی جو امریکا میں ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سید حسین کی مقبولیت امریکا میں بہت زیادہ ہو گئی تھی اور ان کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزادی کی تحریک سے بھی لوگوں کو ہمدردی ہو گئی تھی۔ جسٹس شرف الدین اور سید حسین کے والد سے جو تعلقات پٹنہ میں تھے وہی ڈاکٹر سید حسین اور ڈاکٹر زین العابدین کے تعلقات کا سبب امریکا میں بنے تھے۔ اور اسی لئے سید حسین ہندوستان آئے تو میں ڈاکٹر زین العابدین کے ساتھ ہی ان سے ملا تھا۔

سید حسین کلکتہ آئے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے مسلم لیگی حضرات جمع تھے۔ کیونکہ فضل حق سے، جو مسلم لیگ کے بنگال میں لیڈر تھے، ان کی رشتہ داری تھی جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ چونکہ میں اس سے پہلے سید حسین کی تحریریں پڑھ چکا تھا خاص کر ان کی کتاب "گاندھی" جو شاعرانہ قسم کی تھی، اور ڈاکٹر زین العابدین صاحب سے ان کے حالات سن چکا تھا اسلئے جانتا تھا کہ وہ مسلم لیگی نہیں ہو سکتے ہیں اسی لئے ڈاکٹر زین العابدین صاحب کی معیت میں ان کے استقبال کی غرض سے ٹانڈہ گیا تھا۔ انہوں نے سید حسین صاحب سے معانقہ کیا اور میرا تعارف کرایا۔ پھر ہم ڈاکٹر احسان سہروردی کے یہاں گئے جہاں وہ ٹھیرائے گئے تھے۔ وہ جبتک کلکتہ میں رہے میں ان کے یہاں جاتا رہا اور ان کی سیاسی گفتگو سنتا رہا۔

ڈاکٹر سید حسین نے کئی تقریریں کیں۔ ایک تقریر انہوں نے یوم چین کے موقع پر کی جس کا انتظام بنگال صوبائی اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے کیا تھا۔ اس جماعت کے صدر ہمارے دوست قاضی معز الدین احمد تھے جو آج کل علی گڑھ میں رسالہ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر ہیں۔ جلسہ کی صدر سروجنی نائیڈو تھیں۔ وہ کسی ضروری کام سے درمیان میں چلی گئیں۔ اور اپنی جگہ صدارت سید حسین صاحب کے حوالہ کر کے گئیں۔

معلوم ہوا کہ سروجنی نائیڈو اور وجے لکشمی پنڈت امریکا گئی تھیں تو انہی نے امریکا میں ان کے دوروں کا نظم کیا تھا اور سید حسین کی وجہ سے ہی ان کا وہاں تعارف ہو سکا تھا۔ کیونکہ سید حسین ان دونوں سے پہلے امریکا میں معروف ہو چکے تھے۔

یوم چین کے موقعہ پر کلکتہ کے اس جلسہ میں معرکہ کی تقریریں صرف دو تھیں۔ ایک سید حسین کی اور دوسرے معلومات کے لحاظ سے ان سے بھی زیادہ یوسف علی مہر کی جو سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے اور بمبئی کارپوریشن کے میئر ہو گئے تھے۔ بڑھاپے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔

سید حسین کی گفتگو بہت صاف ہوتی تھی۔ وہ کانگریس کی حمایت بے جھجک کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کو روکا نہیں جا سکتا وہ تو ہونا ہی ہے البتہ ہندو مسلم منافرت پیدا کر کے ہندوستان اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔

انہوں نے کانگریس کی حمایت میں کہا کہ ملک میں مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے اور وہ پلیٹ فارم کانگریس کے سوا کسی اور جماعت کو نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کے ذمہ دار فرقہ پرست ہندو لیڈروں کو بتاتے تھے۔

ایک دفعہ ان کے مجمع میں ایک ہندو نے کہا کہ مسلمان لیڈر فرقہ پرستی پھیلاتے ہیں۔ سید حسین نے بہت غصہ کے ساتھ اس کی تردید کی اور کہا کہ فرقہ پرستی ڈاکٹر منجے بھائی، پرمانند اور پنڈت مالویہ وغیرہ نے پھیلائی ہے ورنہ ہندوستان میں تو ایک متحدہ تہذیب تیار ہو رہی تھی۔ بزرگوں کے مزارات پر ہندو جاتے تھے، محرم ہندو مناتے تھے، ہولی مسلمان کھیلتے تھے اور جب سیاسی اعتبار سے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگایا اور وہ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس میں شریک ہو گئے تو ٹھیک اس وقت پنڈت مالویہ نے ہندو مہاسبھا اور شدھی سنگھٹن کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اب اس وقت مسلمانوں میں ایسے لیڈر باقی نہیں رہے جو غیر مسلموں کے مجمع میں بھی اعتماد کے ساتھ تقریر کر سکیں۔

ایک دفعہ ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے ان سے پوچھا کہ اب آپ کا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا جواہر لال کہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہو۔ تمہاری ضرورت ہے۔ لیکن جب تک کوئی واضح نقشہ نہ ہو یہاں رہنے کا کیا فیصلہ کر سکتا ہوں۔

امریکا جانے کے بعد نہرو خاندان سے ان کے تعلقات اچھے ہی رہے۔ وجے لکشمی کے شوہر کا انتقال ہوا اور وہ اپنی بچیوں کو تعلیم کے لئے امریکا لے گئیں تو ان کو سید حسین ہی کی نگرانی میں چھوڑ کر آئیں۔ آزادی ہند کے بعد یا اس کے قریب دنوں میں سید حسین پھر امریکا سے آئے اور جواہر لال نے ان کو مشرقِ وسطیٰ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور مصر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور

مصر ہی میں ان کی قبر بھی ہے۔

سید حسین پہلی دفعہ ہندوستان آئے تو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے کو خطاب کیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ

ترسم کہ نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
ایں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

دوسری دفعہ آئے تو ہندوستان میں مسلم دشمن آندھی چل رہی تھی۔ انسان درندے ہو گئے تھے۔ سید حسین نے آزاد کانفرنس لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"دو قوموں کے درمیان جب لڑائی ہوتی ہے تو فاتح قوم عوام سے بدلہ نہیں لیتی جو کچھ سزا کرتی ہے لیڈروں کی کرتی ہے کہ وہ ہی اصل ذمہ دار ہیں۔ جرمنی کو شکست ہوئی اور اتحادیوں نے اس پر قبضہ کیا تو عوام سے بدلہ نہیں لیا بلکہ ان کی پنپنے اور ترقی کرنے میں مدد کی۔ یہ کیا غضب ہے اور بے انصافی ہے کہ پاکستان بننے کا بدلہ مسلمان عوام سے لیا جا رہا ہے۔" یہ ظلم ہے۔ بزدلی ہے۔"

ہندوستان میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے عوام اور خواص کسی سے بدلہ نہیں لیا جبکہ پاکستان میں خان عبدالغفار خان اور ان کے ساتھیوں پر محض کانگریسی ہونے کی وجہ سے مظالم ہوتے رہے نہ صرف یہ کہ جواہر لال وغیرہ نے بدلہ نہیں لیا بلکہ مسلم لیگ کے ان لیڈروں کو جو ہندوستان میں رہ گئے تھے عہدے بھی دیئے لیکن ان کے مخالف ہندوؤں کا یہ حال نہ تھا۔ انہوں نے مسلم لیگی لیڈروں کا تو کوئی نقصان نہیں کیا لیکن بے چارے عام مسلمانوں کو طرح طرح سے اذیتیں دیں۔ اور اس طرح دنیا بھر میں ہندوستان کو بدنام کیا۔

قاضی محمد حسین

یہ قاضی احمد حسین صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد خلافت کمیٹی اور کانگریس میں اپنے بھائی کے ساتھ رہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہندوستانی اقتصادیات پر لکھیں اور آخر میں جے سی کمار یا کی کتاب مالیات عامہ کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت کا حق جامعہ ملیہ کو دے دیا۔

یہ اپنی زمین داری دیکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ اپنی بستی سے لے کر گیا شہر تک جو قومی کام ہوتے تھے اور وہ تعمیری قسم کے ہوتے تھے، اس میں حصہ لیتے تھے۔ ہاشمی اسکول گیا ویسے تو ہادی ہاشمی صاحب رجھتی نے قائم کیا تھا۔ لیکن اس کو باقاعدہ اسکول کی شکل انھوں نے ہی دی اور اپنے بھائی کی مدد سے اس کو حکومت سے تسلیم کرایا۔ قاضی صاحب چاہتے تھے کہ اس کو اعلیٰ قسم کا معیاری اسکول بنایا جائے اس کے لئے ان کے پاس آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے پروگرام بنایا کہ جو ملتے جائیں ان کو لایا جائے اور ان کا تجربہ کیا جائے، مناسب ثابت نہ ہوں تو دوسروں کو لایا جائے اس طرح کوشش کرنے کے بعد مناسب آدمی مل جائیں گے، لیکن یہ پالیسی قاضی صاحب کے لئے دردِ سر بن گئی اور جن کو ہٹانا چاہا وہ قاضی صاحب کے مخالف ہو گئے قاضی صاحب اپنا مقصد پورا نہ کر سکے، لیکن ایک مستحکم مسلمان ہائی اسکول انھوں نے شہر کے مسلمانوں کو دیا۔

قاضی صاحب نے نرہٹ ضلع گیا میں بھی ہائی اسکول قائم کیا۔ اور اپنا شاندار کتب خانہ اس کے حوالہ کیا۔ اس اسکول سے ہندو مسلم طلبہ اور زیادہ تر ہندو طلبہ مستفیض ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اپنی بستی کونی بر میں بھی بیسک اسکول قائم کیا۔

قاضی صاحب گیا ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین بھی رہے۔ قاضی صاحب کی علمی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ ہمیشہ کانگریس کے ساتھ بھی رہے، فعال بھی رہے ان سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو فائدے بھی پہنچے، لیکن چونکہ ان کے علاقہ میں بھومی ہاروں کا اثر ہے اور ان کی ٹکر وہاں کے زمیں دار ہونے کی وجہ سے بھومی ہاروں سے ہو جاتی تھی اور وزیر اعلیٰ بہار شری کرشن سنہا خود بھومی ہار تھے اس لئے قاضی صاحب اپنی پوری صلاحیت کے باوجود آزادی کے بعد اسمبلی کانسل وغیرہ میں نہیں آسکے۔ بہار میں ذات پات کا زور ہے کہ کوئی شخص جب تک بھومی ہار، راجپوت، کالستھ وغیرہ ذاتوں میں کسی ایک ذات سے بندھ نہ جائے اسوقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا اور قاضی صاحب ایسا کرنا اپنے وقار کے خلاف سمجھتے تھے۔

قاضی صاحب کو بجٹ سے بہت دلچسپی تھی، میں نے ان کو بجٹ اس طرح پڑھتے دیکھا ہے جیسے کوئی ناول، افسانے پڑھتا ہے۔

قاضی صاحب کا ادبی ذوق بھی بہت اچھا تھا۔ گفتگو میں بہت اچھے اشعار پیش کرتے رہتے۔

قاضی صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ترقی اور مضبوطی کے لئے بھی کوششیں کیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے لے کر سعید انصاری تک سب سے انکا تعارف تھا۔ اور اچھے تعلقات رہے تھے۔ جامعہ کا جو وفد بھی بہار آیا انھوں نے اس کو گیا میں کامیاب بنانے کی کوشش کی۔

قاضی صاحب نے مجلس احرار اسلام کی کشمیر تحریک میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کے گیا شاخ کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے جیل گئے۔ صورت یہ ہوئی کہ قاضی صاحب نے جلسۂ عام کا اعلان کیا تھا۔ ان دنوں کانگریس کی سول نافرمانی چل رہی تھی۔ اور شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ کلکٹر نے قاضی صاحب کو بلا کر کہا کہ جلسہ مت کرو اس سے کانگریس کو فائدہ ہوگا۔ لیکن قاضی صاحب تو کانگریس کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے اس

لئے نہ مانے اور بالآخر کلکٹر نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

ان کی نوّے سے اوپر عمر ہوئی۔ تین چار سال سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ کسی ادارہ سے تعلق نہیں رہا تھا۔

کمسنی میں جن لوگوں نے میرے خیالات کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ان میں قاضی صاحب بھی ہیں۔ میں اسکول میں پڑھتا تھا، یہ گیا آتے تو میرے یہاں قیام کرتے، مختلف سیاسی و مذہبی تحریکات پر بات کرتے جس سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوتا۔

قاضی صاحب رئیس زمیں دار تھے لیکن عقیدہ کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اپنی طبیعت کے افتاد کی بنا پر ہمیشہ سادہ رہے۔ کھدر کا کرتا پاجامہ، گاندھی ٹوپی پہنتے۔ اور غسل کرنے کے لئے لائف بوائے صابن اور متوسط قسم کے کھانے پر انھوں نے گزارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ گھر میں کوئی چیز بے جگہ رکھی ہے تو اس کے باوجود کہ ایک سے زیادہ خادم رہتے خود اٹھا کر اس چیز کو اپنی جگہ رکھ دیتے۔ اور کسی کو کچھ نہیں کہتے۔

مسلمانوں میں بے دین قیادت کو انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ ان کی والدہ شب بیدار اور ولیہ کاملہ تھیں۔ انھوں نے عبادت و ریاضت، ذکر و مراقبہ وغیرہ کی تربیت اپنے پیر سے باقاعدہ اور مکمل طور پر حاصل کی تھی۔ والدہ کے دوسرے بھائی، بہن الحمدللہ دین دار تھے۔ لیکن ان کے درجہ کا کیا کہنا۔ مکاشفات بہت کثرت سے ہوتے تھے۔ والد مرحوم کو ان سے بہت محبت تھی۔ اپنی سب بہنوں میں ان کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ جب پریشانیاں ہوتیں تو ان کے پاس چلے جاتے اور کہتے کہ جب تک خود نہ آئیں ان کو بلایا نہ جائے۔

قاضی محمد حسین، قاضی احمد حسین صاحب سے دو برس چھوٹے تھے۔ ماشاءاللہ متعدد بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ بڑے لڑکے ماشاءاللہ ذی علم ہیں اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

گذشتہ سال ہندوستان گیا تھا ان کے قریہ" کونی بزنہ پہنچ کر ان سے ملاقات کی

تھی۔ جسمانی طور پر تو بہت کمزور ہو گئے تھے، لیکن دماغی قوت میں کوئی فرق نہیں پایا تھا وہی سیاسی تبصرے، وہی اشعار کا پیش کرنا، خاندان کے حالات پوچھنا۔ صائب مشورہ دینا۔ سب کچھ موجود پایا۔

ابھی ان کے انتقال کی خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ انتقال سے کچھ پہلے وہ میرے بڑے لڑکے محسن سلّمہٗ کے یہاں گئے اور دو تین روز ان کے ساتھ قیام کیا تھا۔ پھر اپنی لڑکی سے ملنے پاکستان چلے گئے اور وہاں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ہ

قاضی محمد حسین کو جو فکری صلاحیت اور قوت عمل ملی تھی اور سادگی اور تواضع اور خدمت خلق اور صلہ رحمی اور دوسرے اوصاف سے وہ جس طرح سے آراستہ تھے اس نے ان کو ان کے وطن اور گرد نواح میں ممتاز اور منفرد مقام عطا کر دیا تھا۔ لوگ ان کی عزت کرتے اور ان سے محبت کرتے اور ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ وہ غریبوں کا خیال رکھتے اور امیر ہونے کے باوجود غریبوں کی طرح رہتے۔ ان کا سیاسی شعور بھی بلند تھا۔ ان سے کم درجہ کی صلاحیتوں کے لوگ اسمبلی کے ممبر بنے اور وزارت کی کرسیوں پر فائز ہوئے۔ قاضی صاحب کو نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلہ کی پرواہ۔ با اصول آدمی تھے اور اپنے معمولات کے پابند۔ ۹۰ سال کی عمر میں بھی ہلکی ورزش جس کی شروع سے عادت تھی، نہ چھوڑی۔ انتقال سے کچھ پہلے دہلی میں محسن سلمہٗ کے یہاں ایک روز قیام کیا تو علی الصباح فجر کی نماز کے بعد مترجم قرآن مانگ کر ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھتے رہے۔ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا اب تو زیادہ تر لوگ صبح اٹھ کر قرآن کی تلاوت کے بجائے صرف اخبار کی تلاوت کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔

مولانا نورالدین بہاری

مولانا نورالدین بہاری ۱۸۹۷ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ ان کا اصلی وطن مھونی تھانہ استھانواں ضلع پٹنہ ہے جو دیسنہ اور گیلانی کے قریب ہے۔ یہ دونوں بستیاں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہا اللہ اجمعین کی وجہ سے مشہور ہیں۔

مولانا نورالدین کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد ضلع گیا میں ہوئی پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، پھر مولانا عبدالوہاب صاحب فاضل بہاری سے منطق پڑھی پھر مولانا ماجد علی صاحب سے متعدد کتابیں پڑھ کر دیوبند تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے ۱۹۱۸ء میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں مدرس مقرر ہوئے یہ نیم سرکاری ادارہ تھا اور اسے ڈپٹی عبدالصمد صاحب مرحوم پیر بگھوی نے قائم کیا تھا، جو شاہ تقی صاحب مرحوم (راقم کے نانا) کے چچا زاد بھائی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات کی وجہ سے اپنی نوکری سے مستعفی ہو گئے۔ امارت شرعیہ قائم ہوئی تو اس کے مبلغ ہوئے اور ممتاز مبلغ ثابت ہوئے۔ یہاں قاضی احمد حسین صاحب سے ان کی نہیں بنی تو مولانا سجاد صاحب نے ان کو دفتر جمعیۃ علماء ہند بھیج دیا، جہاں نائب ناظم کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کرتے رہے۔ یہاں بھی مولانا احمد سعید صاحب سے انکی نہیں بنی اور مولانا سجاد صاحب نے ان کو کہا کہ تم دہلی کانگریس کمیٹی میں کام کرو۔ مولانا کی ہدایت پر یہ صرف کانگریس میں کام کرنے لگے اور بہت جلد اس کے صدر ہو گئے، جو ان کے فعال ہونے کا ثبوت ہے۔ مولانا صوبائی کانگریس کے مضبوط صدر ہوئے، اور جس کو ناپسند کیا وہ صوبہ کانگریس میں کوئی اہم مقام انکی موجودگی میں حاصل نہ کر سکا۔

مولانا سیاسی مشغولی کے ساتھ ساتھ دہلی میں روزانہ درس قرآن بھی دیتے تھے

اپنی ضرورت سب مختصر رکھی تھی، اس لئے نہ کسی کے محتاج رہتے اور نہ کسی سے دب کر رہتے تھے۔ جو حق سمجھتے صاف صاف بول دیتے تھے، کثرت سے جیل گئے۔ جب جیل جاتے تو گھر والے سخت آزمائش میں پڑتے، جب جیل جاتے آزمائشوں کی وجہ سے ان کی بیوی کا انتقال ہو جاتا اور جیل سے نکل کر ان کو نئی شادی کرنی پڑتی، مولانا سب مصیبت جھیلتے رہے لیکن جسکو حق سمجھا اس سے باز نہ آئے۔

میں تقریباً ہر سال دہلی جاتا تھا وہاں ہی مولانا سے میری ملاقات ہوتی تھی، انھوں نے ایک بار میری دعوت بھی کی، دہلی کے ایک جلسہ میں انھوں نے ایک بار مجھ سے تقریر بھی کرائی۔

جمعیۃ علماء ہند اور مولانا محمد علی جوہر میں اختلاف ہوا تو انھوں نے بہت طویل مضمون جمعیۃ علماء کی مدافعت میں لکھ کر شائع کیا، شاید اتنا مفصل جواب جمعیۃ کے کسی اور کارکن کا نہیں نکلا۔

مولانا عثمان غنی صاحب سے ان کی بہت دوستی تھی، جو آخر عمر تک باقی رہی پھلواری شریف آتے تو وہ مولانا سے ضرور ملتے تھے۔ بہار کے فسادات کے موقع پر آئے اور فساد زدہ علاقوں میں تنہا ہی گھومے جو ان کی جرأت اور بہادری کی دلیل تھی۔ کوئی کام انکے سپرد کیا جاتا تو اسیں کو بہت ذمہ داری سے انجام دیتے۔

دہلی سے آکر پروفیسر عبدالباری سے ملے تھے اور ان سے کہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اتنے سارے کانگریسی زندہ ہیں اور وہ فساد کو نہیں روک سکے، ان کو تو چاہئے تھا کہ وہ بلوائیوں کو اپنی لاشیں کو روندتے ہوئے جانے دیتے۔

آزادی کے بعد جب راجندر پرشاد صدر ہندوستان ہوئے اور انھوں نے ایک بڑی دعوت کی تو اس میں مولانا نورالدین بہاری بھی شریک تھے، ان کا بیان تھا کہ کھانا برتنوں کی جگہ پتوں پر تھا۔ مولانا نے اس کا مذاق اڑایا اتنے میں راجندر پرشاد آگئے۔ مولانا نے راجندر پرشاد سے مخاطب ہو کر کہا کہ بس معلوم ہوا کہ آپ حضرات کیسا ہندوستان بنائیں گے۔ راجندر پرشاد ہنسے اور بولے آپ آج کل کیا کر رہے ہیں

مولانا نے جواب دیا کہ "ابھی کمر سے پٹی کھولی ہے اب آزادی کی جنگ ختم ہوئی ہے، اب سوچوں گا کیا کروں، سنا ہے حکومت زمین زراعت کے لئے الاٹ کر رہی ہے کیا کوئی قطعہ بھی مجھ کو مل سکتا ہے۔" چنانچہ راجندر پرشاد کی توجہ سے ان کو بھوپال میں ایک بڑا رقبۂ زمین ملا اور ٹریکٹر وغیرہ بھی۔ مولانا نے آخر عمر میں وہاں کھیتی شروع کی اور وہاں ہی ان کا انتقال ہوا۔

مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی ایک بار میں جمعیۃ علماء کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا بقاء اللہ صاحب عثمانی تشریف لائے اور کسی سے ضروری بات کر کے واپس ہوئے مولانا نورالدین صاحب نے فوراً کہا ٹھہریئے آپ بنی امیہ سے ہیں اور اپنے ہم جد کی طرف بھی توجہ نہیں کی۔ یہ آواز سن کر مولانا بقاء اللہ صاحب واپس ہوئے اور مجھ سے مل کر کہنے لگے کہ دادا کے مزار پر پانی پت آؤ، لیکن عرس میں نہ آنا، ان دنوں میں مشغول رہتا ہوں۔

ایک بار جمعیۃ کے دفتر میں مولانا نورالدین صاحب نے مجھ سے کہا چلو ٹہلنے، میں ان کے ساتھ ہو گیا، ہمدرد دواخانہ کی طرف سے گزر رہا تھا کہ ایک موٹر رکی اور ایک صاحب اترے، انھوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور یہ کہہ کر واپس موٹر پر بیٹھ گئے کہ میں بہت جلدی میں ہوں پھر ملوں گا۔ مولانا نورالدین صاحب نے ان سے پوچھا آپ ان کو جانتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا میں ان کو پہچان رہا ہوں، یہ مجھ کو نہیں پہچانتے۔ جب وہ جا چکے تو مولانا نورالدین بہاری نے کہا یہی تو شفیق الرحمٰن قدوائی ہیں، یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا۔

دفتر جمعیۃ علماء میں میں نے سنا تھا کہ شفیق الرحمٰن صاحب صوبہ دہلی کے وزیر تعلیم ہونے والے ہیں۔ میں نے انکے قیام کی جگہ معلوم کی اور کہا کہ میں ان سے ملنے جاؤنگا، دیکھیں مجھکو پہچانتے ہیں یا نہیں، لیکن یہاں معاملہ الٹ گیا، بہرحال قدوائی صاحب کی خدمت میں گیا اور ان سے معذرت کی، انھوں نے کہا پل بھر کے لئے شبہ ہوا کہ کوئی دوسرے آدمی ہیں، لیکن پھر خیال کیا کہ ایک بہاری کے ساتھ بہاری ہی ہو سکتا ہے۔

پروفیسر عبدالباری

عبدالباری صاحب کوئلور ضلع آرہ کے رہنے والے تھے۔ بودوباش پٹنہ میں اختیار کرلی تھی
تحریک خلافت کے زمانہ میں جب گاندھی جی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سرکاری اسکول
اور کالج چھوڑ دیں اور اپنے آزاد اسکول اور کالج قائم کریں تو ملک میں آزاد قومی یونیورسٹیاں قائم ہوئے
لگیں جن کا حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح کا ایک کالج مسٹر مظہر الحق مرحوم نے صداقت آشرم
میں قائم کیا جس میں راجندر بابو اور پروفیسر عبدالباری استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ عبدالباری
صاحب اسی بنا پر پروفیسر کہلائے۔

عبدالباری صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ چہرے پر بڑی سی لمبی داڑھی بھی تھی۔ خلافت
تحریک کے زمانہ میں کانگریس میں شرکت کی تو آخری عمر میں اسی مورچہ پر رہے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی دوسری
جماعت کانگریس کے سوا نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ جمعیۃ علماء اور امارتِ شرعیہ کے حامی نہیں تھے
وہ یکسو ہوکر کانگریس میں رہے اور کئی بار جیل بھی گئے۔ انتخابات میں کھڑے ہوئے تو صرف کانگریس کے
ٹکٹ پر۔ میں جانتا تو ان کو بچپن سے تھا لیکن کانگریس کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ
کا بھی حامی تھا اس لئے ان سے قریب نہ ہوسکا۔

پروفیسر صاحب سے میری ملاقات پہلی بار جمعیۃ علماء صوبہ بنگال کے اجلاس کے موقعہ پر
ہوئی جبکہ صوبہ کی نظامت کے لئے میرا نام پیش کیا گیا تھا۔ پروفیسر عبدالباری صاحب نے مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ میں ہر جگہ عثمانی صاحب کو دیکھتا ہوں۔ پٹنہ میں بھی ایک
عثمانی صاحب ہیں یہاں بھی عثمانی صاحب ہیں ذرا تعارف تو کرائیے۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے
کہا کہ پٹنہ میں جو عثمانی صاحب ہیں وہ میرے بھائی ہیں۔ اصل میں میرے بھائی عبدالرحمٰن صاحب عثمانی

ان دنوں انڈی پنڈنٹ پارٹی بہار کے اخبار "الہلال" کے ایڈیٹر تھے اور اس کے دفتر کے انچارج تھے۔ اس سے پہلے روزنامہ ہند کلکتہ میں کام کر چکے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب کانگریس کا سشن پنڈت مالویہ کی صدارت میں کلکتہ میں ہو رہا تھا جس کو حکومت ہند خلاف قانون قرار دے چکی تھی تو یہ اس وقت بڑا بازار کانگریس کے ڈکٹیٹر تھے اور سشن میں شرکت کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد پولیس نے ان کے کمرہ کی تلاشی لی اور خلاف قانون لٹریچر رکھنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور سزا پائی۔ کانگریس کی وزارتیں بنیں تو یہ دیہات سدھار میں پی او (P.O.) کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں گورنر نے اس محکمہ کو توڑ دیا اور یہ بیکار ہو گئے تو کچھ عرصہ کے بعد پھر آزاد ہند اخبار کلکتہ میں کام کرنے لگے دو سال مکہ مکرمہ میں بھی قیام رہا۔ واپس آ کے پھر آزاد ہند میں کام کرنے لگے۔ چھٹی میں اپنے اہل وعیال کو دیکھنے بیلا تھانہ گو ضلع گیا آئے تو اتنے بیمار ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے اور وہیں ان کی تدفین ہوئی ان کے انتقال کے کئی سال بعد تک سی آئی ڈی کے آدمی پوچھتے پھرتے تھے کہ پاکستان سے آئے یا نہیں۔ حالانکہ ان کے انتقال کی خبر اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔ یہ حال ہے کہ ہندوستان کے سی آئی ڈی کے محکمے کا۔ یہ آخرت کے مسافروں کو بھی پاکستان کا مسافر سمجھتا ہے۔ بھائی صاحب کبھی اپنی زندگی میں پاکستان نہیں گئے۔

پروفیسر صاحب سے دوسری بار اس وقت ملاقات ہوئی جبکہ میں نیشنلسٹ پارلیمنٹری بورڈ بہار کا آفس سکریٹری تھا۔ وہ ان دنوں صوبہ کانگریس کے صدر تھے۔ وہ کئی بار قاضی احمد حسین صاحب سے ملنے پھلواری تشریف لائے۔ مجھ کو دیکھ کر بولے آپ کی جگہ تو کانگریس میں ہے آپ پھلواری کیوں ہیں۔ صداقت آشرم آئیے۔ اصل میں ان کو یہ معلوم تھا کہ میں کانگریس میں کام کرتا تھا اور بھوپال میں پرجا منڈل کی (ریاست بھوپال کی کانگریس) مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ پہلے بلاتے تو آپ کے یہاں آجاتا لیکن ان لوگوں نے بلایا ہے اس لئے یہاں آ گیا ہوں اور اب آچکا تو اس کو چھوڑنا مناسب نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ دونوں محاذ انگریزی حکومت کے خلاف ہیں۔

انتخابات کے بعد بہت جلد صوبہ میں فسادات شروع ہو گئے۔ اس زمانہ میں قاضی احمد حسین صاحب کے ساتھ کانگریس کے ایک مشاورتی جلسہ میں شریک ہوا۔ اس جلسہ میں غالباً کرشن بلبھ سہائے موجود تھے۔ پروفیسر عبدالباری صدارت فرما رہے تھے۔

مولانا نور الدین بہاری فسادات کی خبر سن کر دہلی سے آئے جو صوبہ بہار کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ وہ پہلے پھلواری شریف اترے۔ پھر مجھ کو لے کر صداقت آشرم گئے۔ پروفیسر عبدالباری صاحب دوپہر کو آرام کرنے کی غرض سے اپنی قیام گاہ پر جا رہے تھے۔ ہم ان کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر چلے گئے۔ مولانا نور الدین صاحب نے پروفیسر عبدالباری سے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اتنے سارے کانگریسیوں کے رہتے ہوئے اتنی خون ریزی ہو گئی۔ کیوں نہیں بلوائیوں کو کہا گیا کہ تم ہماری لاشوں پر سے گذر کر ہی بلوہ کرنے کو جا سکتے ہو۔ یہی بات گاندھی جی نے پروفیسر عبدالباری کی شہادت کے بعد دہلی کے فسادات کے موقع پر کہی۔ گاندھی جی نے دریافت کیا کہ دہلی میں کتنے مسلمان مارے گئے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ایک بھی نہیں۔ گاندھی جی نے کہا جب ہی تو فسادات نہیں دب رہے ہیں۔ بہر حال اور کسی کانگریسی نے جان دی ہو یا نہ دی ہو، بہار میں پروفیسر عبدالباری نے اپنی جان ضرور دے دی۔ گرچہ مولانا نور الدین بہاری کے جواب میں انہوں نے اپنے اس عزم کو ظاہر نہیں کیا کہ فساد بھی ہو اور وہ بحیثیت صدر کانگریس زندہ بھی رہیں دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوں گی۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ ہنگامہ تو دراصل آزادی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان ہوا ہے جیسا کہ یورپ کے ملکوں کے انقلاب کی تاریخ بتاتی ہے لیکن ہندوستان چونکہ مذہبی ملک ہے اس لئے ہر ہنگامہ مذہبی شکل اختیار کر لیتا ہے

پروفیسر صاحب نے یہ بھی کہا کہ "مسلم لیگ کے لیڈر فساد زدہ علاقہ کے مسلمانوں کو کلکتہ وغیرہ بھیج رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ مسلمانوں کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔ مقدمات میں گواہ کیسے ملیں گے اس پر میرے خلاف ان لوگوں نے ہنگامہ کیا اور نعرے لگائے۔"

پروفیسر صاحب کو اس کی فکر تھی کہ فسادی عناصر کو پکڑوایا جائے اور ان کی سزا کرائی جائے تاکہ آئندہ اس طرح کا فساد نہ ہو۔ سنا تھا کہ وہ ملزموں کی فہرست بھی تیار کر رہے تھے اور گواہوں کی فکر میں تھے۔ انہوں نے دہلی جا کر خاں عبدالغفار خاں کو بہار کے دورہ پر آمادہ کیا اور خاں صاحب نے آکر بہار کا دورہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی اس سرگرمی کو پسند نہیں کیا گیا۔ بعض لوگوں کو ابتک گمان ہے کہ ان کی شہادت اسی بنا پر ہوئی۔ ان کے خیال میں یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔ کانگریس کے ایک عہدہ دار کا نام بھی لیا جاتا تھا لیکن کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ یا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جو لوگ مخالفت یا ستائش کی پرواہ کئے بغیر سیدھا

راستہ اختیار کر لیتے ہیں ان کے دائیں بائیں ہر طرف مخالف ہی مخالف ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی جان دیکر بتایا کہ سچی قومی خدمت وادیٔ پرخار ہے۔ اس راستہ میں قدم رکھنے کے لئے اخلاص اور جرأت کی ضرورت ہے۔ جو کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈر فسادات میں ابتک تماشائی بنے رہے ہیں۔ ان کو پروفیسر صاحب کی روح یہ کہہ کر پکار کر کہہ رہی ہے ؎

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا جاں تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

پروفیسر عبدالباری صاحب پہلے کانگریسی تھے جنہوں نے مزدوروں میں کام کیا۔ ورنہ ان سے پہلے تو یہ کام صرف کمیونسٹ ہی کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے جشید پور وغیرہ جنوبی بہار کے مزدوروں کو منظم کیا، ان کے متعدد مطالبات منظور کرائے اور ان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں کھینچا۔ وہ مزدوروں کا ایک روزانہ انگریزی اخبار بھی جمشید پور سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے کارروائی مکمل کر چکے تھے کہ واقعات نے دوسرا رخ اختیار کرلیا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں وہ شہید کر دیئے گئے۔ ان کے بعد ہی کانگریس کی کل ہند مزدور تنظیم قائم ہوئی۔ وہ آخر زمانہ میں جنوبی ہند کے مزدوروں کے مسلم لیڈر تھے

کولیور کا باری پل اور پٹنہ کا باری روڈ ان کی یادگاریں ہیں لیکن ان کی اصل یادگار ان کی شہادت ہے جو پکار کر کہہ رہی ہے کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہے تو غیر فرقہ پرست اپنی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔ وہ کہہ رہی ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

پروفیسر صاحب کے بچوں کو کانگریس حکومت نے چمپارن ضلع میں کچھ رقبۂ زمین زراعت کے لائق دے دی ہے اس لئے ان میں کچھ لوگ چمپارن میں رہتے ہیں۔

مخلص الرحمن

ہندوستان میں سب سے پہلی کسان تحریک گاندھی جی کی رہنمائی میں شیخ گلاب حسین
اور شیخ عدالت حسین وغیرہ نے صوبہ بہار کے ایک مقام ضلع چمپارن میں چلائی لیکن اس
کا حلقہ بہت محدود تھا یعنی صرف ایک ضلع میں۔ اور تحریک بھی صرف انگریزوں کے خلاف
تھی۔ اس کے بعد دوسری کسان تحریک اس سے بڑے پیمانہ پر بنگال میں اٹھی جس کے بانی
مخلص الرحمن تھے جو پہلے کامریڈ کہلائے اور بعد میں مولوی۔ انہوں نے بنگال میں کسان سبھا
بنائی جس کا رخ انگریزوں اور بنگالی زمین داروں کے خلاف تھا۔ اور جن کو اپنی سرگرمیوں
کی پاداش میں حبس دوام کی سزا دی گئی۔ جب یہ کسان سبھا خلاف قانون ہو گئی تو شمس الدین
احمد وغیرہ نے بنگال کریشک پرجا پارٹی بنائی جس کے اول صدر فضل الحق تھے۔ جب وہ مسلم لیگ
میں چلے گئے تو اس کے صدر مولانا عبداللہ الباقی ہوئے اور اسمبلی میں اس پارٹی کے
لیڈر شمس الدین ہوئے۔ پھر جب اول اول کانگریس کی وزارتیں بنیں تو سوامی سہجانند
اور پروفیسر رانگا وغیرہ نے مل کر کسانوں کی کل ہند تحریک چلائی۔

مخلص الرحمن انگریزی پڑھے لکھے ایک نوجوان تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بنگال کے کسان
سب مسلمان ہیں اور زمینداروں کی اکثریت ہندو جو ان مسلمانوں کا استحصال کرتے ہیں۔
استحصال ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ ان کے یہاں کسانوں کو ساتھ بٹھانا
عار ہے۔ حتیٰ کہ ان کے لباس لنگی سے بھی ان کو نفرت ہے۔ چنانچہ مخلص الرحمن کے
دل میں ہندو زمینداروں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان کاشتکاروں
کو ان کے خلاف ابھاریں لیکن ان میں اپنے ہندو مالکوں کے خلاف اٹھنے کی ہمت نہیں
تھی۔ یہاں تک کہ ان کو کچھ ہندو سرپھرے مل گئے۔ انہوں نے مخلص الرحمن کو کمیونزم سے
روشناس کیا اور ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ مسئلہ ہندو مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ساری

دنیا میں سرمایہ داروں اور غریبوں کی کشمکش کا مسئلہ ہے۔

آخر انہوں نے کچھ ہندو دوستوں کی مدد سے کسان سبھا قائم کی۔ اس جماعت کی ٹکر فوراً حکومت سے ہو گئی اور اسے خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مخلص الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کو بغاوت اور قتل کے الزام میں حبس دوام کی سزا دے دی گئی۔

خدا کے غریب بندوں کے لئے مخلص الرحمٰن نے جو عظیم قربانیاں دیں اس کے بدلہ میں رحمت الٰہی جوش میں آئی اور ان کی ہدایت کے لئے ہدایت دینے والے نے اپنی تدبیریں شروع کیں۔

جیل میں کسی ذریعہ سے ان کو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کچھ کتابیں مطالعہ کے لئے ملیں۔ مولانا کی باقی کتابیں انہوں نے خود منگالیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے ذریعہ وہ دین کی طرف لوٹے اور ملحد مخلص الرحمٰن، اللہ کے فرمانبردار مخلص الرحمٰن ہو گئے۔ وہ صحیح معنوں میں مخلص الرحمٰن ہو گئے۔

جب کانگریس کی وزارتیں بنیں تو گاندھی جی نے کوشش کی کہ بنگال کے انقلابیوں کو رہا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی ایک سے زیادہ بار کلکتہ آئے اور گورنر بنگال سے بات کی۔ بالآخر سب چھوڑ دیئے گئے۔ مخلص الرحمٰن بھی رہا ہو گئے۔

جب وہ جیل میں تھے تو ہمارے دوست سید فہیم الدین مرحوم مالک اخبار استقلال بھی انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام میں تین ماہ کے لئے جیل گئے تھے وہاں ان دونوں کی ملاقات ہو گئی تھی۔ جب مخلص الرحمٰن رہا ہوئے تو میں سید فہیم الدین صاحب کے ساتھ ان سے ملا تھا۔ انہوں نے اپنی روداد اپنی زبان سے سنائی تھی۔ ماشاءاللہ چہرے پر بڑی سی داڑھی اور پیشانی پر سجدوں کا نشان تھا۔ اپنے الحاد اور گمراہی کا ذکر کر رہے تھے تو آنکھوں میں ندامت کے آنسو بھر گئے تھے۔

حکیم محمد ابراہیم

حکیم صاحب کا وطن باڑہ ضلع پٹنہ تھا۔ تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی اور وہاں بہت زمانہ تک استاد رہے۔ ہمارے ماموں ڈاکٹر زین العابدین ندوی ندوہ میں پڑھتے تھے تو ان سے ان کا تعارف ہو گیا تھا۔ لکھنؤ چھوڑ کر گیا آئے تو ڈاکٹر زین العابدین امریکا میں تھے۔ یہ اسی تعلق کی بنا پر والد مرحوم سے ملے اور والد نے ان کے مطب کا انتظام کر دیا۔ اور شہر کے لوگوں سے ملا دیا قلب پھیپھڑے کے علاج اور سرجری میں ماہر تھے۔ بہت جلد ان کا مطب کامیاب ہو گیا۔ ان دنوں گیا میں کئی بہت اچھے طبیب تھے۔ حکیم صاحب نے ان کی مدد سے ایک طبیہ کالج کی بنیاد رکھی۔ غالباً مدرسہ طبیہ سنجری نام تھا۔ یہ واقعہ سنہ ۲۳ء یا سنہ ۲۴ء کا ہے۔ غالباً یہ خواہش لے کر وہ لکھنؤ سے آئے تھے۔ ان دنوں بہار صوبہ میں کوئی طبیہ کالج نہ تھا۔ ایک شاندار جلسہ ہوا۔ سر فخر الدین مرحوم ان دنوں وزیر تعلیم تھے۔ وہ اس جلسہ میں مہمان خصوصی تھے۔ مدرسہ چلا لیکن کوئی سرمایہ نہ تھا۔ سر فخر الدین کی معمولی سی مدد کتنا کام دیتی۔ نہ عمارت نہ اساتذہ نہ سامان۔ کچھ طلبہ آئے۔ حکیم محمد ابراہیم صاحب نے کچھ کتابیں اپنے ذمہ لیں۔ کچھ شہر کے دوسرے حکیم صاحبان کو پڑھانے کے لئے دیں۔ مدرسہ کی اپنی عمارت نہیں تھی۔ حکیم صاحبان اس کے لئے تیار نہ تھے کہ حکیم محمد ابراہیم صاحب کے یہاں آکر پڑھائیں۔ اور اس طرح ان کو شہر میں اپنے اوپر فوقیت دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے مختلف اوقات میں ان مختلف استاذ حکماء کے پاس جاتے اور پڑھتے۔

شہر کے حکیموں کو حکیم ابراہیم صاحب کی شہرت و مقبولیت سے خطرہ پیدا ہوا۔ وہ ان کی خدمت طب کی قدر نہ کر سکے اور شہر میں ان کے خلاف مہم چل پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

حکیم محمد ابراہیم صاحب کا مطب بیٹھ گیا۔ مریض بہت کم آنے لگے۔ شروع میں جو کمایا تھا اس سے ایک مکان مراد پور محلہ میں لے لیا تھا۔ وہ اس مکان میں اپنے مطب اور مدرسہ کے ساتھ منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مدرسہ کے کئی سالانہ جلسے بھی کئے۔ جس میں وہ اپنے طبی اسپتال کے کارنامے دکھا سکے۔ ایک جلسہ کی صدارت مسٹر عزیز بیرسٹر نے بھی کی تھی حکیم صاحب آزادی کے بعد تک اس مدرسہ طبیہ کو جو تصوراً باقی رہ گیا تھا، اپنے سینہ سے لگائے رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

جبتک راقم الحروف کے والدین گیا میں رہے، حکیم صاحب روزانہ بعد مغرب والد کے پاس آتے تھے اور عشاء کے بعد واپس جاتے تھے۔ اس وقت کچھ اور اہل علم بھی آجاتے تھے۔ کبھی تصوف پر کبھی تفسیر وحدیث پر کبھی فقہ پر کبھی طب یونانی پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ کبھی سیاسی بحثیں ہوتیں کبھی مثنوی مولانا روم پڑھی جاتی۔ حکیم صاحب بھی اس میں حصہ لیتے۔ رفتہ رفتہ حکیم صاحب ہمارے فیملی ڈاکٹر ہو گئے۔ ہم سب ان کے علاج سے مطمئن تھے۔ حکیم صاحب میں گروہی عصبیت بہت تھی۔ شہر کے حکیم تو ان کی مخالفت کرتے تھے لیکن وہ کسی حکیم کی مخالفت سننا پسند نہیں کرتے تھے اور ڈاکٹروں کی مخالفت کرتے تھے۔

ہم تین بھائی جامعہ میں پڑھنے لگے تھے۔ وہاں منجھلے بھائی کو ناک میں بدگوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے والد کو لکھا کہ "آپ اجازت دیں تو ان کا آپریشن کرا دیا جائے۔ والد نے لکھا کہ وہاں ہماری عدم موجودگی میں وہ آپریشن سے گھبرائیں گے چھٹیوں میں یہاں آئیں گے تو ان کا اپریشن کرا دیا جائے گا۔ منجھلے بھائی جب آئے تو رائے ہوئی کہ دو چار ماہ ہومیو پیتھک علاج کرا دیا جائے۔ چنانچہ علاج ہونے لگا۔ اس عرصہ میں ان کے ناک کے اوپر ریم آنے لگی۔ میڈیکل کالج پٹنہ میں دکھایا گیا تو کینسر تجویز ہوا۔ بھائی صاحب اس خبر کے ساتھ گیا واپس آئے۔ ہمارا گھر اداس تھا۔ والد مغموم تھے۔ حکیم ابراہیم صاحب حسب معمول مغرب کے بعد تشریف لائے اور دیکھا کہ سب اداس ہیں تو وجہ پوچھی یہ معلوم کر کے کہ ڈاکٹر نے کینسر تجویز کیا ہے، انہوں نے منجھلے بھائی کو بلایا، ان کا زخم دیکھا اور

کہا کہ ڈاکٹر جاہل ہیں۔ یہ سرطان نہیں معمولی زخم ہے اور میں لکھنؤ میں اس کا علاج کر چکا ہوں۔
والد صاحب کو یقین نہ آیا۔ اور انہوں نے حکیم صاحب کا مذاق اڑایا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ "اچھا
سنئے۔ آپ ان کو علاج کے لئے بھیجیں گے اس میں دو چار روز کی دیر تو ہوگی، اتنی مدت آپ میرے
علاج میں رہنے دیجئے۔ والد صاحب نے کہا" میں آپ کو ایک ہفتہ وقت دیتا ہوں۔ اب
حکیم صاحب نے علاج شروع کیا۔ ایک روز بیچ کر بھائی صاحب کو چار جلاب دیئے گئے۔
اس کے بعد انہوں نے لال رنگ کا مرہم لگانے کو دیا۔ اب بھائی صاحب اچھے تھے۔ اور ساری
زندگی ان کو اس کی شکایت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ تقریباً تیس برس زندہ رہے۔

دوسرا واقعہ ہمارے منجھلے ماموں کی لڑکی کا پیش آیا۔ اس کا ایک پاؤں گھٹنے کے نیچے
سڑ گیا تھا۔ اسپتال میں داخل کی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا پاؤں کاٹ دیں گے اور کوئی علاج نہیں ہے،
والد نے حکیم صاحب سے پوچھا، آپ علاج کر سکتے ہیں؟ حکیم صاحب نے کہا، پہلے اس کو دیکھ
لوں۔ دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کہا کہ اس لڑکی کو اسپتال سے لے آئیے۔ میں علاج کر سکتا
ہوں۔ پاؤں کاٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چنانچہ وہ لڑکی آئی، آپریشن ہوا اور اچھی ہو گئی
آپریشن کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب چیف میڈیکل افسر بھوپال گیا آئے اور والد سے
ملنے آئے۔ والد نے کہا کہ آئیے آپ کو ایک حکیم سرجن کا کمال دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے
آپریشن شدہ زخم دیکھ کر کہا معاذاللہ! یہ حکیم ہے یا جن۔۔ حکیم صاحب نے سڑے ہوئے
گوشت نکال لیئے تھے اور نسیں رہ گئی تھیں۔

تیسرا واقعہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کا ہے جو پاگل تھی۔ کہیں سے آکے پڑوس میں ٹھیر
جاتی اور بہت شور کرتی کہ ہم سب رات بھر سو نہیں سکتے تھے۔ والد نے حکیم صاحب سے کہا کہ
آپ اس کا علاج کر سکتے ہیں؟ حکیم صاحب نے جواب دیا۔ دو مضبوط آدمی لائیے جو اس کو پکڑیں
میں فصد دوں گا۔ انشاءاللہ اچھی ہو جائے گی۔ چنانچہ نظم کیا گیا اور عورت ہوش میں آگئی۔ اس
نے پھر کبھی شور نہیں مچایا۔ کپڑے بھی ٹھیک سے پہننے لگی اور اچھی ہو گئی۔

اس طرح کے کئی حیرت انگیز علاج دیکھے۔ نمونہ کے طور پر چند واقعات اوپر درج
لئے گئے۔

والد نے ان کے ساتھ شروع میں جو سلوک کیا تھا اس کا بدلہ وہ والد کی زندگی میں بھی دیتے رہے اور بعد میں بھی۔ میں رام گڑھ کانگریس میں شرکت کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا تم میرے ساتھ ٹھیرو۔ حکیم صاحب اپنا شفاخانہ لے کر رام گڑھ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ کو دیکھا تو کہا میرے ساتھ ٹھیرو۔ میں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو اطلاع دی کہ میرے والد کے ملنے والے ہیں وہ اپنے ساتھ ٹھیرنے کو کہہ رہے ہیں اس لئے آپ کے یہاں نہیں آؤں گا۔ رات کو تیز بارش ہونے لگی۔ حکیم صاحب کے دواخانہ کی چھت ٹپک رہی تھی۔ رات بھر حکیم صاحب مجھ کو بچانے کے لئے بدل بدل کر کئی لحاف ڈالتے رہے۔ خبر نہیں وہ رات کو سو بھی سکے یا نہیں، میں بہر حال پانی سے بچا رہا اور رات بھر سوتا رہا۔

سنہ ۴۶ء کے آخر میں گیا کے اس حصہ میں جہاں ہمارا مکان تھا سیلاب آگیا ہمارا مکان اور محلہ کے متعدد مکانات گر گئے۔ ہم صبح کو کرایہ کا مکان تلاش کر رہے تھے اور کوئی مکان نہیں مل رہا تھا۔ حکیم صاحب کو خبر ہوئی تو وہ ہمارے یہاں آئے اور والدہ کو پکار کر کہا کہ شاہ شریف صاحب سے ہمارے اتنے اچھے تعلقات رہے، آپ کرایہ کا مکان کیوں ڈھونڈ رہی ہیں؟ ہمارے یہاں آجائیے۔ چنانچہ والدہ نے مجھ سے کہا کہ تم اپنی دلہن کو لے کر ان کے یہاں چلے جاؤ۔ ہم سب بہت آدمی ہیں سب کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ روز کے لئے ہم تین چار جگہ تقسیم ہو جائیں تاکہ کسی پر بھاری نہ ہوں۔ چنانچہ میں اپنی اہلیہ کو لے کر ان کے یہاں ایک ماہ سے زیادہ رہا۔

آزادی کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ ہمارا قیام بھی گیا میں بہت کم رہا۔ پٹنہ میں گورنمنٹ طبیہ کالج عرصہ ہوا قائم ہو چکا تھا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ حکیم صاحب کے سینہ میں طبیہ کالج کے استحکام کی آرزو رہ گئی۔ ان سے آخری ملاقات ہوئی تو کہنے لگے طبیہ کالج گیا کا سالانہ جلسہ کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر محمود کو بلانا ہے۔ خطبہ استقبالیہ لکھا ہے۔ دیکھ لو ٹھیک ہے یا نہیں۔ پھر تو میرا گیا جانا نہیں ہوا۔ سنا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے ایک لڑکی اور ایک مکان چھوڑا تھا۔ انہی کے ہم نام ایک حکیم صاحب تھے جن کے لڑکے سے انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی کر دی تھی۔

مرحوم اپنے لئے پیر کی تلاش میں رہتے تھے۔ کسی پر ان کا دل نہیں جمتا تھا۔ ایک روز والد سے کہنے لگے کوئی پیر نہیں ملتا ہے۔ والد مرید تو کرتے نہیں تھے اس لئے مذاق کے طور پر بولے کہ مجھ سے مرید ہو جائیے۔ والد کے دونوں پاؤں میں درد رہتا تھا اس لئے حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آپ سے مرید ہوں گے تو آپ کا پاؤں دبانا پڑے گا۔ میں ایسا پیر چاہتا ہوں جو میرا پاؤں دبائے۔ والد نے برجستہ کہا "تب آپ شیطان سے مرید ہو جائیے"۔

حکیم صاحب کے تلامذہ میں جن کو میں جانتا ہوں کئی تو انتقال کر چکے۔ ایک حکیم عبدالعلیم صاحب زندہ ہیں۔ اسلام پور ضلع پٹنہ میں مطب کرتے ہیں۔

ہمارے بھتیجے حکیم ایوب عثمانی نے ایک روز مجھ سے کہا کہ بہار گورنمنٹ کے پرانے گزٹ میں انہوں نے دیکھا ہے کہ گیا میں کوئی طبیہ کالج تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے یہ طبیہ کالج قائم کیا تھا۔ اس لئے میں نے حکیم صاحب کا تذکرہ لکھ دیا۔ حکیم صاحب طبیب حاذق تھے۔ انہوں نے تنہا اپنی کوششوں سے کالج قائم کیا، رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کی یہاں تو خدمت کا صلہ گالیوں سے ملتا ہے۔ پھولوں کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔

منصور عرب

جنگ بلقان میں برطانیہ امریکہ اور روس، فرانس، اٹلی یونان وغیرہ اتحادیوں نے مل کر ترکوں کی مسلم سلطنت کو ختم کرنے کے لئے ایک سازش کی اور یہ طے کیا کہ ترکوں کی سلطنت ختم کر دیجائے تو اس کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لئے جائیں جن لوگوں نے اس سازش کو ناکام بنانے کی ناکام کوشش کی اور جان کی بازی لگادی ان میں انور پاشا خالدہ ادیب خانم مصطفےٰ کمال، پاشا اور طرابلس کے شیخ سنوسی نے کافی شہرت پائی۔

شیخ سنوسی قادری سلسلہ کے ایک بزرگ صوفی، ایک ہاتھ سے مئے توحید منہ سے لگائے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ سے کافروں کا پرچم گرانے کے لئے جہاد کر رہے تھے یہ کبھی اطالوی فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور کبھی برطانوی فوجوں کا۔

منصور عرب شیخ سنوسی کے ساتھ مغرب میں کسی طرف اطالوی فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کمک نہ ملنے کی وجہ سے شیخ سنوسی کے ساتھی مغلوب ہو گئے تو منصور عرب کہیں صحرا میں چھپ گئے۔ سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ایک درخت کی آڑ میں سگریٹ سلجھایا۔ سمجھا کہ درخت سے سگریٹ کی آگ دکھائی نہ دے گی اور وہ تفتیش کرنے والوں کی زد سے بچ جائیں گے لیکن وہ بچ نہ سکے۔ اطالوی فوجیوں کو آگ کی روشنی دور سے نظر آئی اور انہوں نے پہنچ کر ان کو گرفتار کر لیا۔

منصور عرب کا وطن اصلی بغداد تھا یعنی عراق۔ اتحادیوں نے جو حصے بخرے کئے تھے ان میں عراق کو برطانیہ کا حصہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے ان کو برطانوی رعایا قرار دے کر اٹلی والوں نے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ انگریزوں نے ان کو ہندوستان میں نظر بند کر دیا۔ وہ پہلے بمبئی لائے گئے۔ یہاں کا ایک لطیفہ انہوں نے سنایا تھا جو درج ذیل ہے۔

منصور عرب صاحب نے ایک شخص کو پان لگا کر بیچتے دیکھا۔ انہوں نے پان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ پان والے نے کہا کھا کر دیکھئے عرب صاحب! انہوں نے نہیں سمجھا تو اس نے اشارہ سے سمجھایا۔ عرب صاحب نے پان کے بیڑے کو منہ میں رکھ لیا۔ جب لعاب منہ میں بھر گیا تو انہوں نے پھیکا لعاب دیکھ کر گھبرائے اور سمجھے کہ خون ہے اور اس بدمعاش نے مجھ کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں وہ سب کچھ کہہ گئے اور پان والا ہنستا رہا۔ پان والے نے کہا آپ کو مار کر کیا کروں گا، آپ کے پاس کیا ہے؟ اس وقت کچھ لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے عرب صاحب کو سمجھایا اور پان کھا کر تھوک کر دکھایا۔ تب عرب صاحب کو اطمینان ہوا۔

منصور عرب صاحب پر پابندی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ جب وہ ایک شہر سے دوسری جگہ جانے لگیں تو پولیس کو خبر کر دیں۔ چونکہ مذہبی رجحان کے آدمی تھے، اس لئے انہوں نے ہندوستان کے مذہبی مرکزوں کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ کسی مشہور مدرسہ کو نہیں چھوڑا جہاں وہ نہ گئے ہوں۔

ان کو کہیں مدرسہ انوار العلوم گیا کے ایک سالانہ جلسہ کا اعلان مل گیا۔ انہوں نے سوچا چلو لگے ہاتھ اس کو بھی دیکھ لیں۔ چنانچہ وہ مدرسہ انوار العلوم گیا گئے۔ وہاں والد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ عرب صاحب کو اپنے یہاں لے آئے۔ میں ان دنوں عم پارہ پڑھ رہا تھا۔ مجھ کو ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ تبرکاً پڑھا دیں منصور عرب صاحب نے پڑھایا اور پڑھانے کے بعد کہا کہ اب اس بچے کو پورا قرآن پڑھا کر جاؤں گا۔ والد نے ان کو اپنے یہاں روک لیا اور میں نے ان سے قرآن پڑھا اور دہرایا اس کے بعد ان کو اجازت ملی کہ وہ اپنے وطن جا سکتے ہیں جانے سے پہلے انہوں نے میرے سر، سینہ اور قد کا ناپ لیا وجہ معلوم نہیں۔ ہم نے پوچھا بھی نہیں۔

ان دنوں بہار صوبہ میں تجوید سے واقف قاریوں کی بہت کمی تھی۔ غنہ اور قلقلہ وغیرہ کی رعایت تو کجا، حروف کے مخارج بھی صحیح نہیں ہوتے تھے حالانکہ مخارج کے بدل جانے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ والد شروع سے ایسے استاذ کے حوالہ ہم کو کرنا چاہتے

جن کے مخارج صحیح ہوں۔ میری پیدائش سے پہلے گیا میں پانی پت کے ایک قاری صاحب آ ئے تھے جن سے ہمارے ماموں ڈاکٹر زین العابدین صاحب اور گیا کے مشہور استاذ حافظ عبدالقدوس صاحب نے پڑھا تھا۔ بہت بوڑھے تھے۔ والدان کو اس زمانہ میں پچاس روپے ماہانہ اور پالکی کا خرچ دیتے تھے اور وہ ہماری بہن کو آکر پڑھاتے تھے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر زین العابدین صاحب کے ساتھ ندوہ بھیج دیئے گئے تھے اور انہوں نے لکھنؤ میں تجوید کی مشق کی اور بہت اچھا قرآن پڑھتے تھے۔ اور بہت اچھی آواز کے ساتھ خاندان میں لوگ بہت شوق سے ان کی تلاوت سنتے تھے۔ میری باری آئی تو مجھ کو منصور عرب صاحب مل گئے۔ وہ دن میں مجھ کو قرآن پڑھاتے اور رات کو مغرب اور عشاء کے درمیان اپنے جہاد کے قصے سناتے تھے۔

منصور عرب صاحب کی شہرت ہوئی تو بہت لوگوں نے ان سے قرآن کی تلاوت کے لئے اپنا اپنا تلفظ اور مخرج ٹھیک کیا۔ وہ بہت خوشی سے لوگوں کا قرآن سنتے اور درست کرتے اس کے بعد جو وقت ملتا شاہ ولایت حسین صاحب کے پاس بیٹھتے جو دیو بند کے فارغ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد تھے۔ ان کو شاہ ولایت صاحب کے پاس عربی میں گفتگو کرنے کی سہولت تھی۔

عرب صاحب کو والد نے بھی قرآن سنایا۔ سن کر بولے آپ ٹھیک پڑھتے ہیں۔ صرف ضمہ اور کسرہ مجہول پڑھتے ہیں لیکن اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔
بڑے بھائی ندوہ سے آئے تو انہوں نے بھی قرآن سنایا لیکن بھائی صاحب تو بہت اچھا پڑھتے تھے۔ کسی اصلاح کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انھوں نے بھائی صاحب سے کہا کہ میں ہندوستان کے تمام مدارس کو دیکھ چکا ہوں۔ دین دیوبند کے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ دین حاصل کرنا ہے تو تم دیوبند جاؤ۔ یہ بات بھائی صاحب کے دل میں لگ گئی اور بالآخر وہ دیوبند چلے گئے۔ لیکن دیوبند میں ان کی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ اور دہلی آکر مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔

منصور عرب صاحب غالی حنفی تھے اور حنفی مسلک پر شدت سے عمل کرتے تھے۔

غیر قاری کے پیچھے نہ خود نماز پڑھتے اور نہ ہم کو پڑھنے دیتے۔ کہتے نماز ہی نہیں ہوتی ہے۔ پانچ وقت ہم سے گھر پر اذاں دلواتے اور جماعت کرتے۔ خود نماز پڑھاتے اور جمعہ کو محلہ گھسیانڈلہ کی مسجد میں ہم سب کو لے جاتے۔ وہاں لکھنؤ کے پڑھے ہوئے ایک قاری صاحب امام تھے۔ ان کے پیچھے ہم سب جمعہ کی نماز پڑھتے۔ شہر کی کسی اور مسجد کی جماعت میں شرکت سے منع کرتے کیونکہ ان میں "ہندوستانی" قرارت ہوتی تھی۔

والد ان سے کہتے تھے ہندوستان میں ہر شخص اسی طرح پڑھتا ہے۔ عموم بلوی ہے اس لئے کہاں تک پرہیز کیا جائے لیکن وہ اس استدلال کو نہیں مانتے تھے۔

ہماری نمازوں کی درستگی کی بھی ان کو بہت فکر تھی۔ ہم سنتیں پڑھتے تو کھڑے رہتے جو غلطی ہوتی اس کو درست کرتے۔

والد کو رائفل کا لائسنس ملا تو خریدنے کے لئے وہ منصور عرب صاحب کو ساتھ لے گئے اور انہیں کی پسند سے رائفل خریدی۔ انگریزی حکومت کے خلاف تو تھے ہی لیکن گاندھی جی کے اہنسا کو نہیں مانتے تھے۔ کہتے تھے انگریز لوٹ سے سدھ جائیں گے۔ ہم سب کو انگریزوں کے خلاف پایا تو انہوں نے والد کو بم بنا کر بتایا۔ ہم سب ہٹا دیئے گئے تھے۔ عرب صاحب کی خاطر سے والد نے دیکھ بھی لیا اور ایک بم جو بنا تھا اس کو رکھ لیا لیکن ان کے جانے کے بعد والد نے اس بم کو ضائع کر دیا کیونکہ کانگریس کی سول نافرمانی شروع ہو گئی تھی۔ تلاشیاں زوروں سے ہو رہی تھیں۔ اور ہم سب کانگریس کے حامی تھے۔

منصور عرب صاحب چلے گئے تو ہم دہلی گئے۔ پھر واپس آ گئے۔ کئی سال بعد ان کو پھر گیا میں دیکھا۔ راستہ ہی میں ملاقات ہو گئی۔ میں نے پہچانا اور سلام کیا لیکن وہ نہ پہچان سکے۔ میں بڑا ہو چکا تھا۔ بولے محمد کہاں ہیں۔ میں نے کہا میں ہی محمد ہوں۔ وہ متعجب ہوئے۔ میں نے دریافت کیا آپ بغداد سے کب آئے۔ انہوں نے غالباً سال بھر کا عرصہ بتایا۔ میں نے کہا آپ سال بھر سے کہاں ہیں۔ بولے جون پور میں قرارت کا مدرسہ کھولا ہے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔

خلیل عرب

شاید خلیل عرب کے دادا عرب سے آئے تھے۔ خود لکھنؤ یونیورسٹی اور ندوہ میں عربی ادب کے استاذ تھے۔ پھر بھوپال میں قیام ہوا۔ کہتے تھے کہ میں عربی زبان کی اشاعت چاہتا ہوں۔ جو چاہے بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ عربی پڑھے۔ ولیۂ عہد بھوپال عابدہ بیگم کو قرآن پڑھاتے تھے اور ان کی بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ لکھنؤ کی شستہ زبان میں بات کرتے تھے۔ میرے یہاں اکثر آجاتے تھے۔ عربی زبان سکھانے کے لئے اپنی لکھی ہوئی ریڈریں چھپوائی تھیں جو مجھ کو دی تھیں۔ ان کی بڑی لڑکی رقیہ بیگم مرحومہ کی کتاب "تعمیر انسانیت" تھی وہ بھی مجھے دی تھی۔ دونوں کتابیں میری لائبریری میں موجود ہیں۔ تعمیر انسانیت پر سید سلیمان ندوی صاحب کا مقدمہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں یہی ایک نشان ملتا ہے کہ ایک خاتون علوم اسلامیہ کی باقاعدہ عالمہ ہے۔ بھوپال شہر میں رقیہ بیگم کی تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ اور سننے کے لئے بہت سی خواتین جاتی تھیں۔ خلیل عرب سخت اہل حدیث تھے۔ امام ابو حنیفہ کی شان میں ایسی بات بھی بول جاتے جو ناگوار لگتی۔ دیوبند کے بارے میں کہتے تھے کہ وہاں حدیث کی تعلیم نہیں ہوتی ہے بلکہ حدیث کا دورہ ہوتا ہے جیسے مرگی وغیرہ کا دورہ ہو۔

ایک روز میرے یہاں آئے تو بڑے بھائی کا بچہ کھڑا تھا، جو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ انہوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا یوسف اختر۔ انہوں نے کہا: لاحول ولاقوۃ کیا حمیدی لال کے قاعدہ سے نام رکھا ہے۔ 'یوسف' خود بہت پیارا نام ہے ان کو بتایا گیا کہ اس کا نام یوسف ہے۔ اختر ملانے سے اس کی پیدائش کی تاریخ نکلتی ہے

اس نے آپ کو بتادیا تاکہ آپ اس کی عمر نہ پوچھئے، خود حساب کر لیجئے۔

بہر حال عقیدہ ہماری محبت میں حائل نہیں تھا۔ ہمارے لئے یہ بہت بڑی بات تھی کہ وہ عالم دین ہیں، قرآن کا درس دیتے ہیں۔ عربی زبان کی اشاعت کرتے ہیں۔ میں بھی کبھی کبھی ان پر اعتراض کرتا تھا جس کا وہ برا نہیں مانتے تھے۔ ہنس کر جواب دیتے تھے۔ ایک روز ولیہ عہد عابدہ بیگم کی جو بڑی بیبا کہلاتی تھیں دینداری کی تعریف کرنے لگے تو میں نے پوچھا کہ پردہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کوئی شک نہیں کہ بڑی بیبا بہت اچھی عورت تھیں لیکن ان کا بے پردہ رہنا اور مردوں کی شکل اختیار کرنا مجھ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خلیل عرب ہنسے اور بولے "رموز مملکت خویش خسرواں دانند"

پاکستان بنا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان کا بھروسہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کا یہاں رہنا مشتبہ ہے۔ بھاولپور بہت اچھی جگہ ہے۔ وہاں چلے چلو۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ رہوں گا، ان کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا تو خاموش ہو گئے

بہر حال وہ پاکستان چلے گئے۔ مکہ آنے کے بعد میری اموں زاد بہن جواب میری بہو ہے کہنے لگی مدرسہ میں ایک استانی آتی ہیں جن کو سب ہندیہ کہتے ہیں، ان کا نام رقیہ ہے۔ میں نے بتایا کہ وہ تو عرب ہیں۔ ان سے کہو بیگم عبدالصمد آئی ہوئی ہیں آپ کو سلام کہتی ہیں۔ انکو سلام پہنچا تو انہوں نے کہا کہ موقعہ نکال کر ملوں گی لیکن دونوں کی باہم ملاقات نہیں ہو سکی اور دونوں کا انتقال ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ خلیل عرب کی دوسری لڑکی کراچی یونیورسٹی میں عربی کی چیرمین ہیں۔ ان کا نام ہے عطیہ بنت خلیل عرب۔

مولانا عبدالرشید محمد مسکین

یہ بزرگ شاہ یعقوب صاحبؒ مجددی کے والد سے مرید تھے۔ بہت سادہ بے تکلف شریعت کے بڑے پابند، دعوت دین کے حریص، سب سے محبت سے ملتے تھے، نرمی سے بات کرتے تھے لیکن اصلاح کا موقع ہوتا تو چوکتے نہ تھے۔ کسی وعظ کی مجلس میں بلایا جاتا تو ضروری کام چھوڑ کر آجاتے، کہتے "ڈرتا ہوں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو دین کا علم دیا تھا، لوگ تم سے دین سیکھنے کو جمع ہوتے تھے تو تم نہیں آتے تھے" غذا اور رہنا سہنا دونوں بہت معمولی، صحت بھی کمزور تھی، لیکن دین کے لئے بہت جوان تھی۔ ان کے گھر کی عورتوں سے ہماری بہن کی ملاقات ہوگئی تھی اور بہن ان کے یہاں کی عورتوں کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ انھوں نے ایک سبق آموز واقعہ سنایا "بہار میں ناشتہ اسی قدر پرتکلف ہوتا ہے جس قدر پرتکلف دوپہر اور رات کا کھانا۔ چنانچہ بھوپال میں بھی ہمشیرہ کے یہاں بہاری قسم کا ناشتہ ہوتا تھا ایک روز مولانا مسکین صاحب کے یہاں سے عورتیں آئیں، کہنے لگیں تمہارے یہاں نوکرانیوں کو کسی وقت فرصت نہیں ملتی، آخر ان کا بھی تو حق ہے، ان کو اپنا سر جھاڑنا ہے، کپڑے دھونا ہے غسل کرنا ہے، تم ہر وقت کھانا پکواتی ہو تو وہ اپنا کام کب کریں گی۔ چائے بسکٹ وغیرہ ہلکا پھلکا ناشتہ کر لیا کرو اور دو وقت کھانے پکواؤ"

مولانا محمد مسکین گھر میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے، بازار سے سودا لاتے، ہر وقت اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، قرآن تلاوت فرماتے حافظ قرآن تھے، اسی وقت خاموش ہوتے جب سونے کا وقت ہوجاتا یا کوئی ملاقات کے لئے آتا، لیکن جو آتا وہ مولانا سے دین کی باتیں سنتا، اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرتے، نمازیں جماعت سے

مسجد میں پڑھتے تھے، مجھ سے مسجد کی حاضری میں کوتاہی ہوتی تھی تو برابر محبت سے سمجھاتے تھے مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب کی کتاب مسئلہ امارت اور کتاب العشر والزکوٰۃ پڑھی تو کہنے لگے کہ اتنی اہمیت کے ساتھ یہ مسئلہ میرے سامنے نہیں آیا تھا، کیا کروں کس کو اپنا امیر بناؤں۔ میں نے کہا بھوپال میں تو امیر بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو والی کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد تبلیغی جماعت کا کام شروع کیا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کو بلایا۔ مفتی صاحب کی پر مغز تقریر نے ان کے کام میں بڑی آسانی پیدا کی۔

مولانا نے تبلیغ کا کام عورتوں میں بھی شروع کیا۔ انجینئر صاحب کی (غالباً حمایت علی خاں نام تھا) دو لڑکیاں جو کالج میں پڑھتی تھیں، مولانا کی تبلیغ سے متاثر ہوئیں اور انھوں نے مولانا سے دینیات پڑھنا شروع کیا اور تبلیغ شروع کی دیکھتے دیکھتے بھوپال کی عورتوں میں اچھا خاصا کام ہونے لگا۔ میری بہن بھی تبلیغ میں ان کے ساتھ ہو گئیں حتی کہ عورتوں کا تبلیغی اجتماع میری بہن کے یہاں ہی ہونے لگا تھا۔

بعد میں مولانا عمران خاں صاحب نے تبلیغ کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ان کی نگرانی میں بڑے پیمانے پر کام ہونے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم بھوپال چھوڑ رہے تھے۔

ایک بار ایک میت کی نماز جنازہ میں مولانا مسکین کے ساتھ شریک ہوا۔ نماز سے پہلے مولانا مسکین صاحب نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اکثر دیہاتوں میں لوگ میت کو بلا نماز جنازہ دفن کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ کا طریقہ نہیں معلوم۔ اس طرح تمام مسلمان گنہگار ہوتے ہیں۔ ان کو بتا دیا جائے کہ نماز جنازہ میں صرف چار تکبیریں فرض ہیں۔ جنازہ سامنے رکھ کر صف بنا کر چار دفعہ تکبیریں کہہ دی جائیں پھر سلام پھیر لیں تو نماز جنازہ ادا ہو جائے گی اور مسلمان گنہ گار نہیں ہوں گے۔ یہ اس صورت میں کہ کوئی پڑھا لکھا مسائل سے واقف مسلمان دیہات میں نہ ہو۔

مولانا کی صاحبزادی کا نکاح تھا۔ نکاح تو مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے پڑھایا لیکن نکاح سے پہلے مولانا مسکین صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہر مسلمان پر فرض ہے

کہ وہ کلمہ طیبہ کا اقرار دل سے بھی کرے اور زبان سے بھی شہادت دے۔ آپ حضرات گواہ رہیں کہ میں اللہ کو ایک مانتا ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول"

بھوپال میں جمعیۃ علماء کے قیام کے لئے جلسہ تھا مولانا بھی مدعو تھے کہنے لگے اس میں ایک دفعہ رکھئے کہ جمعیۃ علماء کا ہر رکن نہ صرف یہ کہ خود نماز پڑھے بلکہ دوسروں کو بھی نماز پڑھنے کی ترغیب دے اور اپنی کوششوں کی رپورٹ ہر ہفتہ جمعیۃ علماء کو دیا کرے۔ مولانا کو کہا گیا کہ جو دفعات جمعیۃ علماء ہند کی ہونگی وہی دفعات جمعیۃ علماء بھوپال کے لئے بھی ہوں گی۔ مولانا نے جواب دیا معلوم کریں جمعیۃ علماء ہند میں ایسی کوئی دفعہ ہے یا نہیں، اگر نہ ہو تو جمعیۃ علماء ہند کے دستور میں اس طرح کے دفعہ کا اضافہ کرائیے۔ ویسے مولانا اکابر جمعیتہ علماء ہند کے مداح اور معتقد تھے۔

پیر بشو میاں عرف دُرّا شاہ

نوجوان صوفی، کمسنی ہی میں مولانا یعقوب صاحب مجددی کے والد یعنی پیر ابو احمد صاحب مجددی سے مرید ہوئے تھے۔ پھر مدینہ منورہ کے کسی شیخ سے اجازت خلافت حاصل کی، برابر حج کرتے تھے۔ حج کو جاتے دوسرے سال کا حج کر کے واپس آتے تھے، ایک سال کے بعد پھر حج کو جاتے، ماں تھیں اور خود تھے۔ جب میں نے بھوپال چھوڑا تو انھوں نے شادی کی۔ معلوم ہوا کہ اس سے ایک بچہ ہے۔ جب تک بھوپال میں رہتے بندوق تلوار، خنجر اور دُرّا سب لگا کر چلتے، لباس عربی تھا، اسی ہیئت کی وجہ سے مجھ کو شوق ہوا کہ ان سے ملوں پھر وہ برابر مجھ سے ملتے رہے اور مجھ سے محبت کرنے لگے۔ یہ بھی حافظ قرآن تھے، شب بیدار تھے، خود تو کوئی تقریر نہیں کرتے تھے لیکن شہر میں کوئی عالم، واعظ آجاتا تو محلہ محلہ اس کی تقریریں کراتے دن کو بھی اور رات کو بھی۔ اور یہ سلسلہ مہینہ بھر چلتا رہتا۔ مسائل دینیہ سے واقف تھے، ایک یا دو مکان تھے جن کا کرایہ آتا تھا، مزید یہ کہ ٹوپیاں بنا کر سفر حضر دونوں حال میں بیچتے تھے۔

اذان ہوتی تو کسی مسجد کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ مسلم راہ گیروں میں جو نمازی نہیں معلوم ہوتے تھے، ان کو پکڑتے اور مسجد چلنے کو کہتے، اگر عذر کرتا کہ کپڑے غیر طاہر ہیں تو کہتے مسجد کے غسل خانہ میں جا کر غیر طاہر حصہ کو دھولو، کبھی کبھی دُرّا سے مار بھی بیٹھتے۔ ہندوستان کی دوسری خانقاہوں میں بھی جاتے اور بالخصوص صبح کی نماز میں رات دیر تک قوالی سننے والوں کو جگاتے۔

ہمارے ایک بزرگ سے فردوسی سلسلہ کی اجازت لی تھی، جب وہ بھوپال آئے اور وطن واپس ہونے لگے تو انھوں نے ہمارے بزرگ سے کہا کہ میں ریل پر اٹارسی اسٹیشن تک آپ کے ساتھ چلوں گا، ہم اسٹیشن پہنچے تو وہ نہیں تھے، ہمارے

بزرگ ڈبے میں بیٹھ گئے اور گارڈ نے سیٹی بھی دے دی تو پہنچے۔ میں نے کہا بیٹھ جائیے، بولے ٹکٹ لے لوں، میں نے کہا گاڑی چھوٹ جائے گی، بولے نہیں چھوٹے گی پھر اپنا سامان پلیٹ فارم پر رکھ کر ٹکٹ لینے چلے گئے۔ ادھر گاڑی چلی اور پھر رک گئی یہاں تک کہ وہ آکر بیٹھ گئے تب گاڑی روانہ ہوئی۔ مختلف ضرورتوں کے موقعہ پر مجھے اہم دعائیں بتلاتے جن کا فائدہ محسوس ہوا۔

میں جب پٹنہ آگیا تو ایک روز میرے یہاں پہنچ گئے۔ میں نے دریافت کیا کہ پتہ آپ کو معلوم نہ تھا، کیسے آگئے؟ انھوں نے جواب دیا کہ پٹنہ اسٹیشن کے پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اس طرح کے آدمی بھوپال میں رہتے تھے اب پٹنہ میں ہیں محمد عثمانی نام ہے کوئی صاحب پتہ جانتے ہوں تو بتادیں۔ امام صاحب نے کہا میں جانتا ہوں اس کے بعد امام صاحب نے رکشہ والے کو پتہ بتا دیا اور کہا کہ ان کو لے جاؤ۔ میں نے کہا میں آج ہی دیہات سے آیا ہوں، کاشتکاری شروع کر دی ہے۔ آج دیہات سے آنا بھی شاید آپ کی کرامت ہے، ورنہ ملاقات نہیں ہوتی، کہنے لگے میں دیہات آجاتا لیکن یہ کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم مکہ چلے جاؤ۔ جب بہت زمانے کے بعد میں مکہ آیا تو میں نے محسوس کیا کہ جس وقت پیر بشیر نے مجھ سے کہا تھا، اس وقت مکہ معظمہ آجاتا تو میرے لئے دنیادی ترقی کی راہیں بھی کافی کھلتیں۔

جب کاشتکاری میں ناکام ہونے کے بعد میں دفتر امارت شرعیہ میں کام کرنے لگا تو یہ پھلواری شریف بھی پہنچ گئے، بولے یہ کام بہتر ہے، لیکن اس میں تمہارے دشمن بہت ہونگے تم اللّٰھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذ بك من شرورھم برابر پڑھا کرو۔ انھوں نے مجھ کو اس موقعہ پر ایک عبا اور راحد پہاڑی کے چمکدار پتھر بھی بطور تحفہ کے دیئے تھے۔

•• معلوم ہوا کہ ایک سفر حج میں طائف سے مکہ معظمہ آتے ہوئے موٹر کے حادثہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سید فضل الرحمن بلال

حکیم سید فضل الرحمن بلال آبگلہ (گیا) کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد نے کلکتہ سے میڈیکل تعلیم حاصل کی تھی اور طب یونانی دہلی میں حکیم اجمل خاں کے والد سے پڑھا تھا۔ اس طرح حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے۔ اپنی اہلیہ کو بھی خود معالجہ کی تعلیم دی تھی۔ وہ زنان خانہ میں رہ کر علاج کرتی تھیں اس لئے حکیم فضل الرحمن صاحب کا گھریلو ماحول طبی تھا۔ اس کے علاوہ ان کے والد بہت اچھے صوفی تھے۔ تھے تو وارثی۔ ہمیشہ گروا رنگ کے احرام میں رہتے تھے۔ لیکن صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ محرمات سے بچتے تھے۔ طبی ذریعہ سے لوگوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔

حکیم فضل الرحمن پٹنہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے۔ کالج میں تھے کہ جنگ بلقان کا زمانہ شروع ہوا۔ مسلمانوں میں ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کا جوش پھیل گیا۔ جلسے ہونے لگے۔ نعرے لگنے لگے۔ ولایتی یعنی انگریزی کپڑے جلائے جانے لگے۔ نوجوان طلبہ بھی گرم تھے۔ حکیم فضل الرحمن بھی انہیں میں تھے۔

کالج میں مسلمان لڑکے اذاں دے کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ پرنسپل نے حکم دیا کہ اذاں نہ دی جائے۔ اس سے انگریزوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، مسلمان لڑکوں کو بہت غصہ آیا۔ حکیم فضل الرحمن سب سے آگے تھے۔ انہوں نے حکم کی پرواہ نہ کی اور اذان دے دی۔ پرنسپل نے ان کو نکال دیا۔ اس زمانہ میں کسی کالج یا کسی اسکول سے کوئی لڑکا نکالا جاتا تھا تو اس کا ملک میں کہیں داخلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح حکیم فضل الرحمن کی انگریزی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بہر حال اس واقعہ کے بعد وہ پٹنہ سے اپنے وطن گیا آئے۔ یہاں ان کا شاندار استقبال

ہوا قاضی احمد حسین صاحب نے ان کو بلال کہہ کر پکارا۔ یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا نام فضل الرحمٰن تھا۔ خود انہوں نے بھی اپنا تخلص بلال رکھا۔

حکیم صاحب کچھ عرصہ خلافت تحریک میں کام کرتے رہے اس کے بعد حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ طبیہ کالج دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے کامل طب و جراحت کی ڈگری لی جو ماسٹر آف میڈیسن اینڈ سرجری کے برابر تھی۔ سنتے ہیں حکیم اجمل خاں کے یہاں انہوں نے نبض شناسی کی مشق بھی کی تھی

فراغت کے بعد وہ گیا آ گئے۔ اب وہ حکیم بلال تھے۔ انہوں نے گیا میں مطب شروع کیا فیس بہت معمولی رکھی اور نسخہ بہت سستا۔ مقبول ہوئے اور لوگ علاج کے لئے رجوع ہونے لگے۔

اس زمانہ میں حکیم بلال صاحب کا راقم الحروف کے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ ان کی سیاسی واقفیت بہت اچھی تھی۔ ادب کا ذوق تھا۔ اردو مضامین بھی بہت اچھے لکھتے تھے۔ اشعار بھی اچھے کہتے۔ اشعار مقصدی، قومی اور مذہبی ہوتے تھے۔ ان کی ایک گیت کے چار مصرعے مجھ کو یاد ہیں:

" اری اوری سکھی مری بات سنو پیا جاتے ہیں رن کو میں اب کیا کروں
گھر ہی بیٹھی ہوں دکھڑا رویا کروں کہ میں بھی سپاہی کا پیشہ کروں
مثل خولہ کبھی جو ضرورت پڑے شہسوارانہ میداں میں آیا کروں
دشمنوں کے صفوں کو الٹ پھیر کر تیغ کا اپنے جوہر دکھایا کروں "

حکیم صاحب میرے یہاں آتے تو نیشنلسٹ لیڈروں کے حالات مجھ کو سناتے۔ حسرت موہانی سے بہت متاثر تھے۔ میں مضامین لکھتا تو کبھی کبھی ان کو دکھاتا تھا۔ وہ مناسب اصلاح کر دیتے تھے۔ مجلس احرار نے تحریک کشمیر شروع کی تو وہ بہت جوش میں تھے۔ انہوں نے ایک روز جمعہ کے بعد مسلمانوں کو روکا اور ان سے مجلس احرار قائم کرنے اور کشمیر رضاکار بھیجنے کے لئے کہا کشمیر کی سرحد پر انگریزی فوج کھڑی تھی اور وہ کشمیر جانے والے رضاکاروں کو گرفتار کر لیتی تھی۔ اس طرح یہ لڑائی انگریزوں سے ہو رہی تھی۔ جامع مسجد کے امام صاحب اور ان کے رفقاء کے تعلقات حکام سے تھے اس لئے وہ انگریز مخالف تحریک کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حکیم بلال صاحب نے پہلے سے کوئی مشورہ بھی نہیں کیا تھا کہ ہم خیال حضرات ان کی مدد کے لئے پہلے سے اکٹھے رہتے۔ ان کی مخالفت

شروع ہوئی تو حکیم صاحب اکیلے تھے۔ لیکن ہم چند لوگ وہاں نماز میں تھے۔ ہم نے جلد جلد اپنی طاقت کو مجتمع کیا اور بڑے بھائی نے حکیم صاحب کی حمایت میں زبردست تقریر کی۔ مخالفوں کو محسوس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہیں تو ڈھیلے پڑ گئے۔ مجلس احرار بن گئی اور کام شروع ہو گیا۔ مجلس احرار اسلام گیا کی طرف سے رضاکاروں کا ایک دستہ بھی گیا۔

ایک روز مرکزی مجلس احرار کا ایک سرکلر آیا کہ ہر جگہ انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی شروع کردی جائے۔ مجلس احرار توڑ دی جائے اور ڈکٹیٹر مقرر کر دیئے جائیں۔ ڈاک میرے یہاں آتی تھی۔ اور حکیم صاحب روز تشریف لے آتے تھے۔ اس روز وہ آئے تو سرکلر پڑھ کر مشورے کرنے لگے اتنے میں قاضی محمد حسین صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو ڈکٹیٹر بنا دو۔ چنانچہ مجلس احرار توڑ دی گئی اور قاضی محمد حسین صاحب ڈکٹیٹر بنا دیئے گئے۔ میں نے اور حکیم بلال صاحب نے مل کر ٹمٹم پر بیٹھ کر اعلان کیا کہ قاضی محمد حسین صاحب کے حکم سے فلاں جگہ جلسہ ہے۔ ان دنوں کانگریس کی سول نافرمانی چل رہی تھی۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ کلکٹر صاحب نے قاضی صاحب کو بلایا اور ان کو بہت سمجھایا کہ جلسہ نہ کریں۔ اس سے کانگریس کو فائدہ ہوگا لیکن وہ نہ مانے اور جیل بھیج دیئے گئے۔

کچھ عرصہ بعد حکیم بلال صاحب نے احرام نما کپڑے پہننا شروع کیا۔ مجھ سے کہنے لگے درزیوں کی خوشامد سے آزادی ہو گئی ہے۔

علاج کے سلسلہ میں وہ مجھ کو بتاتے تھے کہ حتی الامکان غذائیں تبدیل کر کے مرض کا علاج کرنا چاہئے۔ جب اس سے فائدہ نہ ہو تب دوا کھانی چاہئے۔ ان کے شوق دلانے پر میں نے مختلف غذاؤں کے فوائد کا مطالعہ شروع کیا۔ اس سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا اور مجھ کو ڈاکٹر یا حکیم کی بہت کم ضرورت ہونے لگی۔

میں نقیب میں ایڈیٹر تھا تو ان سے قلمی معاونت کی درخواست کرتا تھا اور وہ کوئی نہ کوئی نعت لکھ کر بھیج دیتے تھے۔

ان کے چھوٹے بھائی مولانا حکیم محمد طہٰ کمال ندوی نے طبیہ کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ میں استاذ رہے۔ اردو فارسی اور عربی میں شاعری کرتے ہیں۔ بہار میں عربی کے واحد شاعر ہیں۔ ان کی عربی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے ان کو صدر جمہوریہ کا انعام بھی مل چکا ہے

انہوں نے اپنے بھائی حکیم بلال صاحب پر اردو میں ایک نظم لکھی ہے جو درج ذیل ہے۔

حکیم بلال صاحب کا انتقال ۹ رمضان ۱۳۸۹ھ کو ہوا۔

خدمت خلق تھا شعار ان کا — اور عشق و ولا وثار ان کا
دل میں لوگوں کے ان کی عزت تھی — سب کی نظروں میں اعتبار ان کا
ان کے سارے اصول تھے زریں — عہد و پیماں تھا استوار ان کا
وارثی تھے وہ یاد آتا ہے — بوذری فقر با وقار ان کا
وہ ازار و ردا میں رہتے تھے — اور احرام شاندار ان کا
تھے حذاقت میں مثلِ اجمل خاں — حسن تشخیص اشتہار ان کا
فیس تھی ایک روپیہ ان کی — دل کے شاہوں میں تھا شمار ان کا
ان کو کتنے مریض روتے ہیں — ہے وہ خلق شاندار ان کا
ان کے نسخوں کے قدرداں لاکھوں — پر ہے احسان سو ہزار ان کا
طب وہ دہلی سے پڑھ کے آئے تھے — حاذقوں میں ہوا شمار ان کا
تھے وہ تلمیذ حضرت اجمل — ہاتھ نباض پائیدار ان کا
پٹنہ کالج میں وہ بلال سبنے — ہے یہ قصہ بھی پر وقار ان کا
تھے وہ شوق جہاد میں کامل — قلب جن پر رہا نثار ان کا
مر کے ہم سایۂ شہید ہوئے — آج روشن ہے کیا مزار ان کا
ہیں وہ آغوش رحمت حق میں — خلد ہے باغ پر بہار ان کا

مرثیہ آہ کیا کمال لکھے
خون رلاتا ہے وہ پیار ان کا

جب راقم الحروف اور وہ مجلس احرار کے جلسہ کا تمتم پر اعلان کر رہے تھے تو انہوں نے اپنا قصہ سنایا تھا۔ وہ کالج سے اذان دینے پر نکالے گئے اور گیا آئے تو خلافت کمیٹی کا کام شروع کیا۔ ایک روز ان سے کہا گیا کہ خلافت کمیٹی کا اشتہار جاکر شہر کی دیواروں پر چسپاں کر آؤ۔ انہوں نے کہا کالج سے تازہ تازہ نکل کر آیا تھا، اپنی بڑائی کا

سا بہت احساس تھا۔ بہت برا معلوم ہوا۔ اتنے میں قاضی احمد حسین صاحب آگئے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے قصہ سنایا اور کہا کہ یہ لوگ مجھ کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا یہ لوگ بے وقوف ہیں۔ قاضی صاحب نے اشتہارات کو گاڑی پر رکھا جس کو ہاتھ سے ٹھیلتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں انھوں نے کہا چلو۔ میں ساتھ ہو گیا۔ اب گاڑی کبھی وہ ٹھیلتے اور کبھی میں۔ درمیان میں رک جاتے اور اشتہار میں لئی لگاتے اور میں دیواروں پر چپاں کرتا جاتا تھا۔ اس طرح ہم دونوں نے شہر میں اشتہارات چسپاں کر دیئے اس کے بعد سے مجھ کو کوئی جائز کام برا نہ لگتا۔

خواجہ عبدالحیٔ صاحب

۱۹۲۵ء میں جب میں جامعہ ملیہ کا طالب علم تھا تو خواجہ عبدالحیٔ صاحب جامعہ ملیہ میں تفسیر کے استاذ تھے، لیکن وہاں میں بچوں کے دارالاقامہ میں تھا۔ اور خواجہ صاحب بڑے لڑکوں کو تفسیر پڑھاتے تھے، اس لئے ان سے زیادہ قربت نہ ہو سکی۔ خواجہ صاحب سے میرا ربط اس وقت ہوا جبکہ مجھے جامعہ کو چھوڑے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا اور میں اس وقت روزانہ "استقلال" کا ایڈیٹر تھا۔ خواجہ صاحب جامعہ کے کاموں سے کلکتہ آتے اور دفترِ ہمدردانِ جامعہ میں قیام فرماتے جہاں میں پہلے سے مقیم تھا۔ خواجہ صاحب سے اس وقت کافی استفادہ کا موقعہ ملتا۔ خواجہ صاحب مختلف مجلسوں میں بعض تفسیری نکات نماز اور اس کے مختلف ارکان کے فائدے اور فقہی باریکیاں اپنی گفتگو میں بتاتے رہتے، یہی نہیں بلکہ علمائے اسلام کی انقلابی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے اور ان کا تعارف کراتے نیز مختلف اہم اور کل ہند شخصیتوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پیش کرتے رہتے۔

خواجہ صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ اور دیوبند کے فاضل تھے۔ مولانا عبداللہ سندھی کے شاگرد تھے، چنانچہ جب شیخ الہند گرفتار کر کے مالٹا لائے گئے اور مولانا عبیداللہ سندھی کابل چلے گئے تو حکومت نے ان کو لاہور میں نظربند کر دیا تھا، ان کے ساتھ مولانا احمد علی صدر انجمن خدام الدین بھی نظربند تھے، جو مولانا سندھی کے داماد تھے۔ خواجہ صاحب نظربندی سے پہلے مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" میں شریک ادارت بھی رہ چکے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی، عبداللہ عمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی صاحبان وغیرہ بھی "الہلال" میں کام کرتے تھے۔ خواجہ صاحب جامعہ ملیہ

چلے گئے اور وہاں کے ہو رہے۔ جامعہ کے قیام کے زمانے میں سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران کی انھوں نے بہترین تفسیریں لکھیں، جو اب بازار میں نہیں ملتی ہیں۔ جب پاکستان بنا تو آبائی وطن اسی طرف تھا۔ اس لئے اپنے وطن چلے گئے اور پاکستان ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

خواجہ صاحب کی علمی صلاحیت بہت اچھی تھی جس میں مولانا آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی کی صحبتوں نے جلا پیدا کر دی تھی۔ آخر وقت تک آزادی کے حامی اور مسلم لیگ سے دور رہے، جنگ آزادی میں کئی بار جیل بھی گئے تھے۔ مذہبی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، میں خواجہ صاحب کے ساتھ مولانا آزاد سے ایک بار ملا تھا، جس کا تذکرہ میں نے مولانا آزاد پر اپنے مضمون میں کیا ہے۔ خواجہ صاحب سے کلکتہ کے علاوہ پٹنہ، سہارن پور، اور دیوبند میں بھی ملاقاتیں رہیں۔ خواجہ صاحب سے میرے خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی تعلقات تھے، مثلاً قاضی محمد حسین صاحب، ڈاکٹر زین العابدین صاحب ندوی اور ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب۔ کاش خواجہ صاحب کی دونوں مذکورہ تفسیریں پھر شائع کی جا سکتیں۔

شاہ عمیر مرحوم

شاہ صاحب کا وطن ارول ضلع گیا تھا۔ یہ چار بھائی تھے۔ چاروں نشہ آزادی میں سرشار تھے۔ بڑے بھائی مسٹر زبیر بیرسٹر تھے۔ یہ مونگیر میں رہ گئے تھے۔ اولا مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین ہوئے۔ پھر کانسل آف اسٹیٹ کے ممبر ہوئے۔ خلافت تحریک میں آئے اور گرفتار ہوئے۔ تو گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں لکھا کہ مسٹر زبیر قاضی احمد حسین سری کرشن سنہا وغیرہ گرفتار کرلئے گئے ہیں۔ یہ کانگریس کے مخلص ترین لوگ ہیں۔ ان کی گرفتاریوں سے بہار سوگوار ہے۔ سری کرشن سنہا سابق وزیر اعلیٰ بہار کو سیاست میں مسٹر زبیر مرحوم ہی لائے تھے اور ان کو ڈسٹرکٹ بورڈ کا وائس چیرمین بنوایا تھا۔ سری کرشن اس کے اتنے شکر گذار تھے کہ جب مسٹر زبیر مرحوم کے لڑکے شاہ مشتاق کو بہار اسمبلی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ ملا تو سری کرشن ان کے حلقہ میں گئے اور ووٹ دینے والوں سے کہا کہ وہ مسٹر زبیر کے مقروض ہیں۔ ان کا قرض وہ ادا نہ کرسکے ہیں وہ ووٹ کی بھیک مانگنے آئے ہیں تاکہ ان کے لڑکے شاہ مشتاق کو اسمبلی کا ممبر بناکر یہ قرض ادا کریں۔

افسوس کہ مسٹر زبیر کا بہت جلد انتقال ہوگیا۔ شاہ عمیر صاحب ان کے منجھلے بھائی تھے اور خلافت تحریک میں بڑے خلوص سے شریک ہوئے تھے۔ کانگریس کی ہر تحریک میں جیل گئے جوش میں انگریزی حکومت کو ریونیو دینے سے انکار کردیا تھا۔ اپنے ہی لوگوں نے شاہ صاحب کی طرف سے ریونیو ادا کیا۔ جس جائداد کا ریونیو ادا نہ ہوسکا، جائداد نیلام ہوگئی۔

ارول بستی ایک ندی کے کنارے آباد ہے۔ ہر سال سیلاب کی وجہ سے بستی کو سخت نقصان ہوتا تھا۔ شاہ عمیر صاحب نے اپنے خرچ سے محفوظ مقام پر اپنی زمین پر نیا ارول بسایا جس کا نام عمیر آباد ہے۔ گاندھی جی کے مشہور انگریز چیلا "سی ایف اینڈریوز" نے اس کا افتتاح کیا تھا شاہ صاحب کئی بار اسمبلی کے انتخاب میں امیدوار ہوئے لیکن جداگانہ انتخاب کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ ان کے مخالف جانتے تھے کہ شاہ صاحب کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے

مخالفوں کی مخالفت کا برا نہیں مانتے ہیں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے اس مزاج اور طبیعت کی نرمی کا فائدہ اٹھا کر مخالفوں نے مخالفت کی آزادی کے زمانہ میں شاہ صاحب کا نام بہار کی وزارت کے لئے آرہا تھا لیکن راجندر پرشاد بابو سیاسی مصلحت کی بنا پر عبدالقیوم انصاری کو چاہتے تھے۔ فیصلہ مولانا آزاد کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا آزاد آئے اور راجندر بابو نے دیکھا کہ مولانا آزاد کا رجحان شاہ عمیر صاحب کی طرف ہے تو ان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ یہاں پٹنہ میں اس بات کا فیصلہ نہ کریں بلکہ دہلی پہنچ کر اس بات کا فیصلہ کریں۔ دہلی میں مولانا حسین احمد صاحب کی سفارش پر مولانا آزاد نے عبدالقیوم صاحب انصاری کو وزیر بنا دیا اور شاہ عمیر صاحب کو پارلیمنٹری سکریٹری۔ سری کرشن نے ان کو کانسل کا "لیڈر آف دی فلور" بھی بنا دیا تھا۔ گویا وہ کانسل میں وزیر اعلیٰ کی نیابت کرتے تھے۔ بعد میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی ہوئے۔ شاہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے تین کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ مقرر بہت اچھے تھے۔ کانسل کے بعض ممبروں کا خیال تھا کہ پارلمنٹری سکریٹری میں ان سے اچھا کوئی مقرر نہیں تھا۔

شاہ صاحب کو لوگوں سے ملنے اور ان کی دعوتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ شاہ صاحب کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ ایک شخص ان کا دوست ہے یا دشمن۔ اگر وہ ان کے دسترخوان پر موجود رہتا تو وہ اس سے بہت خوش رہتے۔ علماء اور صوفیاء کے بہت معتقد تھے۔ آخر میں شاہ امان اللہ صاحب خانقاہ مجیبیہ سے مرید ہو گئے تھے۔ اس ناچیز کے تو قریبی رشتہ دار ہی تھے۔ ملنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اپنے یہاں بھی بلاتے رہتے اور اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے اور وہ اپنا وقت قیمتی سمجھتے بھی کب تھے۔ ان کی نظروں میں قیمتی انسان تھے۔ گھڑیوں سے ان کو نفرت تھی۔ کہتے یہ کیا ہے۔ گھڑی کی غلامی؟ جو کام ہے کیجئے وقت کیا دیکھتے ہیں۔ کبھی غریب خانہ پر بھی آجاتے۔ میں سات برس کے بعد مکہ معظمہ سے واپس آیا تو اس موقعہ پر بھی میرے یہاں تشریف لائے اور خوشی کا اظہار کیا کہ میں مکہ معظمہ میں مقیم ہوں۔ میں بھی جوابی ملاقات کے لئے ان کے یہاں گیا۔ یہ ہماری ان کی آخری ملاقات تھی پھر سنا کہ وہ حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ جدہ میں ان کی طبیعت خراب ہوئی

اور واپس آنا پڑا ۔ فرض حج وہ پہلے کر چکے تھے۔ ان کا یہ دوسرا سفر حج، نفلی حج تھا۔
اللہ تعالیٰ ان کے ارادۂ حج کو قبول فرمائے اور اعلیٰ مراتب سے نوازے۔

مسٹر یونس بیرسٹر

مسٹر یونس اپنے وقت میں بہار کے سب سے بڑے بیرسٹروں میں تھے۔ اور کافی محنت سے کام کرتے تھے۔ قانون کا مطالعہ وسیع تھا۔ مولانا سجاد صاحب نے انڈی پینڈنٹ پارٹی بنائی اور عوام مسلمانوں سے ان کا جو رابطہ تھا اس کی طاقت پر یہ پارٹی برسراقتدار آئی تو مسٹر یونس اس کے لیڈر چنے گئے۔ کانگریس پارٹی نے وزارت قبول کرنے سے انکار کیا تو مسٹر یونس کو دوسری سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے وزارت بنانے کا موقع ملا۔ اپنے دور وزارت میں جو بہت تھوڑے عرصے کے لئے تھا انہوں نے کئی اچھے کام بھی کئے۔ مثلاً کسانوں کو یہ حق دیا کہ وہ اگر کھیت کے کسی حصہ کو جوت رہا ہے تو وہ اس کو اپنی ملک سمجھے زمینداروں کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ وہ اس سے اپنا کھیت واپس لے سکیں۔ اسی طرح انہوں نے اس کی بھی اجازت دی کہ سرکاری دفاتر میں اردو میں درخواستیں دی جائیں۔

مسٹر یونس سے میری ملاقات آزادی کے بعد ہوئی۔ حکومت ہند نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ صوبہ میں ایک کسٹوڈین مقرر کیا تھا اور اس کو اختیار دیا تھا کہ جو لوگ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے ہیں ان کی جائداد کو اپنے قبضہ میں لے لے۔ چونکہ تعصب اور ناواقفیت کی وجہ سے ان مسلمانوں کی جائدادیں بھی کسٹوڈین کے قبضہ میں جانے لگیں، جو ہندوستان چھوڑ کر نہیں گئے تھے، اس لئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ناظم جمعیۃ علماء ہند کی حیثیت سے ایک سرکلر بھیجا کہ ہر جگہ ریلیف کمیٹیاں بنا کر ایسے مسلمانوں کی مدد کی جائے جو پاکستان نہیں گئے اور ان کی جائدادیں کسٹوڈین نے ضبط کر لی ہیں۔ چنانچہ پٹنہ میں بھی ریلیف کمیٹی بنی اور یہ ناچیز اس کا سکریٹری ہوا۔ پھر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خط آیا کہ حکومت ہند کے اس آرڈیننس میں ترمیم کرانے کے لئے ملک کے چیدہ حضرات کا ایک اجتماع جمعیۃ علماء ہند نے بلایا ہے۔ آپ اس میں ضرور شریک ہوں۔ بعض حضرات نے مجھ کو مشورہ دیا کہ میں پٹنہ کے

کہ قانون داں حضرات کے مشورہ سے ایک ترمیمی مسودہ ساتھ لیتا جاؤں۔ اس سلسلہ میں
معین وکیل، ایوب وکیل اور شاہ رشید اللہ صاحب نے میری بہت مدد کی۔ اس موقعہ پر میں
مسٹر یونس سے بھی ملا۔ مولانا عثمان غنی صاحب ساتھ تھے۔ انہوں نے ہی میرا تعارف کرایا
مسٹر یونس صاحب کام چھوڑ کر خود اس مسودہ کو دیکھنے اور مشورہ دینے لگے۔ انہوں نے
مجھ کو تقریباً دو گھنٹہ وقت دیا۔ اس کے بعد کہا کہ اگر میری شرکت قابل اعتراض نہ ہو تو میں
بھی اس اجتماع میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے
اجازت حاصل کی۔ اور ان کو اطلاع دی۔ انہوں نے کہا کہ مغل سرائے میں آپ سے
ملاقات ہوگی۔ چنانچہ میں جب روانہ ہوا اور مغل سرائے پہنچا تو ان کا آدمی مجھے بلا کر فرسٹ
کلاس کے ڈبے میں لے گیا جہاں مسٹر یونس بیٹھے ہوئے تھے۔ مسٹر یونس نے مسلسل بنا
مسودہ مجھ سے املا کرایا اور ہر دفعہ کی مصلحتیں بتائیں۔ میں نے دونوں مسودے مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب کے حوالے کر دیئے۔ جلسہ میں ہر دفعہ زیر بحث آئی۔ مسٹر یونس نے
بحث میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا۔ ان کی بعض ترمیمیں جلسہ میں قبول کی گئیں۔

مسٹر یونس کے پاس دوسری بار میں اس وقت گیا جب کہ پٹنہ کے ایک تاجر کی دوکان
پر قبضہ کر کے پولیس نے ان کو نکال دیا تھا اور ان سے زبانی کہا تھا کہ تم پاکستان چلے جاؤ
مسٹر یونس نے ایک درخواست ایس ڈی او کے نام لکھ کر دی اور کہا کہ اسے وہاں دے
دیجئے۔ ایس ڈی او پولیس سے جواب طلب کریں گے اور جواب ملنے پر آپ ہائی کورٹ میں اس حکم کے
خلاف چارہ جوئی کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور جب معلوم ہوا کہ کارروائی حکومت کے ایک
حکم کی بنا پر عمل میں آئی ہے اور اس حکم کی نقل بھی ایس ڈی او نے حوالہ کر دی تو ہائی کورٹ میں اس کے خلاف
چارہ جوئی کی گئی۔

میری تیسری ملاقات مسٹر یونس سے اس وقت ہوئی جب وہ اپنے ہی گھر میں
نظر بند (UNDER HOUSE ARREST) تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ مسٹر یونس کی بختیار پور بہار
ریلوے چل رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے یہ ہنگامہ کیا کہ اس ریلوے کا انتظام اچھا نہیں ہے۔
ڈسٹرکٹ بورڈ کو چاہیے کہ اس پر قبضہ کرے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈ نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا

اور جب اس کے آدمی حساب لینے کے لئے مسٹر یونس کے پاس گئے اور مسٹر یونس نے حساب دینے سے انکار کیا تو اس پر طرفین میں کچھ تیز و ترش باتیں ہوئیں چنانچہ مسٹر یونس کے خلاف فوجداری مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کی اس رپورٹ پر کہ ان کو اپنے مکان سے منتقل کیا گیا تو ان کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے، ان کو گھر ہی پر نظر بند کیا گیا۔ مسٹر یونس نے مجھ کو ایک درخواست اور مسلح پولیس کے پہرہ کی تصویریں دیں اور کہا کہ آپ جواہر لال تک میری یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ میں ان کاغذات کو لے کر دہلی گیا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے کہا کہ جواہر لال آج ہی انڈونیشیا جا رہے ہیں اس لئے ان سے ملاقات دشوار ہے۔ چلو پٹیل ہی سے مل لیا جائے چنانچہ ہم دونوں پٹیل کے یہاں گئے۔ سردار پٹیل نے کاغذات لے لئے اور کہا کہ پڑھ لوں تو کوئی کارروائی کروں گا۔ انہوں نے بعد میں مولانا حفظ الرحمن صاحب کو اطلاع دی کہ انہوں نے ایک نوٹ بہار گورنمنٹ کو بھیجا ہے۔ اس کے بعد مسٹر یونس پر سے پولیس کا پہرہ اٹھ گیا۔ مسٹر یونس ہائی کورٹ میں اور پھر سپریم کورٹ میں مقدمہ لڑتے رہے۔ اسی اثناء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں حکومت بہار اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے طریقۂ کار کی مذمت کی تھی لیکن یہ لکھا تھا کہ یہ مقدمہ نیچے کی عدالت میں پیش ہونا چاہئے۔

پھر ان کے صاحبزادہ نے ریلوے کی قیمت لے کر اس سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔

مسٹر یونس کہتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ میں انتظام اچھا نہیں کر رہا ہوں لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ ریل کی پٹریاں تک بیچ ڈالیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت اس ریلوے کا حال برا ہو گیا۔ بالآخر عقیل وکیل صاحب کی کوششوں سے حکومت ہند نے اس کا نظم اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور مسافروں کو کوئی شکایت نہیں رہی جیسی شکایت ڈسٹرکٹ بورڈ سے تھی۔

میں نے مسٹر یونس کو بہت دلیر اور اپنے علم پر بہت بھروسہ کرنے والا پایا تھا سیاسی سوجھ بوجھ بہت اچھی تھی۔ علماء وغیرہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا سجاد صاحبؒ سے بے حد عقیدت تھی۔

میں ایک بار ضیق النفس میں مبتلا تھا خبر ملنے پر میرے یہاں عیادت کیلئے بھی گئے

تے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ گفتگو میں بعض ایسے مقامات کا ذکر کرتے رہے جس میں مولانا سجادؒ کی بتائی ہوئی بعض تاویلات کو پیش کر کے وہ ہائی کورٹ سے کامیابی حاصل کر سکے تھے۔ وہ بیرسٹر ہونے کے باوجود مولانا سجادؒ کی ذہانت اور قانونی صلاحیت سے بہت متاثر تھے۔

عبدالقیوم انصاری

انصاری صاحب دراصل یوپی کے ایک اہلحدیث مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے تجارتی سلسلہ میں بہار میں قیام ہوا۔ ابتداءً صرف مومن کانفرنس سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ مومن کانفرنس کے لیڈر زیادہ تر مسلم لیگ کی طرف جھکے ہوئے تھے، اس لئے ان کا جھکاؤ بھی مسلم لیگ کی طرف تھا لیکن جب مسلم لیگ نے اسمبلی کے انتخاب میں ان کو ٹکٹ نہیں دیا تو یہ مسلم لیگی امیدوار کے مقابلہ میں آزاد کھڑے ہوگئے۔ اسی طرح ان کے اور مسلم لیگ کے درمیان فصل پیدا ہوگیا۔

جب مسلم لیگ اور کانگریس میں آخری انتخابی معرکہ تھا تو یہ مومن کانفرنس اور نیشنلسٹ مسلم پارلیمنٹری بورڈ دونوں کے ٹکٹ پر امیدوار ہوئے تھے۔ کامیاب بھی ہوئے، حالاں کہ اس وقت مسلمان جنون کی حد تک مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔

میری ملاقات عبدالقیوم انصاری صاحب سے اسی زمانہ میں ہوئی۔ وہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے فارم پر دستخط کرنے کے لئے پھلواری آئے تھے اور میں پارٹی کا آفس سکریٹری تھا۔ میں نے ان کو بہت ٹھنڈے قسم کا آدمی پایا۔

جب کانگریس کی وزارت بننے لگی تو راجندر پرشاد ان کو وزیر بنانا چاہتے تھے لیکن مسلمان وزیروں کے انتخاب کا حق کانگریس نے مولانا آزاد کو دے رکھا تھا۔ مولانا پٹنہ تشریف لائے تو بعض نیشنلسٹ مسلمان مصر ہوئے کہ عبدالقیوم انصاری صاحب کی جگہ شاہ عمیر صاحب کو وزیر بنایا جائے کیونکہ وہ پرانے کانگریسی ہیں اور ان کا خاندان بھی پرانا کانگریسی تھا۔ اور جن کی ملک کے لئے قربانیاں بھی تھیں۔ مولانا آزاد کا میلان بھی اسی طرف ہو رہا تھا۔ راجندر پرشاد نے بہت مشکل سے مولانا آزاد کو راضی کیا کہ اس معاملہ کا

فیصلہ وہ ابھی پٹنہ میں نہیں کریں۔ مولانا دہلی گئے تو مولانا حسین احمد صاحب کی مداخلت سے مولانا آزاد نے عبدالقیوم صاحب انصاری کی حمایت میں اپنا فیصلہ دیا اور وہ ڈاکٹر محمود صاحب کے ساتھ ساتھ بہار کے وزیر ہو گئے اور تب وہ کانگریس کے رکن بھی ہو گئے۔ جب ڈاکٹر محمود صاحب کی تحریک سے حکومت بہار نے پسماندہ طبقہ کی مدد کا اصول بنایا اور ملازمتوں میں ان کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا تو انصاری صاحب نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور مومن برادری ان کی مدد سے تیزی سے ترقی کرنے لگی اور مومن برادری کے انگریز نواز لیڈروں نے دیکھا کہ اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے تو وہ بھی مومن کانفرنس کی قیادت سے انصاری صاحب کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ اب انصاری صاحب مومن کانفرنس کے مسلمہ لیڈر ہو گئے تھے۔ ان کی اس قیادت کی وجہ سے غیر مومن برادری میں ان کے خلاف ناخوشی کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ یہ جذبہ اتنا بڑھا کہ جب بہت عرصہ کے بعد ڈھیبر کانگریس کے صدر ہوئے اور وہ بہار آئے تو ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم دیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ مومن جماعت پسماندہ طبقات سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ چونکہ میں بھی انصاری صاحب کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ میرے خیال میں وہ وزارت کی خواہش میں کانگریسی بنے تھے اس لئے مجھ کو اس میمورنڈم پر دستخط کرنے کو کہا گیا لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مومن برادری اگر پسماندہ نہیں سمجھی جائے گی تو یہ نہیں ہوگا کہ وہ رعایت کسی غیر پسماندہ جماعت کو مل جائے بلکہ اس سے صرف مومن برادری اس رعایت سے محروم ہو جائے گی جو اس کو مل رہی ہے۔ یعنی یہ کارروائی میرے خیال میں نقصان پہنچانے کے لئے تھی کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے نہیں۔ مومن برادری کے لئے سوت کا کوٹا جو مخصوص ہو گیا تھا اس سے میں نے بعض غیر مسلم حلقہ میں بے چینی محسوس کی تھی اور مجھ کو یہ شبہ تھا کہ ممکن ہے ان کی شہ پر یہ کارروائی کی گئی ہو۔

انصاری صاحب کی ایک جرأت نے میرے دل میں ان کی قدر پیدا کر دی تھی۔ آزادی کے بعد اکثر جگہ مسلمان گھروں کی تلاشیاں لی جا رہی تھیں۔ پولیس محلہ کا محلہ گھیراؤ میں لے لیتی اور مسلم گھروں کی تلاشی لینا شروع کر دیتی۔ ان کے ساتھ بعض ہندو نوجوان بھی ہوتے جن کے بارے میں

بتایا جاتا کہ وہ آر ایس ایس کے آدمی ہیں۔ چھرے، چاقو، قینچی جو بھی پولیس پاتی اپنے قبضہ میں کر لیتی
کبھی کبھی یہ تلاشی سڑکوں پر چلنے والوں کی بھی ہوتی۔ پھلواری شریف سے پٹنہ آتے ہوئے مولانا
محمد عثمان غنی اور قاضی احمد حسین صاحب کی تلاشیاں راستہ میں ہوئیں۔ اس صورت حال سے ہم سب
بددل تھے۔ میں ان دنوں روزنامہ الہلال پٹنہ کا ایڈیٹر تھا اور میں نے اس کے خلاف اپنے اخبار
میں کافی شور مچایا۔ چنانچہ پٹنہ میں کانگریسی مسلمانوں کا خصوصی جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ ایک عام
احتجاجی جلسہ کیا جائے۔ بیچارے مسلم لیگی تو خوفزدہ تھے اور سر چھپائے پھر رہے تھے۔ کام ہم ہی کر
سکتے تھے۔ رائے ہوئی کہ یہ عام جلسہ قاضی احمد حسین صاحب کی صدارت میں ہو کیونکہ وہی سب
سے پرانے کانگریسی تھے مسلمان وہاں پر تھے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مجھ کو صدارت سے
انکار نہیں ہے لیکن عبد القیوم انصاری صاحب چونکہ وزیر ہیں اس لئے ان کی صدارت میں جلسہ
زیادہ مفید رہے گا۔ ایک دو آدمی کے زور دینے پر انصاری صاحب، حکومت کے خلاف اس
جلسہ کی صدارت پر راضی ہو گئے اور جلسہ ہوا۔ انہوں نے صدارت کی۔ اس جلسہ میں باری سابق
صاحب نے پرجوش تقریر کی تھی۔ ایک تجویز بھی احتجاج میں منظور ہوئی۔ جب وزیر اعلیٰ سری کرشن
سنہا کو یہ تجویز دی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ بہرحال تلاشیاں بند
ہو گئیں۔

دوسرا واقعہ جس نے انصاری صاحب کی قدر میرے دل میں پیدا کی وہ نماز کا معاملہ ہے
پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہو رہا تھا۔ سردار پٹیل افتتاح کرنے کے لئے بلائے گئے تھے
اس موقع پر پٹنہ کی سکریٹریٹ میں عصرانہ بھی تھا۔ ہم سب شریک تھے۔ مغرب کا وقت ہوا تو ہم پریشان
تھے کہ نماز کہاں پڑھیں وضو کہاں کریں۔ اتنے میں دیکھا کہ عبد القیوم انصاری اٹھے، انہوں نے
دروازوں کے پردے نکال نکال کر بچھانا شروع کیا۔ اس کے بعد جن جن حضرات کے بارے میں
ان کو گمان ہوا کہ نمازی ہیں انہوں نے ان کو بلایا۔ جن کو وضو کی ضرورت تھی ان کو وضو کی جگہ بتائی
پھر ہم سب نے جماعت سے نماز پڑھی۔

تیسرا واقعہ جس نے میرے دل میں ان کی عزت پیدا کی وہ کے ایم منشی کے ادارہ سے شائع شدہ

ایک کتاب کا معاملہ تھا جس میں حضرت عائشہؓ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ سیاست کانپور نے سب سے پہلے اس کی اطلاع دی اور اس کے لئے اس کے ایڈیٹر تکلیف میں بھی پڑے۔ پٹنہ کے مسلمانوں میں بھی جوش تھا۔ چنانچہ ایک جلسہ عام ہوا۔ مولانا عبدالخبیر صاحب اس جلسہ کے صدر تھے۔ غلام سرور صاحب جو بعد میں وزیر ہوئے، پیش پیش تھے۔ عبدالقیوم صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اس کے باوجود کہ وہ وزیر تھے۔ انہوں نے تقریر میں کہا کہ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، رسول کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی تھی جس کی بعد میں مولانا عبدالخبیر صاحب نے بہت تعریف کی۔ میں نے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا بہترین جواب یہ ہے کہ ہم آپ کی سیرت اور تعلیمات کو پھیلائیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جس قدر حضورؐ سے محبت کرتے تھے اس کا ایک اعشاریہ بھی ہم حضور سے محبت نہیں کرتے۔ لیکن وہ اس طرح کی اذیتوں کو برداشت کرتے اور حضورؐ کی تعلیمات پر خود عمل کرتے اور دوسروں سے عمل کراتے۔ اور ان کی اشاعت و تبلیغ میں لگے رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے دشمن نیست و نابود ہو گئے اور اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

بہر حال عبدالقیوم انصاری صاحب کی کوششوں سے حکومت بہار نے اس کتاب کو خلاف قانون قرار دے دیا اور ہندوستان میں حکومت بہار ہی وہ واحد حکومت تھی جس نے اس کتاب کو خلاف قانون قرار دیا۔

چوتھا واقعہ نصاب کی کتابوں کا ہے۔ ہندوستان میں اکثر جگہ نصاب کی کتابوں میں مسلمانوں کے خلاف بے تکی اور دل آزار باتیں درج تھیں۔ میں نے نصاب میں جو باتیں قابلِ اعتراض تھیں انکو حاصل کر کے اخبار نقیب میں جس کا میں ایڈیٹر تھا مسلسل تبصرے شائع کئے، انصاری صاحب ان کو پڑھ کر متاثر ہوئے اور انھوں نے وزیر اعلیٰ کو کہا کہ اردو اخبارات میں نصاب کی کتابوں کے خلاف ایسے مضامین نکل رہے ہیں کہ جن سے خطرہ ہے کہ مسلمان کانگریس کے خلاف ہو جائیں گے۔ سری کرشن سنہا صاحب نے مضامین کو سننا چاہا تو عبدالقیوم انصاری صاحب نے مجھ سے نقیب اخبار کی وہ فائل طلب کی جس میں تبصرے شائع ہوئے تھے۔ میں نے وہ فائل

ان کے حوالہ کی اور انصاری صاحب نے سری کرشن سنہا کو دی۔ اس کے بعد سری کرشن نے محکمۂ تعلیم کے ذمہ داروں کو بلایا اور کہا وہ نہیں چاہتے کہ نصاب کی کتابوں میں کسی فرقہ کے خلاف دلآزار باتیں ہوں۔

پانچواں واقعہ مسلمانوں کی جائداد کی ضبطی کا ہے۔ اولاً بہار گورنمنٹ نے اور بعد میں حکومت ہند نے آرڈیننس کے ذریعہ ان کی جائدادوں کو قبضہ میں لے لینے کا قانون نافذ کیا جو پاکستان چلے گئے۔ ایسی جائدادوں کو بہانہ بنا کر غیر ذمہ دار حکام نے ان کی جائدادوں کو بھی ضبط کرنے کا اعلان کیا جو پاکستان نہیں گئے۔ سب ڈویژن باڑھ ضلع پٹنہ میں یہ کام بڑے پیمانے پر ہوا تھا چنانچہ وہاں سے مسلمان میرے پاس آئے۔ چونکہ اس زمانہ میں میں جمعیۃ علماء کی ریلیف کمیٹی سکریٹری تھا۔ انہوں نے ضبط شدہ جائدادوں کی تفصیلات مع دستخط میرے حوالے کیں۔ میں قاضی احمد حسین مرحوم، معین وکیل مرحوم اور ایوب وکیل مرحوم کے ساتھ عبدالقیوم انصاری کے یہاں گیا۔ کیوں کہ آرڈیننس کے تحت کسٹوڈین مقرر کئے گئے تھے اور یہ محکمہ انصاری صاحب کے حوالہ کیا گیا تھا۔ قاضی صاحب کے مشورہ سے انصاری صاحب نے حکم لکھا کہ چونکہ حکومت ہند کا آرڈی ننس جلد ہی نافذ ہونے والا ہے اس لئے صوبائی آرڈی ننس پر عمل نہ کیا جائے اور جن جائدادوں کی ضبطی کا اعلان ہوا ہے ان کو چھوڑ دیا جائے اور احکامات واپس لے لئے جائیں۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ سیدھے راستہ سے آپ کا حکم جائے گا تو اس میں دیر ہوگی آپ کسٹوڈین کو فون کر کے اپنے حکم کی اطلاع بھی دے دیں اور ان کو فوراً کارروائی کرنے کو کہیں۔ انصاری صاحب نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ کسٹوڈین پٹنہ میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے انصاری صاحب نے اسسٹنٹ کسٹوڈین کو جو ضلع کلکٹر تھے، فون کیا اور ان کو کہا کہ صوبائی آرڈی ننس پر عملدرآمد نہ ہو اور اس کے تحت جو احکامات صادر ہو رہے ہیں انکو واپس لے لیا جائے۔ اس کے بعد ہم چار حضرات انصاری صاحب کے یہاں سے نکلے۔ راستہ میں قاضی صاحب نے کہا کہ بعض حکام مسلمان وزیروں کے حکم کو اہمیت نہیں دیتے ہیں اس لئے ہم کلکٹر سے مل لیں اور ان کا اندازہ کریں کہ وہ اس حکم پر عمل کریں گے یا نہیں"

چنانچہ ہم ان کے یہاں گئے۔ انہوں نے کہا کہ جب تک حکومت کا حکم نہیں آئے گا۔ ہم کسی وزیر کے حکم پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں سے نکل ہم شاہ عمیر صاحب کے یہاں آئے جو پارلیمنٹری سکریٹری اور ایوان بالا کے لیڈر آف دی فلور تھے اور کلکٹر کے پاس ہی ان کی قیام گاہ تھی۔ انہوں نے واقعہ سنا تو سری کرشن سنہا کے سکریٹری کو فون کر کے کہا کہ قاضی احمد حسین صاحب ارجنٹ کام سے وزیر اعلیٰ سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ نے ہم کو بلا بھیجا۔ ہم پہنچے تو چیف سکریٹری بیٹھے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے قاضی صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ چونکہ آپ کسی نہ کسی اہم قومی ضرورت سے آتے ہیں اس لئے میں نے چیف سکریٹری کو بلا لیا ہے تاکہ جو کچھ کہنا ہے سامنے کہہ دوں۔ میں کل صبح باہر جا رہا ہوں۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے قصہ سنایا۔ چیف سکریٹری نے کہا وہ کون سے لوگ ہیں اور کون سی جائداد ہے۔ فائل میرے ساتھ تھی۔ میں نے لوگوں کی شکایتیں پڑھ کر سنائیں۔ وزیر اعلیٰ نے چیف سکریٹری کو کہا کہ ٹھیک ہے، قاضی صاحب کی رائے کے مطابق صوبائی آرڈی ننس پر عمل درآمد روک دیا جائے اور اس کے تحت جو احکامات جاری ہوئے ہیں ان کو واپس لیا جائے۔ اس کے بعد ہم واپس آگئے۔ دوسرے روز چیف سکریٹری کو ہم نے فون کیا تو انہوں نے کہا کہ حکم بھیج دیا گیا ہے۔

میں کسٹوڈین کے سلسلہ میں انصاری صاحب سے بار بار ملتا رہا اور ہر شکایت پر انہوں نے کارروائی کی۔ ایک بار تو انہوں نے کسٹوڈین کو بھی بلایا تھا تاکہ ہماری شکایت پر ان سے سامنے گفتگو ہو جائے۔

ایک بار دربھنگہ کے کسی جگہ پر فساد کے خطرے کی اطلاع ملی تھی۔ ہم وزیر داخلہ کے پاس گئے لیکن ان کا جواب تشفی بخش نہ تھا۔ پھر انصاری صاحب کے پاس گئے اور ان کو اطلاع دی۔ انصاری صاحب نے سکریٹری متعلقہ کو فون کیا اور ان کے زور دینے پر سکریٹری متعلقہ جائے وقوع پر گئے اور حالات پر قابو پایا۔

ایک بار ایک شکایت ملی کہ جنوبی بہار میں ایک ایک صاحب کو ڈیوٹی کے وقت نماز پڑھنے کے الزام میں معطل کر دیا گیا تھا۔ میں نے انصاری صاحب کو اطلاع دی۔ اسی وقت

کابینہ کا جلسہ ہونے والا تھا۔ انصاری صاحب نے اس میں شکایت کو پیش کر دیا۔ کرشن بلبھ سنہا نے کہا کہ یہ محکمہ حکومت کا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس محکمہ سے استدعا کر سکتے ہیں۔ انصاری صاحب نے کہا یہی کر دیجئے۔

سیّد فہیم الدّین

میں شروع شروع کلکتہ گیا تو منجھلے بھائی مرحوم کے ساتھ سید آباد سب ڈویژن جہان آباد ضلع گیا کے رہنے والے ایک صاحب سید فہیم الدین رہتے تھے۔ خطاط تھے اور متعدد خوشنویسوں کے استاذ تھے۔ ادبی ذوق بہت اچھا تھا لیکن خود نہ مضمون لکھتے تھے اور نہ شعر کہتے تھے۔ کئی ہفتہ وار پرچے نکال چکے تھے۔ کمسنی سے آخر عمر کا بڑا حصہ انہوں نے کلکتہ میں گزارا تھا۔ کمیونزم اور فرقہ پرستی دونوں سے متنفر تھے۔ ذرا مغلوب الغیض تھے۔ گفتگو خوشگوار فضا میں کرتے تھے۔ تعاون کے لئے آگے بڑھتے تھے۔ لیکن جب دیکھتے تھے کہ فریق ثانی کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو پھر معاف نہیں کرتے تھے۔ چالیس برس کے لمبے عرصے میں ان کی لڑائی اور دوستی تقریباً سب ہی قومی کارکنوں سے ہوئی۔ طبیعت میں ایثار بہت تھا۔ دوستوں کے لئے ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بہادر بھی بہت تھے کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے۔ راقم الحروف سے ان کے تعلقات بہت اچھے رہے۔

جب عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے روزانہ اردو اخبارات نکالنا چاہا اور یہ تجویز رکھی کہ لوگ بلا معاوضہ کام کریں اور جو نفع ہو وہ آپس میں تقسیم کر لیں تو فہیم صاحب تیار ہو گئے خود کام کرنے لگے اور اپنے عزیزوں کو خوش نویسی سکھا کر اس ادارہ سے وابستہ کیا ساری ہمدردی ان کی اس لئے تھی کہ یہ اخبار انگریزوں کا مخالف تھا۔ لیکن ملیح آبادی صاحب سے ان کی نہیں بنی اور وہ اس اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔

مجھ کو انہوں نے پایا کہ میں برطانیہ اور کمیونزم دونوں کا مخالف ہوں۔ برطانیہ کا زیادہ اور کمیونزم کا کم تو وہ مجھ سے قریب ہو گئے۔ مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرتے اور مجھ سے اتفاق کرتے۔ کانگریس میں جمعیۃ العلماء اور دوسرے سیاسی جلسوں میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ وہ قومی کارکنوں کی باوجود غریب ہونے اور وسائل کی کمی کے ہر طرح کی مدد کرتے

میری مدد کے لئے بھی مستعد رہتے۔ ٹیوشن دلاتے، مشورے دیتے۔ ہماری ان کی روزانہ ایکبار ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم چھڑی تو ملیح آبادی صاحب کے اخبار کے لئے جوش ملیح آبادی نے ایک نظم بھیجی۔ نظم خلاف قانون تھی۔ انگریزوں کے مظالم کو بیان کیا گیا تھا اور آخر میں یہ شعر تھا ؎

اب کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

ملیح آبادی صاحب نے یہ نظم نہیں شائع کی۔ فہیم صاحب کو اپنے شاگردوں کے ذریعہ جو ہند اخبار میں کام کرتے تھے، خبر مل گئی۔ انہوں نے یہ نظم منگوائی۔ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اپنے پریس میں اس نظم کو شائع کرنا چاہتا ہوں۔ فہیم صاحب کا اپنا پریس انڈین نیشنل پریس کے نام سے تھا۔ انہوں نے مشورۃً مجھ سے پوچھا کہ تقسیم کی کیا صورت ہوگی۔ میں نے دریافت کیا پہلے یہ بتائیے کہ پریس کو کیسے بچائیے گا۔ انہوں نے کہا ہمارے پریس میں کام کرنے والے سب قابل اعتماد ہیں۔ اس لئے چھپنے سے پہلے تو یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ ہم فوراً پتھر کاٹ دیں گے پھر تقسیم کریں گے اس لئے حکومت کو کوئی خبر نہیں ملے گی۔

میں نے مشورہ دیا کہ ہندوستان میں جتنے پتے معلوم ہوں ان پتوں پر کچھ کاپیاں بک پوسٹ کر دیں اس کے بعد ہم کلکتہ شہر میں تقسیم کریں۔ اس طرح کہ پہلے ہم دونوں جمعہ کے روز ناخدا کی مسجد میں تقسیم کریں اس کے بعد ہمارے ساتھیوں میں ہمت ہو جائیگی تو ہم ان اشتہارات کو مزدوروں کے علاقوں میں تقسیم کرا سکیں گے۔ فہیم صاحب کو یہ مشورہ پسند آیا۔ انہوں نے اپنے پریس میں اپنے خرچ سے ہزاروں کاپیاں چھپوائیں۔ پھر پتھر کاٹا گیا اس کے بعد بہت سارے نسخے بک پوسٹ کئے گئے۔ ناخدا مسجد میں تقسیم کرنے کی غرض سے کچھ کاپیاں رکھ کر باقی اشتہارات اپنے ایک عزیز کے پاس جو مولانا عبدالرؤف دانا پوری کے بھی عزیز تھے اور مسلم لیگی تھے، میں نے نے جاکر رکھ دیئے کیونکہ پولیس کا خیال اس طرف نہ جاتا۔ مسلم لیگ اور مولانا عبدالرؤف وغیرہ حکومت کے آدمی سمجھے جاتے تھے۔

جب ہم ناخدا مسجد کے دروازہ پر اشتہار تقسیم کر رہے تھے تو مسلم لیگ کے دفتر میں جو سامنے ہی تھا، ایک سی آئی ڈی افسر عبد الغفار خاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک والنٹیر سے کہا کہ عثمانی کوئی اشتہار تقسیم کر رہے ہیں، ایک کاپی مانگ کر لے آؤ۔ مسلم لیگ کے ایک نیک والنٹیر نے کہا کہ عبد الغفار خاں ایک اشتہار مانگ رہے ہیں۔ اگر وہ نام نہ لیتا تو سب کو دے رہا تھا اس کو بھی فوراً دے دیتا لیکن چونکہ اس نے نام لیا اس لئے میں نے کہا ٹھہرو۔ جب سب اشتہارات تقسیم کر چکا تو آخری اشتہار اس کے حوالے کر کے وہاں سے میں ہٹ گیا۔

اشتہار پر فرضی نام سٹی پریس پٹنہ لکھ دیا گیا تھا۔ لیکن سی آئی ڈی عبد الغفار سمجھ گیا کہ ضرور یہ اشتہار فہیم صاحب کے پریس میں چھپا ہے اس لئے بند گاڑی میں مسلح پولیس آئی اور اس نے اچانک فہیم صاحب کے پریس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی وقت ایک کاتب مزدوروں کا اشتہار لکھ رہا تھا۔ یہ بھی حکومت کے خلاف تھا اور اسی طرح چھاپنے کا ارادہ تھا جس طرح جوش کی نظم چھاپی گئی تھی۔ کاتب نے پولیس کو دیکھا تو اس اشتہار کو جو وہ لکھ رہے تھے منہ میں رکھ کر چبانا شروع کیا۔ چونکہ کاتب پہلے سے پان کھا رہے تھے، منہ لال تھا اس لئے پولیس نے بھی یہی سمجھا کہ یہ پان کھا رہے ہیں۔ بہرحال پریس کی تلاشی لی گئی اور کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔

اشتہار پر سٹی پریس تو فرضی نام تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ پٹنہ میں مسٹر یونس کے پریس کا نام سٹی پریس ہے۔ چنانچہ ان کے پریس کی تلاشی لی گئی لیکن نہ ان کے یہاں یہ چیز تھی نہ ان بیچارے کو اس کی کوئی خبر تھی۔

اس کے بعد ہم نے باقی اشتہار مزدور کارکنوں کو دے دیا کہ وہ اپنے علاقہ میں تقسیم کریں مسلم لیگ کا زور ہوا تو کچھ لوگوں کی خواہش ہوئی کہ جمعیۃ العلماء کی پالیسی کے مطابق ایک اخبار کلکتہ سے نکالا جائے۔ چنانچہ خان بہادر محمد خان اور کامل صاحب مولانا آزاد کے یہاں مشورہ کے لئے گئے۔ مولانا آزاد نے ایک اعلیٰ درجہ کے اخبار کا تخمینہ ان کو بتا دیا۔ خان بہادر اتنا روپیہ لگانا نہیں چاہتے تھے اس لئے وہ خاموش ہو گئے۔ فہیم صاحب کو معلوم ہوا تو وہ خان بہادر کے پاس گئے اور ان سے چھوٹی سی رقم بطور قرض مانگی تاکہ وہ اس طرح کا اخبار نکال سکیں۔ خان بہادر نے وہ رقم فہیم صاحب کے پریس کو رہن رکھ کر دے دی۔ کامل صاحب

اور راقم الحروف دونوں نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اخبار کا نام روزنامہ استقلال تھا۔

اخبار چلا۔ اس میں انگریزوں کی مخالفت میں روزانہ کچھ نہ کچھ مضامین ہوتے تھے۔ فہیم صاحب اپنے پریس میں بھی حکومت کے خلاف اشتہارات چھپواتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ صوبائی کانگریس کا ایک کتابچہ ان کے پریس میں چھپا لیکن حکومت نے جس کے سربراہ شہید سہروردی صاحب تھے۔ ان کے پریس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ سوبھاش بوس ان دنوں صوبائی کانگریس کے صدر تھے۔ ان کو اشرف الدین چودھری کے ذریعہ خبر ملی کہ انڈین نیشنل پریس سے ضمانت طلب کی گئی ہے تو انہوں نے وہ ضمانت حکومت میں جمع کرادی۔

ایک روز فہیم صاحب نے کہا کہ انگریزوں کے خلاف خوب سخت مضمون لکھئے۔ میں نے کہا کہ آپ پرنٹر پبلشر ہیں، پکڑے جائیں گے۔ بولے مجھ کو تو نہ حکومت سے ڈر معلوم ہوتا ہے نہ بدمعاشوں سے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنا شروع کیا۔ فہیم صاحب بیٹھے رہے اور مضمون میں اضافہ کراتے رہے۔ بہرحال مضمون تیار ہوگیا۔ عنوان تھا "مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار کون ہیں؟" حکومت نے اس مضمون پر کامل صاحب اور فہیم صاحب کے خلاف مقدمہ چلا دیا۔ ادارہ میں اوپر نام کامل صاحب کا تھا۔ میرا نام نیچے تھا اس لئے ان کو چیف ایڈیٹر سمجھ کر قابل مواخذہ قرار دیا گیا۔ فہیم صاحب پرنٹر پبلشر ہونے کی وجہ سے۔ وکیل نے کہا کہ اگر محمد عثمانی عدالت میں اقرار کرلیں کہ مضمون ان کا ہے اور ان کی ذمہ داری پر چھپا ہے تو کامل صاحب تو چھوٹ جائیں گے اور وہ کوشش کریں گے کہ فہیم صاحب کو بھی چھڑالیں۔ لیکن فہیم صاحب اس پر راضی نہ تھے کہ دو تو ماخوذ ہیں ہی تیسرے کو بھی پھنسایا جائے۔ مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ میں بیان دوں گا۔ جب مضمون میرا ہے تو کامل صاحب کو کیوں پھنسایا جائے۔ فہیم صاحب نے کہا کہ نہیں، میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کی سزا ہوجائے تو اخبار پیچھے میں آپ چلائیں۔ کامل صاحب اخبار نہیں چلا سکیں گے۔ ان کے پاس وقت بہت کم ہے لیکن میں نہیں مانا۔ عدالت میں تاریخ مقررہ پر حاضر ہوا۔ اور بیان دیا کہ مضمون میرا ہے میری ذمہ داری پر چھپا ہے کامل صاحب کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ ان دنوں ہندو سرکاری ملازموں کو مخالف برطانیہ اشخاص سے ہمدردی ہوتی تھی۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ اس لئے اس نے تعجب اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میری طرف دیکھا اور

اور چپراسی سے کہا کہ ان کو کرسی لاکر دو۔ اس کے بعد میرا باقاعدہ اظہار ہوا۔ کامل صاحب نے کہا کہ اس مضمون سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وکیل نے فہیم صاحب سے کہا تھا کہ تم بھی اپنی لاعلمی ظاہر کردو گے لیکن وہ جوشیلے آدمی کہاں ماننے والے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں مضمون میرے علم سے شائع ہوا ہے اور اسکی پوری ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ مجسٹریٹ نے کامل صاحب اور فہیم صاحب کو سزا دی۔ میں نے فہیم صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کیوں اقرار کرلیا۔ اخبار کی خاطر سے انکار کردیتے۔ بولے سب سے بزدل میں ہی تھا۔ بہرحال فہیم صاحب جیل چلے گئے۔ کامل صاحب نے ہائی کورٹ میں اپیل کی جہاں سے وہ بری کردیئے گئے۔ ہائی کورٹ نے لکھا تھا کہ حکومت چاہے تو محمد عثمانی پر مقدمہ چلا سکتی ہے۔ لیکن مدراس ہائی کورٹ کی ایک رولنگ کی وجہ سے حکومت کو مجھ پر مقدمہ چلانے میں تامل ہوا۔ رولنگ یہ تھی کہ کسی کا صرف اقرار جرم کرلینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ثبوت جرم بھی چاہیئے۔ مضمون پر میرا نام نہ تھا۔ مسودہ ضائع ہوچکا تھا۔ اخبار کے اسٹاف کا کوئی آدمی حکومت کی طرف سے گواہی نہ دیتا اس لئے ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اور جو فہیم صاحب چاہتے تھے کہ ان کے پیچھے میں اخبار چلاؤں وہی میں نے کیا۔ مضامین لکھتا ترجمہ کرتا، کتابت کی اصلاح کرتا، اشتہارات کے لئے دوڑتا۔ غرض دن بھر مشغول رہتا۔ یہاں تک کہ فہیم صاحب رہا ہو گئے۔

فہیم صاحب کی رہائی کے بعد انڈین نیشنل پریس سے دوبارہ ضمانت طلب کی گئی۔ اب وہ مجبور ہوئے کہ اخبار بند کردیں اور پریس بیچ دیں۔ اس کے بعد میں بھوپال چلا گیا اور فہیم صاحب کلکتہ میں اسی طرح سرگرم رہے۔ میں بھوپال سے بہار آیا اور امارت شرعیہ میں کام کرنے لگا۔ سات برس کے بعد جب امارت سے میری علیحدگی ہوئی اور فہیم صاحب کو خبر ملی تو وہ پٹنہ آئے اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں کلکتہ چلوں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں دو دو اخبار ہیں جن میں تمہاری ضرورت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں کلکتہ آیا اور آزاد ہند میں ترجمہ کرنے لگا لیکن فہیم صاحب کا ساتھ اس بار زیادہ نہیں رہا۔ وہ اپنے داماد سے ملنے پاکستان [illegible] گئے۔ واپس آئے تو ان کو کینسر تھا۔ جانبر نہ ہوسکے۔

آخر عمر میں نماز پڑھنے لگے تھے اور اعتبار تو خاتمہ بالخیر ہی کا ہے۔ مجھکو حیرت اس بات پر ہمیشہ

رہی کہ میری ان کی لڑائی کبھی نہیں ہوئی۔

فہیم صاحب ایک بار میرے ساتھ مولانا آزاد کے یہاں گئے تھے۔ اور ان سے یہ عرض کیا تھا کہ وہ اپنے مضامین کی جو الہلال میں چھپے ہیں، اشاعت کی اجازت دے دیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ الہلال میں سب مضامین ان کے نہیں ہیں۔ فہیم صاحب نے پھر کہا کہ الہلال میں ان مضامین پر نشان لگا دیا جائے جو حضرت کے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ اچھا ابھی آپ مقدمہ میں پھنسے ہوئے ہیں پھر ملئے گا۔ لیکن جب فہیم صاحب نے پریس بیچ دیا تو پھر اس غرض سے مولانا سے نہیں ملے۔
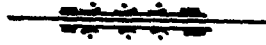
حسن امام وارثی

حسن امام صاحب گیا کے رئیس تھے۔ اور حسین امام صاحب سابق صدر کانسل آف اسٹیٹ اور سابق نائب صدر کانسٹی ٹیونیٹ اسمبلی ہند کے بڑے بھائی تھے۔قدیم کانگریسی لیڈر جسٹس شرف الدین کی نواسی سے ان کی شادی ہوئی تھی اور ان کی صاحبزادی کی شادی جسٹس شرف الدین کے پوتے سے ہوئی۔

میں نے ان کی اہلیہ کا دودھ پیا تھا۔ چونکہ ان کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے وہ میرے نام کے ساتھ یوں اپنا نام لکھتے تھے۔ ابو محمد حسن امام وارثی۔ شاعر بہت اچھے تھے۔ چند سال ماہنامہ ندیم گیا کو ایڈٹ بھی کیا تھا۔ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے فقیری لے لی تھی۔ گروا رنگ کے احرام میں رہنے لگے تھے۔ کھڑاؤں پہنتے تھے۔

ان کا اصل ذوق عوام کی خدمت تھا۔ ہومیوپیتھک کی چھوٹی بڑی بیسیوں کتابیں ان کی الماری میں تھیں۔ خود پڑھتے اور دوسروں کو پڑھنے کو دیتے۔ مجھ کو بھی پڑھنے کو دی۔ دوائیں مفت تقسیم کرتے رہتے تھے۔

مسلم لیگ کا زور ہوا تو مسلم لیگی اعزہ کے یہاں جانے سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس لئے حسن امام صاحب کے یہاں بھی نہیں جاتا تھا۔ ایک روز یہ والدہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ محمد میرے یہاں کیوں نہیں آتے ہیں؟ میں ان دنوں بھوپال میں تھا۔ اس لئے والدہ نے یہ جواب دے دیا کہ وہ بھوپال رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ بار بار پوچھتے رہے تو والدہ نے کہا کہ تم لوگ مسلم لیگی ہو اور میرے بچے کانگریسی ہیں۔ تمہارے یہاں نہیں جاتے کہ لڑائی ہوگی یہ جواب سن کر حسن امام صاحب نے وعدہ کیا کہ میری موجودگی میں ان کے یہاں کوئی سیاسی گفتگو نہیں کرے گا۔ میں بھوپال سے آیا تو وہ خود پہنچ گئے۔ اپنے یہاں لے گئے۔ جو لوگ موجود تھے ان

سے اپنی لڑکی کا نام لے کر کہا کہ یہ اس کے اپنے بھائی ہیں اور ہدایت کی کہ ان کی موجودگی میں سیاسی بات نہیں ہونی چاہئے۔ اس محبت کے جواب میں میں ان کے پاس برابر جانے لگا اور وہ بہت شفقت سے پیش آتے رہے۔

گیا میں ایک بار سیلاب آیا۔ میں اس زمانہ میں اسی شہر میں تھا۔ میرا مکان اور محلہ کے بہت سے مکان گر گئے۔ رات پڑوسی کے مکان کے اس حصہ میں گزاری جو نہ گرا تھا۔ صبح سویرے باہر نکلا۔ سیلاب کا پانی کم ہو گیا تھا۔ دیکھا کہ کھڑے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر بولے کہ رات کو کئی بار آیا آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا تھا۔ میں نے بتایا کہ میرا مکان گر گیا ہے۔ آگے سے دیوار کھڑی ہے اس لئے آپ کو اندازہ نہیں ہوا۔ بولے مکان گرنا اچھا ہے نیا مکان بنتا ہے۔ اس کے بعد چلے گئے۔ ہمارے کھانے پینے اور رہنے کا سامان کیا اور دوسرے روز اپنے دیہات سے بلا کر ملبہ اٹھانے کے لئے مزدوروں کی ایک ٹولی بھیجی۔

لیکن اس شفقت سے مجھ کو زیادہ دن تک فائدہ نہیں پہنچا۔ ہندوستان جلد ہی آزاد ہوا۔ دہلی میں فسادات شروع ہو گئے۔ ہر طرف درندے پھرنے لگے۔ یہ ان دنوں دہلی میں تھے۔ اس لئے پاکستان چلے گئے۔

کچھ عرصہ بعد کسی ضرورت سے ہندوستان آئے تھے۔ تو مجھ کو بلا بھیجا۔ کہنے لگے "اخبارات فضا کو اس طرح خراب کرتے ہیں کہ آدمی صورتحال کو سمجھ نہیں سکتا۔ پاکستان کے اخبارات میں ہندوستان کی خبریں اس طرح شائع ہوتی ہیں کہ میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان پہنچا اور مارا گیا۔ ضرورت تھی، کیا کرتا، آنا ہوا۔ میں لکھنؤ تک یہی سمجھا کہ ہندو جو نظر آ رہا ہے مجھ کو مار ڈالنے کے قصد سے مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ لکھنؤ سے آگے بڑھتے پر سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے۔"

بہار میں فساد ہوا تھا تو آل انڈیا ریڈیو میں خبر نشر ہوئی تھی کہ اسلام پور ضلع پٹنہ کے باشندوں کو بہار شریف پہنچا دیا گیا ہے۔ چونکہ میرے اہل و عیال اس وقت اسلام پور میں تھے اس لئے انہوں نے مجھ کو فوراً اطلاع دی۔ میں پٹنہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط نشر ہوئی ہے۔ اسلام پور کے سب لوگ اسلام پور میں ہیں۔

حسن امام صاحب کراچی میں بھی دوائیں مفت تقسیم کرتے اور لوگوں کا مفت علاج کرتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کی والدہ تو بہت عابدہ تھیں۔ انہوں نے ایک بیٹی چھوڑی جو لاولد ہے۔ نادر کتابوں کا ایک کتب خانہ چھوڑا۔ وہ مضامین اور اشعار چھوڑے جو وہ لکھتے رہتے تھے۔ خدمت عوام ان کی اصل یادگار ہے جس کا اجر ان کو مل رہا ہوگا۔
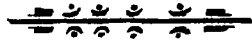
پنڈت سندر لال

پنڈت سندر لال الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ انگریزی، فرانسیسی، سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسلامیات پر، سیاست پر، تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ زبردست مقرر تھے۔ جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ ہندو مسلم اتحاد ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ رہے تو برابر کانگریس میں لیکن کانگریس میں کوئی اونچا مقام حاصل نہیں کیا۔ بعض لوگ اس کی وجہ جواہر لال کو بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چونکہ جواہر لال بھی الہ آباد کے تھے اور وہ اپنے پورے کنبہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتے تھے اس لئے سندر لال کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ مجھ کو اس الزام میں معقولیت نہیں معلوم ہوتی۔ بہرحال مجھ کو سندر لال کی ایک تقریر یاد ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مرکزی وزارت میں ڈھائی آدمی مخلص ہیں۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے رفیع احمد قدوائی اور آدھے جواہر لال۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ جواہر لال کو آدھا مخلص کیوں کہا تو انہوں نے کہا کہ ان میں کنبہ پروری بہت ہے۔

سندر لال کو کانگریس اور حکومت میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس کے آثار ملتے ہیں کہ کبھی کسی عہدے کے خواہشمند ہوئے۔ وہ گاندھی جی کے نظریہ کے حامل تھے۔ اور اس پر عامل تھے۔ اسی لئے ان کا مقام بھی کانگریس اور حکومت سے علیحدہ تھا۔

سندر لال کی کتاب بھارت میں انگریزی راج مشہور ہے جسے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا اور میں نے ان کو اسی کتاب کے ذریعہ جانا۔ پھر میری ان کی ملاقات بھوپال میں ہوئی۔

بھوپال میں پرجا منڈل نے ان کی سہ روزہ تقریروں کا نظم کیا تھا۔ میں ان تقریروں

میں شریک ہوا انہوں نے ابتدا میں کہا کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ اگر ہندوؤں میں چور لٹیرے اور بدمعاش نہ ہوتے میں ہندو ہوتا۔ میں مسلمان بھی نہیں ہوں۔ اگر مسلمانوں میں چور لٹیرے اور بدمعاش نہ ہوتے تو میں مسلمان ہوتا۔ میں عیسائی اور سکھ بھی نہیں ہوں اگر ان میں چور لٹیرے اور بدمعاش نہ ہوتے تو میں عیسائی یا سکھ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میرا مذہب معین الدین چشتی کا مذہب بایزید کا مذہب گرونانک کا مذہب کبیر داس کا مذہب ہندو اور مسلمان فقیروں کا مذہب ہے جن کے مذہب میں نفرت نہیں ہے، اذیت نہیں ہے جو بھگوان سے ڈرتے تھے۔

سندر لال نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مہاتما بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی تک ڈھائی ہزار برس کی کوششوں کے باوجود ہندوؤں سے نفرت اور چھوت چھات دور نہیں ہوئی اور محمد صاحب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ۲۳ برس کی کوششوں میں عربوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اس موقع پر سندر لال کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے کہا ایسے مصلح کی کوئی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا مذہب لائے۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جو مذہب آیا وہی مذہب وہ لائے ہیں۔

انہوں نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں ایک چڑی کا گوشت تک نہیں کھاتا ہوں لیکن میں کسی ہندو سے نہیں لڑتا کہ تم چڑی کا گوشت کیوں کھاتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ۸۵ فیصد ہندو گوشت کھاتے ہیں۔ پھر اے ہندوؤ! تم مسلمانوں کے گوشت کے لئے کیوں لڑتے ہو تمہارے مذہب میں منع ہے تم نہ کھاؤ۔

سندر لال نے الہ آباد شہر کا ایک واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ چند قصاب گائے لئے جا رہے تھے۔ کچھ ہندو نوجوانوں نے دیکھا تو مشورہ کیا گائے ان سے چھین لی جائے۔ چنانچہ وہ لاٹھی بھالا تلوار لے کر آگے بڑھے۔ وہاں پر ایک سادھو بیٹھا ہوا تھا وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور چلایا "کسیا کو (قصاب کو) کاہے لا مارت ہو! جو رام گیا (گائے) میں وہی رام

سیا میں۔ کسی کو کاہے مارتے ہو!

سندر لال نے کہا لڑنے والے وہی ہوتے ہیں جو بھگوان سے دور ہیں۔ جن کے دل میں بھگوان کا پریم ہے وہ کسی سے نہیں لڑتے۔

اسی مفہوم کو ایک بار گاندھی جی نے کہا تھا کہ گائے کا گوشت کھانا ہندو مذہب میں منع ہے ان کو نہیں کھانا چاہئے۔ دوسروں سے جن کے یہاں منع نہیں ہے لڑنا نہیں چاہئے

سندر لال نے واجد علی شاہ کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ بالکل کمسن نوجوان تھا۔ اس کو انگریزوں نے تاریخ میں اس طرح پیش کیا ہے جیسے پرانا تجربہ کار عیاش ہو۔ اس کے بارے میں انگریزوں نے یہ من گھڑت رپورٹ لکھی کہ جب وہ کوٹھے سے اترتا تھا تو سیڑھیوں پر دو طرف کنیزیں رہتیں۔ یہ سب افسانے ہیں جو تراش لئے گئے ہیں۔

انہوں نے مسلمان سلاطین کی تعریف کی اور کہا کہ ان سلاطین نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک قومیت کی تعمیر کی۔

جلسے کے بعد راقم الحروف پرجامنڈل کے دفتر میں ان سے ملا۔ ایک گھنٹہ تک وہ مختلف موضوعات پر بولتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی جی موحد ہیں۔ ایک خدا کو مانتے ہیں۔ پھر بھی پرارتھنا میں رگھوپتی راجہ رام پڑھواتے ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مذہبی ہندوؤں کو اپنے سے قریب لانا چاہتے ہیں۔ بھگوان کا دل بہت بڑا ہے وہ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ سندر لال کا عقیدہ تھا کہ جو ایک بھگوان کو مانتا ہے اور مخلوق کی خدمت کرتا ہے تو بس اس کی مکتی کے لئے کافی ہے۔

جب دہلی اور پنجاب میں پاکستان بننے کا انتقام مسلمانوں سے لیا جا رہا تھا اور جواہر لال کی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا رہا تھا تو سندر لال نے پنجاب کا دورہ کیا اور مشتعل ہندوؤں کے مجمع میں فسادات کے خلاف پرجوش تقریریں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فسادیوں نے ان کو جگہ جگہ مارا لیکن ان کے قدم آخر تک نہیں ڈگمگائے۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر نہیں ہے۔

وہ تقریر میں مسلمانوں کی سرزنش بھی کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب مسلمانوں میں تنگ نظری نہیں تھی ان کا دل بڑا تھا تو ایران پہنچ کر وہ صلوٰۃ کو نماز کہنے لگے جیسے مشرکین ایران اپنی مورتیوں کی پوجا کے لئے استعمال کرتے تھے۔ صوم کو روزہ کہنے لگے حالانکہ یہ بھی مشرکین ایران کی اصطلاح تھی۔ سجادہ کو جائے نماز کہنے لگے۔ ان اصطلاحوں سے ان میں کراہیت نہیں پیدا ہوتی تھی لیکن جب وہ ہندوستان آئے اور ان میں تنگ نظری پیدا ہوئی تو نماز کو پوجا کہنے میں جائے نماز کو پوجا کا آسن کہنے میں ان کو کراہیت ہوتی ہے وہ لڑنے لگتے ہیں جیسے ان کی کوئی توہین ہوتی ہے

یہی باتیں انہوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ایک تقریر میں بھی کہیں۔ مولانا اصغر امام فلسفی جلسہ میں موجود تھے۔ انہوں نے بیچ جلسہ میں کھڑے ہو کر کہا کہ مسلمان ایران گئے تو وہاں چھوت چھات نہیں تھی۔ مسلمانوں کا ایرانیوں سے ملنا جلنا ہوا اور دونوں نے ایک دوسرے کی زبان لی لیکن جب وہ ہندوستان آئے تو یہاں چھوت چھات کا زور تھا۔ مسلمان تو مسلمان اگر ہریجنوں کا سایہ برہمن پر پڑ جاتا تو ہریجنوں کی کھال ادھیڑ لی جاتی اس لئے مسلمان اور ہندو علیحدہ رہے اور دونوں کی مذہبی اصطلاحیں علیحدہ رہیں اس میں مسلمانوں کا قصور نہیں ہے۔
میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ سندر لال اس کا جواب نہ دے سکے اور انہوں نے کہا کہ فلسفی صاحب صحیح کہتے ہیں۔

مجھ سے سید سلیمان ندوی ؒ نے کہا تھا کہ " میں نے سندر لال سے ایک دفعہ کہا کہ جب آپ ایک فرقہ کی برائی بیان کریں تو کیا ضرور ہے کہ اسی مجلس میں دوسرے فرقہ کی برائی بھی کر دیں؟ اس کا اثر تو یہ ہوگا کہ لوگوں کی نظر میں ان کی اپنی برائی کو مٹانے کی اہمیت کم ہو جائے گی اور ان کا جرم ان کو ہلکا معلوم ہوگا۔

سندر لال ایک رسالہ بھی نکالتے تھے جس میں آدھا حصہ اردو کا ہوتا تھا اور آدھا حصہ ہندی کا۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مسلمانوں کے عقائد کے تعارف میں بھی ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔

سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس ہندوستان کے مشہور لیڈروں میں تھے۔ اور جواہر لال
کے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ آئی سی ایس کا
امتحان بھی پاس کیا تھا۔ لیکن جذبۂ آزادی سے سرشار تھے۔ انقلابی جماعت میں
شریک ہو گئے، پہلے جگانتر پارٹی کے رکن تھے، پھر نوجوانوں کی کل ہند جماعت بنائی
پھر کانگریس میں شریک ہو گئے۔ آخر میں فارورڈ بلاک کے نام سے جماعت بنائی۔ یہ
جماعت ابھی تنظیم کی منزل میں تھی کہ ہندوستان سے فرار ہو گئے۔ جاپان کی مدد سے
آزاد ہند فوج بنائی یہاں تک کہ ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں موت کا شکار ہو گئے۔
انھوں نے کانگریس میں عدم تشدد کو عقیدتاً نہیں مانا تھا، بلکہ مصلحتاً مانا
تھا۔ جب ہندوستان سے فرار ہوئے ہیں تو اس وقت بنگال کے مسلمہ لیڈر تھے
صوبائی عصبیت بہت تھی اور بڑے عہدہ پر فائز رہنے کا جذبہ بھی تھا۔ چنانچہ ایک
زمانہ میں وہ تھانہ کانگریس سب ڈویژنل کانگریس، ضلع کانگریس، صوبہ کانگریس
اور آل انڈیا کانگریس کے بیک وقت لیڈر رہے۔ ہندو لیڈروں میں ڈاکٹر ٹیگور
کے بعد سب سے زیادہ مقبول تھے۔ مسلمانوں میں اسی طرح فضل الحق کی مقبولیت
تھی۔ سبھاش بوس کئی بار جیل گئے۔ وہ ایک بار آل انڈیا کانگریس کے صدر
ہوئے تو دوسرے سال بھی صدر بننا چاہا، گاندھی جی وغیرہ کی رائے تھی کہ مولانا آزاد
کو صدر بنایا جائے۔ لیکن مولانا کا مزاج نہیں تھا کہ جھگڑے میں پڑیں۔ انھوں نے
انکار کر دیا چنانچہ ڈاکٹر پتابھی سیتارامیہ اور سبھاش بوس میں مقابلہ ہوا۔ سبھاش بوس
پہلے سے صدر چلے آ رہے تھے۔ دوسرے دور کی صدارت کے مقابلہ کیلئے انہوں نے
تیاری بھی کی تھی۔ ڈاکٹر پتابھی کو اچانک کھڑا کر دیا گیا تھا، اس لئے سبھاش بوس

کامیاب ہوگئے۔ سوباش بوس نے دوران انتخاب الزام لگایا تھا کہ کانگریس کے لیڈر انگریزوں سے مصالحت کرنا چاہتے ہیں۔ شاید وہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ مصالحت پسندوں کو کانگریس سے نکالنے کے لئے وہ دوبارہ صدر بننا چاہتے ہیں، اس لئے جب وہ صدر ہوئے تو کانگریس کے لیڈروں نے کہا کہ ہم کو چھوڑ کر آپ ورکنگ کمیٹی بنائیں یا قدیم ورکنگ کمیٹی کو آپ پوری کی پوری باقی رکھیں۔ سبھاش بوس ان لیڈروں کے بغیر کانگریس کو نہیں چلا سکتے تھے، جو ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے، اس لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ دو چار کو چھوڑ کر باقی کو ورکنگ کمیٹی میں لے لیں، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے تطہیر کا کام کر دیا۔ اس پر پرانی ورکنگ کمیٹی کے ارکان راضی نہیں ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سبھاش بوس نے استعفاء دے دیا۔ کانگریس کا یہ اجلاس جس میں انھوں نے استعفاء دیا، کلکتہ میں ہوا تھا۔ ان کے حامیوں نے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو ذلیل کرنے کی پوری تیاری کی تھی۔ مولانا آزاد بیمار تھے، اس لئے نہیں شریک ہوئے، سردار پٹیل کو خبر مل گئی تھی، اس لئے وہ کلکتہ نہیں آئے۔ سبھاش بوس نے استعفاء دیا تو اسی وقت راجندر بابو صدر بنائے گئے۔ چنانچہ نزلہ انھیں پر گرا اور اچاریہ کرپلانی جنھوں نے راجندر بابو کی صدارت کی تجویز پیش کی تھی مخالفوں کے سخت غیض و غضب میں پڑے۔

کانگریس سے علیحدہ ہو کر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، سبھاش بوس نے فارورڈ بلاک کے نام سے ایک جماعت بنائی لیکن یہ کانگریس کی طرح مضبوط جماعت نہیں بن سکی

انگریزوں نے سراج الدولہ پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے ایک بہت تنگ کوٹھری میں انگریزوں کی کثیر تعداد کو بند کر کے مار ڈالا تھا جس جگہ پر بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا اس جگہ پر مرنے والوں کے نام انگریزی حکومت کی طرف سے لکھ دیئے گئے تھے اور اس کے قریب بیچ سڑک پر ان کی یادگار میں ایک ستون بنا دیا گیا تھا۔ لیکن یہ جگہ اتنی چھوٹی تھی کہ بعض ہندو مسلمان، مورخوں نے اس کو مصنوعی کہانی تصور کیا تھا، اور یہ لکھا تھا کہ سراج الدولہ کو بدنام کرنے کے لئے یہ قصہ گڑھا گیا ہے۔

جب گاندھی جی نے آزادی کے لئے انفرادی ستیہ گرہ شروع کی تو پہلے سبھاش بوس نے اس غرض کے لئے اپنا نام پیش کیا، لیکن ان سے اور ورکنگ کمیٹی کے لیڈروں سے جو جھگڑا ہوا تھا، اسکی تلخی باقی تھی اس لئے گاندھی جی نے جواب دیا کہ میری نظر میں آپ غیر ذمہ دار ہیں۔ اس لئے میں آپ کو نہیں لے سکتا ہوں۔ آپ خود اپنے طور پر سول نافرمانی کی تحریک چلائیں اگر ہم اس کو صحیح سمجھیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے، چنانچہ سبھاش بوس نے سراج الدولہ کے خلاف یادگار کو مٹانے کے لئے سول نافرمانی شروع کر دی، وہ اور ان کے کچھ ساتھی جیل گئے۔ لیکن یہ تحریک کل ہند تحریک نہ بن سکی۔ آخر سبھاش بوس اپنے گھر میں مقیم ہو گئے، ان کو جیل نہیں لے جایا گیا تھا، کیونکہ ان کی بیماری کی سرٹیفکیٹ پیش کر دی گئی تھی، مکان کے باہر پولیس کا پہرہ تھا، چند دنوں میں سبھاش بوس نے اپنی داڑھی بڑھائی اور وضع بدل کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، پولیس کو پتہ نہ چل سکا۔ سبھاش بوس جاپان گئے، وہاں سے جرمنی گئے، جرمنی میں شادی کی اس سے ایک بچی ہوئی، پھر وہ جاپان لوٹے اور حکومت جاپان کی اجازت سے ان ہندوستانی فوجیوں سے ملے جن کو جاپان نے لڑائی میں گرفتار کر لیا تھا، اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا، ان پر مشتمل آزاد ہند فوج بنائی تاکہ ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو آزاد کرائیں، لیکن ایک ہوائی حادثہ میں مر گئے۔

چونکہ میں کلکتہ کانگریس میں کام کرتا تھا اس لئے کانگریس کے جلسوں میں ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دفعہ انھوں نے بنگال کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی دعوت کی تھی میں بھی اس میں شریک تھا۔ اس دعوت میں خاص بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی نماز کا نظم کیا گیا تھا۔

جس اجلاس میں سبھاش بوس نے استعفا دیا تھا اس کا پریس کارڈ مجھ کو نہیں مل رہا تھا، ہمارا اخبار روزنامہ "استقلال" مولانا آزاد وغیرہ کی حمایت کر رہا تھا میں اس کا ایڈیٹر تھا، سوچا کہ چلو سبھاش بوس کو آزمالیں، چنانچہ ان کے یہاں پہنچ گیا — سبھاش بوس کے یہاں ملنے والوں کی بھیڑ بہت رہتی تھی، وہ فرداً فرداً بلا کر لوگوں سے

ملتے تھے اس لئے دیر بھی ہوتی تھی، مجھ کو بھی دیر تک انتظار کرنا پڑا جب میری باری آئی تو میں اندر کمرہ میں ان کے پاس گیا اور ان سے شکایت کی کہ کانگریس کے دفتر سے مجھ کو پریس کارڈ نہیں مل رہا ہے، چندر بوس نے کہا کہ آپ کتنے کارڈ چاہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا ہم تین آدمی جائیں گے، سبھاش بوس نے فون اٹھایا اور کہا کہ "ایک دو آدمی اگر ہمارے خلاف شریک ہوں گے وہ بھی پریس والے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ لوگ نہ کریں" اس کے بعد سبھاش بوس نے کہا کہ جائیے آپ کو پریس پاس مل جائیں گے، چنانچہ میں سیدھے کانگریس آفس گیا، جہاں پریس پاس ہمارے لئے تیار تھے، وہ مجھ کو دے دیئے گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کلکتہ آئے تو سبھاش چندر بوس نے اپنے حامی اخباروں کو ہدایت کی کی کہ مولانا کی اور جمعیۃ العلماء کی خبریں دل کھول کر اور نمایاں طور پر شائع کی جائیں، چنانچہ اخبار والوں نے اس پر عمل کیا، پھر سبھاش بوس خود ملنے کے لئے مولانا کے پاس آئے، ہم نے سبقت کر کے دروازہ ہی پر سبھاش بوس کو بتایا کہ مولانا بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں، اس لئے کسی بات پر ان کی مخالفت نہ کی جائے۔ سبھاش بوس نے جواب دیا کہ مولانا نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے کہ آدمی کا دماغ خراب ہو جائے ان میں تو غصہ ہی پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں تو صرف اظہار عقیدت کے لئے آیا ہوں، اس کے بعد مولانا کے پاس پہنچے، دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر ان کے قدموں کو چھوا اور ہار پہنایا، پھلوں کا ایک ٹوکرا پیش کیا، پھر دونوں بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوچھا آج کل آپ کیا کر رہے ہیں، سبھاش بوس نے جواب دیا، میں اپنی ایک پارٹی بنا رہا ہوں۔ مولانا نے کہا میں بھی اپنی ایک پارٹی بنا رہا ہوں پھر اس کی تفصیل بیان کرنے لگے، سبھاش بوس خاموشی سے سنتے رہے، اس کے بعد اجازت چاہی۔ ایک روز سبھاش بوس نے مولانا کی اپنے یہاں شاندار دعوت بھی کی۔

فہیم صاحب کے پریس سے حکومت نے ضمانت طلب کی کہ اس میں کانگریسی کا کتابچہ شائع ہوا تھا تو سبھاش بوس نے اپنے پاس سے وہ ضمانت حکومت

کے خزانے میں جمع کرادی۔

بہرحال سبھاش بوس مر گئے، ان کی بیٹی آزادی کے بعد چند دنوں کے لئے ہندوستان آئی پھر جرمنی واپس چلی گئی۔ آزاد ہند فوج کے لوگ گرفتار ہوکر ہندستان آئے ان پر مقدمہ چلا۔ جواہر لال نے ان کی مدافعت کا نظم کیا، خود وکیلوں کے اس جھنڈ میں شریک ہوئے جو مدافعت کے لئے عدالت میں حاضر ہوا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے مدافعت میں عدالت کے سامنے تاریخی بحث کی اور بتایا کہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔

سبھاش بوس آج موجود نہیں ہیں، بنگال میں ایک جماعت ان کو اب بھی زندہ سمجھتی ہے۔

ونوبا بھاوے

ابھی ابھی ونوبا بھاوے مرے ہیں۔ ذبیحہ گاؤ کی مخالفت اور ہندی زبان کی حمایت کی وجہ سے وہ مسلمانوں میں غیر مقبول رہے لیکن تصویر کا یہی ایک رخ نہیں ہے۔

میں نے ونوبا بھاوے کو اس وقت جانا جب گاندھی جی نے انفرادی ستیہ گرہ کے لئے سب سے پہلے ان کو نامزد کیا تھا۔ اس وقت گاندھی جی نے لوگوں کو ان سے متعارف کرنے کے لئے ان کے حالات پر مشتمل ایک بیان دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ان پر ایک مضمون بھولا بھائی ڈیسائی کا پڑھا۔ دونوں ایک ساتھ جیل میں تھے۔ گاندھی جی کی حد سے زیادہ نقل کرنے کی وجہ سے بھولا بھائی ابتداءً ان سے بدگمان تھے۔ وہ گیتا کا درس دیتے تھے۔ بھولا بھائی شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایک روز ونوبا جی نے پوچھا "آپ کیوں درس میں نہیں آتے ایک مشغولی تو آپ کی رہتی ؟" بھولا بھائی نے جواب دیا کہ آپ ایسے تو زور سے بولتے ہیں لیکن جب درس دیتے ہیں تو آواز بالکل پست کر لیتے ہیں۔ گاندھی جی کی اس خواہ مخواہ نقل سے تکلیف ہوتی ہے اور آواز سنائی نہیں دیتی۔ گاندھی جی تو اس لئے آہستہ بولتے ہیں کہ ان کی آواز پست ہے"۔ ونوبا جی نے کہا " کاش کوئی شروع ہی میں مجھ کو ٹوک دیتا تو میں زور سے بولنے لگتا۔ میں تو اسی لئے پست بولتا ہوں کہ میری آواز سخت ہے لوگوں کو ناگوار ہوگی۔ بھولا بھائی نے لکھا تھا کہ اس کے بعد ان کی آواز ٹھیک ہوگئی اور بھولا بھائی ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔

ونوبا جی قطب ستارہ کی طرح اس وقت نظر آئے جب پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ دہلی میں

فسادات ہو رہے تھے۔ مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ کانگریس، پولیس، عدالت، کہیں مسلمانوں کو پناہ نہیں یہاں تک کہ سردار پٹیل کے یہاں بھی نہیں گاندھی جی، ان کے آشرم کے ساتھی، جمعیۃ علماء کے لوگ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طالب علم اور سوشلسٹ اس سخت طوفان میں (جس کی تفصیل بیان کرنے میں قلم تھرتھراتا ہے اور انسانیت پاس حیا سے اپنا منہ چھپالیتی ہے) اپنے کمزور جسم و جان کے ساتھ اور مضبوط ہمت اور جذبۂ ادائے فرض کے ساتھ بے خطر آتش نمرود میں کود گئے تھے۔

گاندھی جی نے اپنے ہم مذہبوں سے جنگ کی، اس حکومت سے جنگ کی جس میں ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے اور آخر اپنی جان دے دی۔ اس موقعہ پر گاندھی جی کے دو آشرمی مری دلاسارا بھائی اور ونوبا جی کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے انسان نما درندوں سے عورتوں اور بچوں کو اور بے پناہ مردوں کو بچایا۔ ونوبا جی اس آشرم کے ذمہ دار تھے جن میں یتیم، زخمی اور بھٹکے ہوئے بچے لاکر رکھے جاتے تھے۔ یہ ان کی دیکھ بھال کرتے اور ان کے اعزہ کا پتہ چل جاتا تو ان تک پہنچاتے تھے۔

ونوبا جی کا خیال تھا کہ سیاسی حضرات حالات کو بگاڑتے ہیں سلجھاتے نہیں ہیں۔ وہ کہتے کہ آزادی کے ابتدائی دنوں میں جو کچھ پیش آیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک فرقہ کے مذہب کی کتاب دوسرے فرقہ کے لوگ پڑھیں تو اس سے فرقہ وارانہ نفرت کم ہوگی۔ چنانچہ اس غرض سے انہوں نے قرآن کی منتخب آیتوں کا عنوانات قائم کرکے ترجمہ شائع کیا یہ ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہوا۔ اردو میں بھی ہوا۔ میری ونوبا جی سے ملاقات اسی سلسلہ میں ہوئی۔

میں امارت شرعیہ سے علیحدہ ہونے کے بعد کلکتہ چلا گیا تھا۔ انہی دنوں ونوبا جی اپنی پدیاترا کے سلسلہ میں کلکتہ آئے۔ وہ پورے ہندوستان میں گھوم کر زمین والوں سے کہہ رہے تھے کہ بے زمین والوں کے لئے اپنی زمینوں کا کچھ حصہ محض انسانیت کی خاطر حکومت کے دباؤ سے نہیں اپنی خوشی سے دان کریں۔ کلکتہ میں ان کی خواہش تھی کہ قرآن کی آیتوں کا جو انتخاب انہوں نے کیا ہے اس کا افتتاح کریں۔ احمد فاطمی صاحب جو ونوبا جی کے اردو اخبار بھودان تحریک کے ایڈیٹر تھے، مجھ سے ملے اور کہا کہ اس افتتاح کی تیاری میں مدد کیجئے۔ انہوں نے اس انتخاب کا ایک

نسخہ مجھ کو دیا اور کہا کہ آپ دیکھ لیں اس میں کوئی بات قابل اعتراض تو نہیں ہے کیونکہ چھپنے سے پہلے بعض علماء سے نظر ثانی کرا لیا تھا جن میں ایک مولانا عبدالماجد دریابادی بھی ہیں۔ ونوبا جی نے قرآن کی اس آیت کا رسول اللہ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں کا مطلب یہ لکھا تھا کہ عیسائیوں کے یہاں پاپائیت کا جو تصور ہے اس میں اس کی مخالفت ہے۔ اس مطلب پر اعتراض کیا گیا تو ونوبا جی نے اس مطلب کو حذف کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کتاب کو سرسری طور پر دیکھا اور قابلِ اعتراض نہ پاکر ان کے ساتھ ہو گیا۔ اور فاطمی صاحب مجھ کو ونوبا کے پاس لے گئے اور ان سے ملایا۔ تھوڑی دیر گفتگو رہی۔ آخر میں ونوبا جی نے کہا کہ مسلمان میرے ساتھ نہیں ہیں میں نے جواب دیا کہ آپ کہئے کہ میں مسلمان ہوں۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ میں مسلمان ہوں۔" اس پر وہ خاموش رہے اور جب منتخب آیتوں کے افتتاح کا وقت آیا تو ونوبا جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں مسلمان ہوں میں خدا کو ایک مانتا ہوں۔ تمام نبیوں کو مانتا ہوں، تمام کتابوں کو مانتا ہوں اور سورہ والعصر کے اس مضمون کو مانتا ہوں "انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی، اور حق کی راہ میں جو تکلیف ہو اس کو برداشت کر لینے اور حق پر جمے رہنے کی وصیت کرتے رہے۔"

ونوبا جی کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کچھ لوگوں کو اپنی ساری زندگی وقف کرنا چاہئے۔

ہم ونوبا جی کے یہاں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جو صاحب جانا چاہیں وہ جا سکتے ہیں۔ یہ سن کر احمد فاطمی صاحب اٹھ گئے۔ ان کے اٹھنے کی وجہ سے میں بھی اٹھ گیا۔ باہر نکل کر میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ احمد فاطمی صاحب نے کہا کہ ونوبا جی نے ویدک کتابوں سے بھگوان کے ایک ہزار نام نکالے ہیں جنکو اپنے احباب کے ساتھ روزانہ پڑھتے ہیں۔ اسی کا وقت تھا اب وہ ایک ہزار نام پڑھے جائیں گے۔ اس سے پہلے یہ اعلان کیا جاتا ہے تاکہ اس میں جو شرکت پسند نہیں کرتے وہ چلے جائیں۔

پھر ایک خاتون ہمارے لئے ایک پلیٹ میں دہی اور رس گلے لے کر کھڑی تھیں۔ انھوں نے

ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا سفر میں ہم آپ کی اس سے زیادہ خاطر تواضع نہیں کر سکتے۔ ہم نے شکریہ کے ساتھ لے لیا

ونوبا جی بت پرستی کے سخت خلاف تھے۔ مجھ کو ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے سامنے ہندوؤں کی بت پرستی کا ذکر آیا تو آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ کہنے لگے افسوس اتنے زمانہ سے ہندو قوم اس مرض میں مبتلا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کو دور کرے۔

ونوبا جی کو مدرسہ عظمتیہ والوں نے اپنے یہاں مدعو کیا تھا ان کے ایک طالب علم نے ونوبا جی کے اس جلسہ کا قرآن کی تلاوت کر کے افتتاح کیا تھا۔ جو ان کے انتخاب آیات کے افتتاح کے لئے منعقد ہوا تھا۔ ونوبا جی نے دعوت قبول کی وہ مدرسہ عظمتیہ گئے۔ تقریر میں انہوں نے مسلمانوں کو ہندی سیکھنے کا مشورہ دیا۔

شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو کشمیر میں گرفتار کیا گیا تو انہوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ آخری بار جب وہ گرفتار ہوئے تو ونوبا جی نے بیان دیا کہ شیخ عبداللہ اپنی صفائی دینے حکومت کے پاس آ رہے تھے جس سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کی نیت خراب نہ تھی۔ اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی تو حکومت کے پاس آتے ہی کیوں۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ ان کو اپنی صفائی کا موقع دیتی یہ بات عجیب ہے کہ جو آدمی ان کے پاس آ رہا ہو اس کو آنے نہ دیا جائے اور راستہ میں گرفتار کر لیا جائے۔

میں بھودان تحریک کا اردو ایڈیشن پابندی سے پڑھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بڑے بڑے قومی مسائل کو ایسے جملوں میں ادا کرنے کی صلاحیت جن کو کم پڑھے لکھے آسانی سے سمجھ سکیں ونوبا جی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

جب میں ونوبا جی سے ملا تھا تو مجھ کو سروادے کی تمام اردو کتابیں دی گئی تھیں۔ اس سے پہلے مری دولا ساہرا بھائی نے یہ کتابیں مجھ کو دہلی میں بھجوائی تھیں۔

جب ونوبا جی کلکتہ سے گئے تو وہاں سروادے کا دفتر باقاعدہ کھل گیا تھا اور ایک حلقہ طالعہ بھی جس کا ہر ہفتہ جلسہ ہوتا تھا۔ میں اس جلسہ میں پابندی سے شرکت کرتا تھا۔ لوگ صفائی سے

تمام مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ پھر مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں ہر ہفتہ اس حلقہ میں قرآن کا درس دوں جسے میں نے منظور کر لیا تھا۔ تقریباً سال بھر یا اس سے کم یہ درس رہا پھر میں بہت دور چلا گیا اور میرے لئے حلقہ میں شرکت ممکن نہیں رہی۔

جس زمانہ میں راورکیلا کا فساد ہوا تھا تو اڑیسہ کے سروادے لیڈروں نے اور جے پرکاش نرائن نے ایک بیان دیا تھا جس میں کہا تھا کہ راورکیلا میں مسلمانوں پر بہت مظالم ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنا بڑا فساد نہیں ہوا ہے۔ اتفاق سے اڑیسہ کے سروادے لیڈر کلکتہ آئے تو اس موقع پر ہندو مسلمانوں کے مشترکہ کھانے کا نظم تمام شرکاء کے چندوں سے کیا گیا تھا۔ اس کھانے میں اڑیسہ کے سروادے لیڈر نے کہا کہ جب میں نے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کیا تو بھیانک ظلم کو دیکھ کر میں خبط ہو گیا۔ چند روز تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں پھر میں نے ونوبا جی اور جے پرکاش کو خط لکھا۔ رائے ہوئی کہ ظلم کو چھپایا نہ جائے بلکہ ان کو علی الاعلان بیان کر کے قوم کے ضمیر کو جھنجوڑا جائے۔ چنانچہ وہ بیان اخبارات کو دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ فسادات کی خبروں کو گزشتہ زمانہ میں جس طرح چھپانے کی کوشش کی گئی اگر ان کو چھپایا نہ جاتا اور قوم کو بتلایا جاتا کہ کس درجہ یہ بھیانک اور ظالمانہ کارروائی ہوئی ہے تو شاید اہل ضمیر جاگ اٹھتے اور ان کی طرف سے پر زور ملامت ہوتی تو ظالم مرعوب اور شرمندہ ہوتے۔

کلکتہ میں سروادے کی طرف سے پرامن جلوس نکالا گیا تھا جب کلکتہ میں فساد ہو گیا تھا۔ سروادے کی طرف سے ہولی اور بقرعید پر خصوصی اجتماعات بھی ہوتے جن میں ہولی اور بقرعید کے اسباب وعلل بیان کئے گئے۔ بقرعید کے بارے میں بیان میرے ذمہ تھا۔ شرکاء میں چونکہ مارواڑی تھے اس لئے ان کو جانوروں کا ذبیحہ پسند نہیں آیا لیکن گوشت جس طرح بقرعید میں تقسیم کرتے ہیں اور نمازیں جس طرح ادا ہوتی ہیں وہ ان کو پسند آئیں۔ کہنے لگے کہ اس میں بھائی چارگی، مساوات اور ایثار کی بو آتی ہے۔

مری دولا سارابھائی

دنو باجی کی طرح مری دولا سارابھائی سے بھی میرا ملنا بہت کم ہوا لیکن ان خاتون کی جرات اور انسانی ہمدردی کا حال جان کر اگر اسی کتاب میں ان کا تذکرہ نہ کروں تو یہ کتاب ناقص رہے گی۔

یہ ایک امیر تاجر کی لڑکی تھیں۔ اور اکلوتی لڑکی۔ زندگی بھر شادی نہیں کی۔ گاندھی جی کی ستائی چیلن رہیں۔ انہوں نے اپنی طاقت اور اپنا مال دونوں ظلم کے مقابلہ میں صرف کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے جیل گئیں۔ اور کمزوروں کی حمایت کی۔

ان کا اصل کارنامہ آزادی کے وقت کے فسادات کا ہے۔ کانگریس تو کچھ کر نہیں رہی تھی مسلم لیگ بھی کچھ نہیں کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کانگریس ظالموں کے ساتھ ہے اور مسلم لیگ کے لوگ سر چھپائے پھر رہے ہیں یا حکومت سے عہدوں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ مری دولا گاندھی جی کے آشرم سے متعلق تھیں اور جس طرح ان کے سب آشرمی آگ بجھانے میں مدد لگے ہوئے تھے، یہ بھی لگی ہوئی تھیں۔ انیس قدوائی نے لکھا ہے کہ مری دولا ہم سب سے زیادہ کام کر رہی تھیں۔ ان کا ایک قدم دہلی میں تھا اور دوسرا قدم پنجاب میں۔ مظلوم عورتوں کو بچانا اور مغویہ عورتوں کو ظالموں کے پنجے سے نکالنا ان کا مقصد تھا۔ یہ شیرنی کی طرح بلا خوف فسادیوں کے مقابلہ میں آجاتی تھیں۔ ستائش سے اتنی لاپرواہ تھیں کہ ان کی انتھک دوڑ دھوپ کا پتہ اپنوں کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ بیگم انیس قدوائی نے لکھا کہ جب جواہر لال نہرو ان کی جدو جہد سے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ حیرت میں پڑ گئیں۔

بقول اندرا گاندھی مری دولا کی خصوصیت تھی کہ وہ مظلوموں کے لئے سینہ سپر ہو جاتی تھیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں معاہدہ ہوا تھا کہ ہندوستان میں اغوا کئے ہوئے بچوں کو اور مسلمان عورتوں کو، اگر مل جائیں تو انہیں لازماً پاکستان پہنچا دیا جائے خواہ وہ نہ چاہیں اور اسی طرح پاکستان میں اس طرح کے ہندو بچے اور ہندو عورتیں مل جائیں تو ان کو لازماً ہندوستان پہنچا دیا جائے خواہ وہ نہ چاہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ معاہدہ مری دولا سارا بھائی کی کوششوں سے ہوا تھا۔

• جب شیخ عبداللہ کشمیر کی وزارت سے ہٹا دیئے گئے اور ان کو گرفتار کر لیا گیا تو مری دولا سارا بھائی شیخ عبداللہ اور کشمیریوں کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کشمیریوں کے خلاف یہ کارروائی حکومت ہند کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس لئے حکومت سے تو انہوں نے ٹکر لی ہی چونکہ ملک میں فرقہ وارانہ آندھی چل رہی تھی اس لئے ہندو پریس اور ہندو عوام بھی باستثنائے چند مری دولا کے خلاف ہی تھے۔ مسلمانوں میں جو حکومت سے قریب تھے وہ حکومت کی کارروائی کو پسند تو نہیں کرتے تھے لیکن ان میں یہ ہمت نہیں تھی کہ اپنے ضمیر کے مطابق اپنی آواز اٹھائیں۔ لیکن مری دولا نے ہندوؤں کی ملامت کی پرواہ نہیں کی اور نہ مسلمانوں کی ستائش کی آرزومند ہوئیں۔ ان کو پنڈت پنت نے جیل بھیج دیا اور وہ خوشی سے جیل چلی گئیں مجھ کو سندر لال کی یہ تقریر یاد ہے جو انہوں نے جمعیۃ کے ارکان کے اجلاس میں پنڈت پنت کا جواب دیتے ہوئے کی تھی۔ "پنڈت پنت کہتے ہیں کہ ہندی ہاتھی کا پاؤں ہے، اسی میں سب پاؤں سما جاتے ہیں۔ پنڈت پنت پہاڑی آدمی ہیں ان کو اتنی کہاں سمجھ۔" اور مولانا آزاد نے ایک وفد کو جواب دیتے ہوئے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ پنڈت پنت وزیر داخلہ ہیں۔ تمام ہندوستانیوں کا بوجھ ان کے سر پر ہے اور ان کا سر ڈولتا ہے۔"

غرضیکہ ناسمجھوں نے ناسمجھی کی لیکن وہ مری دولا کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکے • میں دلی میں بین الاقوامی میلہ دیکھنے گیا تو جی چاہا کہ اس عزیمت والی خاتون سے مل کر اس کی ستائش کروں، گرچہ وہ ستائش سے لاپرواہ ہیں۔

میں اپنے پھوپھی زاد بھائی قاضی احمد حسین صاحب کے یہاں ٹھیرا ہوا تھا جو راجیہ سبھا کے رکن تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ میں مری دولا سارا بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا

کر میں انتظام کر دیتا ہوں۔ قاضی صاحب نے ایک صاحب سے کہا کہ ان کو تم مری دولا سارا بھائی کے
یہاں پہنچا دو۔ ان صاحب نے جواب دیا کہ ان کو مری دولا کی قیام گاہ دور سے بتا دوں گا نزدیک
نہیں جاؤں گا ورنہ سی آئی ڈی میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ چنانچہ یہ صاحب مجھ کو لے گئے اور دور
سے راستہ بتا کر اور یہ کہہ کر کہ وہاں پر پوچھ لیجئے گا، واپس ہو گئے۔ میں بہرحال پوچھتا ہوا ان تک
پہنچ گیا۔ مری دولا نقیب اخبار سے واقف تھیں، ان کے گشتی مراسلے ہمارے دفتر میں آتے
رہتے تھے اس لئے اتنا بتانے کے بعد کہ میں نقیب کا ایڈیٹر ہوں کسی اور تعارف کی مجھ کو
ضرورت نہیں پڑی۔ میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ پورا مکان سکریٹریٹ بنا ہوا ہے
کثیر التعداد ٹائپسٹ ہیں۔ کشمیر کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات اور شیخ عبداللہ کی حمایت
میں بیانات ٹائپ ہوتے اور ارکان پارلیمنٹ ہندوستان کے اخبارات کو انجمنوں کو سفارتخانوں
کو روزانہ بھیجے جاتے تھے۔ خود ان کا بیان بھی نکلتا رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کو وہ پناہ بھی دیئے
ہوئے تھیں جن کو کشمیر کی حکومت پریشان کر رہی تھی ان کے کھانے پینے وغیرہ کا سب نظم
مری دولا اپنے خرچ سے کر رہی تھی۔ میرے لڑکے دیوبند میں پڑھتے تھے۔ وہ بھی آئے
ہوئے تھے ان کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ میرے لڑکے سے انہوں نے کہا کہ دیوبند میں لڑکوں سے کہو
ان سی سی میں بھرتی ہوں۔ میں نے کہا مسلمانوں کو فوج میں لیا نہیں جاتا ہے۔ ان سی سی میں
بھرتی ہونے سے کیا فائدہ۔ کہنے لگیں پہلے ٹریننگ لیں اس کے بعد لڑیں کہ ان کو لیا
جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملک میں فرقہ پرستی کی جو لہر چلی ہوئی ہے اس کو مٹنا ہے۔ اگر یہ لہر
نہیں مٹے گی تو سب اسی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ آپ ہی نہیں مٹے گی
تو سب اسی آگ میں جل جائیں گے۔ جو برائی جتنے زور پر ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لئے اتنا ہی زور
لگانا پڑتا ہے۔ گاندھی جی نے اپنی جان دے کر بتایا کہ اس برائی کو مٹانے کے لئے جان بھی
دینے کی ضرورت پڑے گی۔

میں واپس آیا تو سہیل عظیم آبادی صاحب سے ملاقات ہوئی جو ریڈیو میں کام کرتے
تھے۔ انہوں نے رات کو کھانے پر بلایا۔ میں جگہ جانتا نہیں تھا اس لئے انہی صاحب کی خدمات

حاصل کی جنہوں نے مری دولا سارا بھائی کے قیام گاہ کی سمت بتائی تھی۔ دعوت کے بعد واپس آیا تو ان صاحب نے کہا کہ اب آپ سے ڈر لگتا ہے جس وقت سے آپ مری دولا کے پاس گئے ہیں سی آئی ڈی آپ کے پیچھے ہے۔ یہاں قاضی صاحب کی قیامگاہ سے قریب الغار پر بیٹھے ہوئے ہیں جو پہلے کبھی نہیں رہتے تھے۔ آپ کو سہیل صاحب کے یہاں لے گیا تو ہماری بس پر سی آئی ڈی کا ایک بڑا افسر چڑھا میں نے سمجھا کہیں جا رہا ہوگا لیکن جب ہم اترے تو وہ بھی اترا اور جب دوسرے بس پر چڑھے تو وہ بھی چڑھا جہاں ہم اترے وہ بھی اتر گیا یہاں تک کہ اس نے سہیل صاحب کے مکان تک پیچھا کیا۔ قاضی صاحب بولے کہ مری دولا نے تم کو اپنے ڈرائیور کے ذریعہ سروادے کی کتابیں بھیجی ہیں دوسری بات یہ کہی کہ ٹیلی فون آیا جس میں پوچھا گیا کہ عثمانی صاحب کہاں ہیں۔ میں ان کا ملنے والا ہوں۔ اس نے نام ہندو کا بتایا اور وطن دربھنگہ۔ میں نے کہا دربھنگہ کا کوئی ہندو میرا ملنے والا نہیں ہے ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی سی آئی ڈی ہو۔

دوسرے روز میں پھر مری دولا کے یہاں گیا کہ کتابوں کا شکریہ ادا کردوں۔ باتوں میں سی آئی ڈی کا لطیفہ بھی کہہ دیا۔ بولیں تب آپ پیدل نہ جائیں۔ انہوں نے ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ ان کو قاضی صاحب کے یہاں چھوڑ آؤ۔ میں نے ہزار کہا کہ میں سی آئی ڈی سے نہیں ڈرتا ہوں لیکن وہ نہ مانیں اور انہوں نے اپنی موٹر سے مجھ کو پہنچوا دیا۔

آج مری دولا نہیں ہیں لیکن ایسی عورتیں ہندوستان میں پیدا ہوتی رہیں گی جو سماج کی برائیوں کا مقابلہ کریں گی اور ملک کو سیدھا راستہ بتائیں گی۔

ہندوستان نے کافی اچھی عورتیں پیدا کی ہیں۔ مسز اینی بیسنٹ، سروجنی نائیڈو، کملا دیوی چٹوپادھیا، مری دولا سارا بھائی وغیرہ۔ یہ سب جدید ہندوستان کی معمار ہیں اور سب قابلِ تعریف ہیں۔

پنڈت چتر نرائن ملویہ

پنڈت چتر نرائن بھوپال کے رہنے والے تھے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے بی اے اور وکالت کی ڈگریاں لی تھیں لیکن وکالت نہیں کرتے تھے۔ شاکر علی خاں کے ساتھ (جو ان دنوں بھوپال کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور آزادی کے بعد مدھیہ پردیش اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تھے) پرجا منڈل میں (جو اب کانگریس ہے اور آزادی کے پہلے آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز پارٹی کانفرنس کی شاخ تھی کیونکہ آزادی سے پہلے والیان ریاست کے قلمرو میں کانگریس نہیں قائم کی گئی تھی) کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر پٹابی سیتا رمیہ اس جماعت کے بانی تھے جواہر لال صدر اور شیخ عبداللہ نائب صدر۔

والیانِ ریاست کے یہاں کانگریس اس لئے قائم نہیں ہوئی تھی کہ کانگریس کے بعض لیڈر اس کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا ہوا تو والیان ریاست مکمل کر برطانوی حکومت کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جواہر لال وغیرہ کا خیال تھا کہ والیان ریاست تو برطانوی حکومت کے حامی ہیں ہی، ضرورت ہے کہ ان کی رعایا کو بیدار کر دیا جائے وہی تحریک آزادی کی قوت بن سکتے ہیں۔

میں جب مستقل بھوپال میں رہنے لگا اور شاکر علی جیل سے رہا ہو گئے تو مشہور مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کے بھانجے نے میرا تعارف شاکر علی سے کرایا اور شاکر علی نے پنڈت چتر نرائن مالویہ سے۔ میں پرجا منڈل کے کاموں میں حصہ لینے لگا اور بہت جلد مجھ کو اس کی مجلس عاملہ میں لے لیا گیا حالانکہ رہنا سہنا اور میری قرابت بعض ان لوگوں سے تھی جو نواب بھوپال کے آدمی سمجھے جاتے

تھے لیکن پرجامنڈل کے کارکنوں نے مجھ پر پورا بھروسہ کیا اور ہر مشورہ میں مجھ کو شریک کیا۔ چتر نرائن اس زمانہ میں پرجامنڈل کے صدر تھے۔

میں سات برس بھوپال میں رہا اور ان دونوں لیڈروں کے شانہ بشانہ کام کرتا رہا۔ عام جلسوں کو بھی خطاب کیا۔ پرائیویٹ جلسوں میں اپنے حقیر مشورے دیئے اور میرے مشورے قبول کئے گئے۔ کوئی ترجمہ انگریزی سے اردو کرنا ہوتا اور چتر نرائن خود ترجمہ کرتے تو اس کام میں مجھ کو بھی شریک کرتے۔ بھوپال میں عوامی نمائندہ حکومت کی تجویز پرجامنڈل کے عام جلسہ میں میں نے ہی پیش کی تھی۔ اور میری تقریر پسند کی گئی تھی۔ میونسپل انتخابات میں پرجامنڈل کو کامیابی ہوئی جس کا سہرا شاکر علی کے سر تھا تو امیدواروں کے انتخاب میں بھی چتر نرائن نے مجھ سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے لگے تھے وہ چھوت چھات تو نہیں کرتے تھے لیکن اس وقت گوشت نہیں کھاتے تھے۔ دسترخوان پر دوسروں کے لئے ہوتا تو ان کو نہ کراہت ہوتی تھی اور نہ کوئی شکایت۔

ایک روز ہولی کے موقعہ پر ان کے گھر گیا۔ ہولی میں ہندوؤں کے یہاں جانے سے بہت ڈرتا ہوں لیکن چتر نرائن مجھ کو اس قدر مہذب معلوم ہوئے کہ میں بے خطر ان کے یہاں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر آنے والے کے سامنے ایک تھالی پیش کی جاتی ہے جس میں ایک طرف عبیر (رنگ) ہوتا اور دوسری طرف الائچی۔ جس کا جی چاہے رنگ لے کر پیشانی پر لگالے اور جس کا جی چاہے الائچی اٹھا کر کھالے۔ کپڑے خراب کرنے، گالیاں بکنے کی کوئی بات نہیں دیکھی میرے سامنے بھی تھالی پیش کی گئی اور میں نے ایک الائچی لے کر منہ میں رکھ لیا۔

چتر نرائن کو جوٹھے کا اہتمام بھی نہیں تھا۔ جس پیالی میں ہم چائے پیتے اس پیالی میں وہ بھی چائے پی لیتے گرچہ اپنے یہاں چائے پلاتے تو پیالی دھوئے بغیر دوسرے کو نہ دیتے۔

ہندوستان آزاد ہوا اور پرجامنڈل کی وزارت بنی تو نواب بھوپال نے اولاً شاکر علی کو بلایا اور وزارت بنانے کو کہا۔ شاکر علی کوئی عہدہ قبول نہیں کرتے تھے۔ پرجامنڈل میں بھی ان کا کوئی عہدہ نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے چتر نرائن کا نام پیش کیا اور چتر نرائن وزیر اعظم ہو گئے۔ اس موقعہ پر

انہوں نے مجھ کو بہار واپس جانے سے بہت روکا لیکن بہار کی خدمت کا شوق مجھ کو بہار لے آیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب صاحب کے اتنے آدمی باہر سے آ کر یہاں رہ گئے ہیں ایک آدمی ہمارا بھی سہی۔ بہار میں کام کرنے جب اپنی جماعت کے لوگوں نے نہیں دیا تو میں محسوس کرنے لگا کہ بھوپال ہی میں رہ جاتا تو بہتر تھا۔ شاید وہاں سے زیادہ کام کر سکتا تھا۔

چتر نرائن زیادہ دن وزارت نہیں چلا سکے۔ دہلی اور پنجاب میں فرقہ وارانہ آتش فشاں پھوٹ پڑا تھا۔ بھوپال کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ مسلمان پناہ لینے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ ان کے قاتل بھی پیچھا کر رہے تھے۔ چتر نرائن نے یہ نظم کیا کہ جو مسلمان آئیں ان کو آنے دیا جائے کیوں کہ پناہ لینے آ رہے ہیں البتہ ریاست کی سرحدوں پر ان کے قیام کا نظم کیا جائے۔ عام لوگوں سے ملنے نہ دیا جائے کہ ان کی مصیبت سن کر مسلمانوں میں غصہ پیدا ہو اور یہاں بھی فساد پھوٹ پڑے اور کوئی ہندو آئے تو جب تک اس کے بارے میں پورا اطمینان نہ ہو جائے اسے ریاست میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس نظم کے خلاف ہندوؤں نے ایجی ٹیشن کر دیا۔ سردار پٹیل نے بیان دیا کہ نواب بھوپال نے پرجا منڈل کی وزارت کو ملا لیا ہے۔ لیکن ان کی یہ چال کامیاب نہ ہو گی۔ لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ پٹیل اور گاندھی جی ایک دوسرے سے بہت دور ہو رہے ہیں۔ اس لئے چتر نرائن اس بیان سے پریشان ہو گئے۔ اور ان کی پارٹی نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا حالانکہ سردار پٹیل کے بیان سے استعفیٰ کی ضرورت نہیں تھی جب تک کہ پرجا منڈل مطالبہ نہ کرتی۔ بہر حال چتر نرائن اور ان کے کچھ ساتھی کچھ عرصہ کانگریس میں رہے۔ شاکر علی اور ان کے مسلمان دوست کمیونسٹ ہو گئے۔

نئے انتخابات میں شاکر علی کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ چتر نرائن سے کانگریس نے کہا کہ ان کو شاکر علی خاں کے مقابلہ میں کھڑا ہونا ہوگا۔ چتر نرائن نے جواب دیا کہ بھوپال ایک مسلمان ریاست تھی شاکر علی خاں مسلمان ہونے کے باوجود ریاست کی مخالفت میں سب سے آگے تھے اور ہم سب ان کے پیچھے تھے۔ میں اتنا طوطا چشم نہیں ہوں کہ جس سے شانہ سے شانہ ملا کر برسوں سامراجی طاقت سے جنگ کی اب اس سے مقابلہ کروں

مسلمان کے مقابلہ میں نہیں کھڑا ہوں گا۔ چنانچہ جیز راتن کو ٹکٹ نہیں ملا۔ شاکر علی کی مخالفت میں دو دیگر ہندو کھڑے ہوئے پھر بھی شاکر علی کامیاب ہو گئے۔ جیز راتن نے بھوپال چھوڑ دیا اور جرمنی جاکر جیبس فاؤنڈیشن کا کام کرنے لگے۔ اس کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات دہلی میں ہوئی۔ ان کو معلوم ہوا کہ میں آیا ہوں چنانچہ وہ قاضی صاحب کے یہاں آکے مجھ سے ملے اور ایک گھنٹہ بیٹھے دوسری بار پھلواری شریف آئے جہاں میں امارت شرعیہ کا معین ناظم تھا اور ہفتہ وار نقیب کا ایڈیٹر میرا پھلواری شریف میں یہ آخری زمانہ تھا۔ انہوں نے دوپہر کو میرے یہاں کھانا کھایا اور آرام کیا۔ کھانا دوسروں کی طرف سے تھا۔ اور کھانے میں کباب وغیرہ تھے۔ میں نے کہا پنڈت جی گوشت نہیں کھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا اب کھاتا ہوں جب سے جرمنی گیا کھانے لگا ہوں۔

معلوم ہوا کہ پنڈت جی اب مستقل طور پر بھوپال میں ہیں اور مختلف قسم کے سماجی کام کرتے رہتے ہیں۔

مصنف کی دوسری فکر انگیز کتابیں

میلاد کی کتاب (صحیح احادیث کی روشنی میں) قیمت پانچ روپے

مبادیٔ سیاسیات اسلامی " چار روپے

گلدستۂ افکار زیر طبع

چالیس حدیثیں (مع ترجمہ اور تشریح) قیمت پانچ روپے

انبیاء اور صلحاء کا راستہ زیر طبع

ملنے کا پتہ
عثمانی پبلشنگ ہاؤس
۱۳۱- بی بلاک
ذاکر باغ
اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵